

فکر و نسوی

فکر و نسوی



فکر نامہ

طنزیہ تحریروں کا انتخاب

فکر تونسوی

تقسیم کار

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

اپنے ہی نام —

اپنے پر اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں

ترتیب

- ۹ عرشِ صفہ خلیقِ انجم
- ۱۳ تعاریف کرشن چندر
- ۱۴ فکرِ ممتی مصنف
- ۲۹ ۱۔ جنم سے جنم تک۔ آہ! نکو قوسوی
- ۳۴ میری وصیت
- ۳۳ عالمِ بالا پر
- ۵۵ خدا کی جنت
- ۶۶ قبر سے واپسی
- ۷۶ میرا ہنرِ جنم
- ۸۵ ۲۔ زورِ خطابت — شاعرے میں صدارتی خطبہ
- ۹۱ محلہ سدھارکیشی
- ۹۹ بیڈروں کی محفل میں
- ۱۰۶ بیاباںوں جنم دین
- ۱۱۷ ۳۔ کچھ اپنی کچھ پرانی — گرم سٹہ کی تلاش
- ۱۳۷ فکرِ قوسوی نے ایکشن دیا
- ۱۳۶ وارنٹ گرفتاری
- ۱۳۵ بیویوں کی ٹریڈ یونین
- ۱۵۳ سو اماند، ایک بیمار

- ۱۶۰ — دے کے بے کنیا کی ضرورت
- ۱۶۷ — میں مالک مکان بنا
- ۱۷۵ — چڑت لال نے فلم بنائی
- ۱۸۵ — بیوی کے بھروسے
- ۱۸۸ — ۴۔ شوخی گفتار — اور سائیں بابائے کہا
- ۲۱۱ — ماڈل ہتھو آپریشن
- ۲۲۵ — دہلی جو ایک شہر ہے
- ۲۵۳ — خط لکھیں گے
- ۲۷۷ — ؟ ؟ ؟
- ۲۹۱ — دل کی ڈاڑیاں
- ۳۱۷ — لغات نکوی
- ۳۲۷ — ۵۔ عرق انقبال — کر دیتی بن جاؤ گے
- ۳۴۰ — ہم نوشیرواں بنے
- ۳۴۷ — سہرا
- ۳۵۷ — ۶۔ پیاز کے پھلکے — آٹھ اخباری کالم

پیش لفظ

فکر تو نسوی طنز نگاروں کی میں نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اُن میں تقریباً سب ہی کے قلم کی سیاہی سوکھ چکی ہے۔ انہوں نے لکھنا بند کر دیا ہے یا خود کو ڈھرا رہے ہیں۔ لیکن جدت اور تازگی کی تلاش نے فکر تو نسوی کو ادبی موت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ فکر صاحب طنز و مزاح کے لیے غام مواد کتابوں اور تحفیل سے نہیں، بلکہ براہ راست زندگی سے حاصل کرتے ہیں۔

عمر کی ایک منزل ایسی آتی ہے جب بڑے سے بڑے جدت پسند انسان کے فکرو خیال اور احساس میں جمود آجاتا ہے اور وہ اپنے ذہن کے دریچوں کو اس طرح بند کر لیتا ہے کہ نئی فکر کی تادہ چھوٹا لکھ نہیں آ پاتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ

پرانی نسل نئی نسل کے مقابلے میں احساس برتری کا شکار ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ احساس برتری احساس کمتری کی دوسری شکل ہوتی ہے، اور وہی فن کار ادبی موت کے چنگل سے بچتا ہے جو نئی نسل اور نئے حالات کا ساتھ دیتا ہے۔ ایک حساس اور باشعور انسان کو ہر لمحے بدلتی ہوئی زندگی نئی بصیرت اور نئی آگہی دیتی ہے جس سے نئے نئے موضوعات جنم لیتے ہیں میرے اس دعوے کا ثبوت روزانہ "ٹاپ" کا مزاحیہ کالم ہے۔ جسے محرقہ قلمسوی لکھتے ہیں، میری طرح سیکڑوں لوگ اخبار کی شام سرفی پڑھ کر مزاحیہ کالم "پیاز کے چھلکے" کے لیے صفحہ پلٹ لیتے ہیں، اور یہ پورا کالم پڑھنے کے بعد ہی اخبار کا باقاعدہ مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ فکر صاحب نے اس کالم میں کسی موضوع پر دوبارہ قلم اٹھایا ہو۔ اخبار کی خبروں کی طرح ان کا کالم ہمیشہ تازہ ہوتا ہے۔ صحت سازی بھی اس کی خصوصیت نہیں، بلکہ اس میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی بصیرت، آگہی اور ہار یک بینی ہوتی ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے فکر صاحب صحافی ہیں اور انھیں ہر حال میں روزانہ ایک کالم لکھنا ہوتا ہے لیکن یان کی تخلیقی صلاحیتوں کا جادو ہے کہ ان تحریروں میں صحافیانہ انداز کے بجائے ادبی چاشنی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ٹاپ کے مزاحیہ کالم کتابی صورت میں مرتب ہو کر اردو کے مزاحیہ ادب کا حصہ بن جاتے ہیں۔

فکر صاحب کی پیاز تو دیوار چین کی طرح ہے۔ جسے یا جوت ما جوت رات بھر جاٹ جاٹ کر بہت چھونا کر دیا کرتے تھے۔ لیکن صبح کو وہ پھر اپنی اصل صورت میں آ جاتی تھی۔ فکر صاحب ہر روز صبح کو پیاز کے چھلکے اٹھارتے ہیں لیکن پیاز رات کو پھراتی ہی ہو جاتی ہے۔

ابھی تک پیاز نے ہار مانی ہے اور ڈھکرنے۔ اردو کے طنز و ادب کے لیے وہ سنو سنو ترین دن ہو گا جب ان دونوں میں سے کوئی اپنی شکست مان لے گا۔

بہار نویسی اور نرود نویسی کے باوجود طنز و مزاح کا اعلیٰ ترین سیاہ برقرار رکھنا ایک مجہزے سے کم نہیں۔ اور فکر صاحب برسوں سے مجہزہ دکھا رہے ہیں۔

فکر نے اس دور میں اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا جب بہار ایک سیاہی نظام ختم ہو کر دوسرا نظام شروع ہوا تھا۔ لیکن جس کے اقتصادی نظام میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ہندوستانیوں کو یقین تھا کہ آزادی جتنے ہی دن کے سب ڈکھ دور ہو جائیں گے یہ صغی خام خیالی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ حکومت کرنے والے صرف ہاتھ بدلتے تھے۔ ہندوستانیوں کی وہ دولت جو پہلے سمندر پار چل جاتی تھی اب اس کی تکلیف وہ سائٹس ہندوستانیوں ہی کے ایک محدود ترین طبقے میں ہو رہی تھی۔ جس نے ہم سب کو بے یقینی، احساس کمتری، عدم اعتماد اور معاشی بحران میں مبتلا کر دیا۔

فکر صاحب میں مصلح یا پینامیڈ بننے کی صلاحیت نہیں۔ کیونکہ وہ خود کو سماج کا ایک عام فرد سمجھتے ہیں۔ انھیں بھی مصائب و آلام کا سامنا ہے۔ لیکن وہ ٹائمیڈ ہو کر ذات کے نہاں خانوں میں گم نہیں ہوئے۔ وہ طنز و مزاح کے ہتھیار لے کر اس میدان جنگ میں کودے ہیں۔ وہ اپنے فن کے ذریعہ انسان میں حوصلہ اور ہمت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ شیع کی طرح جل کر دوسروں کو روشنی پہنچانے کے

قابل ہیں۔ خدا اس شخص کو ہمیشہ روشن رکھے۔
 ”فکر نامہ“ فکر صاحب کی ساری زندگی کی ادبی کاوشوں
 کا پتھر ہے۔ پوری کوشش کی گئی ہے کہ اس انتخاب میں
 اُن کی تمام نمائندہ تقریریں شامل ہو جائیں۔

خلیق انجم

جزل سکری

تعارف

میں نکو تو نسوی کو ایک شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا۔ مجھے ان کے شاعر ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ صرف ان کے نام کے آگے تو نسوی پر اعتراض تھا مگر جب شاعروں کے نام کے ساتھ ہارچوری اور بھنجا نوی ایسے القاب دیکھ لیے تو اپنا اعتراض واپس لے لیا۔

پھر ننانکو تو نسوی نے شاعری ترک کر کے طنز نگاری اختیار کی ہے تو دل ڈوبنے لگا کہونکو ہنسے بوڑھوں سے سن رکھا ہے کہ اچھے شاعر کبھی اچھے طنز نگار ثابت نہیں ہوتے۔ جس مزاح کی کمی ہوتی ہے بنگر جب اپنے درپے نکو کے طنز یہ مضامین پڑھنے کو ملے تو ماننا پڑا کہ ہر کچلے کے ساتھ چند استثنا بھی لگے رہتے ہیں۔ دنیا کے لیے وہ اب بھی نکو تو نسوی ہیں، میرے لیے نکو طنز وی ہو کر رہ گئے ہیں۔

برقبول طنز نگار اس میدان میں وارد ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے کو پھر اپنی بیوی کو طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ وہ قلمبندی ہوں۔ شوکت تھا نوی یا فکر تو نسوی۔ یہ ہر دو ہستیاں اس لیے بھی مقبول ہیں کہ انھیں طنز کا نشانہ بنانے میں دھولے اذالہ حیثیت عرفی کا کوئی خطرہ نہیں (میدھا سیدھا تو میں عزت لکھو تو کسی پر عجب نہیں پڑے گا۔ اذالہ حیثیت عرفی "بھاری بھر کم معلوم ہوتا ہے نا؟") بیویوں کی ٹیڑھ یونین میں نکو کی بیوی آزادی نسواں کی قائل معلوم ہوتی ہیں۔ کسی دوسرے مضمون میں پراسنے رسم و رواج کی حاوی، کہیں وہ شاہ خرچ معلوم ہوتی ہیں

کہیں پر پیسے کو دانت سے پکڑنے والی کہیں پر اپنے اطوار و گشتار میں شہد و مشکر کی طرح شیریں کہیں پر نیزے کی آئی کی طرح تیز و تندہ و اصل نگو دوسروں کی بیویوں میں جو عیب یا خرابی دیکھتے ہیں فوراً اپنی بیوی پر لا دیتے ہیں۔ اس میں آسانی بھی رہتی ہے۔ بیویاں اپنے شوہروں کے مضامین کو "غرافات" سمجھ کر نہیں پڑھتیں۔ کسی دوسرے کی بیوی کا شوہر سر سجدہ کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ ادب بات کہنے کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے۔ کچھ عیب جو اس امر کو صحیح نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں صحیح بات یہ ہے کہ نگو اپنی بیوی تو بدل نہیں سکتے، اس کی عادتیں بدلنے رہتے ہیں، طنز نگاری کی خاطر یا تنوع کی خاطر کون جانے؟

اپنے طنز و ادب مزاحیہ مضامین میں نگو اپنے آپ کو ہدف ملامت بنانے سے نہیں چوکتے، ایک تو انہیں اپنی شکل و صورت پر اعتراض ہے۔ مجھے بھی اعتراض ہے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہم میں سے کون نکلی ہیرو ہے۔ کرشن چندر، کنھیا لال کپور، مجتبیٰ حسین، نگو تو نسوی، ضمیر حفیظ، یوسف ناظم، سوئے ادب نہ ہو اس لیے بڑے بزرگوں کے نام نہیں گشتار۔ مگر اصل قصہ یوں ہے کہ جب خدا نے طنز نگاروں کو بنایا تو اتنا تو سوچ لیا تھا کہ یہ لوگ دوسروں پر نہیں گئے۔ اس لیے ان پر دوسروں کے ہنسنے ہنسانے کا سامان بھی پیدا کر دیا گیا تاکہ توازن برقرار رہے۔ مگر یہ تو ایک فرد ہی امر ہے۔ نگو دراصل اپنی ذات کو سارے سماج کی خامیوں کا مرجع بنا کر بیٹھتے ہیں۔ ان کی ذات تو ایک کھونٹی ہے۔ جس پر وہ افراد اور سماج۔ حالات اور کردار۔ نفسیات اور اخلاقیات۔ منافقت اور مذہبیت کے مظالم اور نگو دفن، شعلہ و اور تضاد کے سراب اور ان کے رنگارنگ لمبوس ٹانگ ٹانگ کر قارئین کو ان کی شعلہ گرمی اور طبع بازی کے اندھ بھی ہوئی بدصدت حقیقت سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ بادی النظر میں نگو اپنے آپ پر ہنستے ہیں۔ گہری نظر سے دیکھیے تو وہ دنیا پر ہنستے ہیں، ماضی گہری نظر سے دیکھیے تو وہ ہنستے نہیں ہیں، رو رہے ہوتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ طنز نگار کے آئینہ نگار نے نہیں دیکھے۔ افسانہ نگار۔ ناول نگار۔ وقائع نگار

زندگی کے ایسے پر آپ کو رولا ہے طنز نگار نہ سنا ہے۔ وہ ادب کے صدف میں ایک آنسو کو منجمد کر کے اُسے قد آبدار بنا دیتا ہے۔ اس سہسی کی پرتوں کو ٹٹول ٹٹول کر اس ایک آنسو کی نرمی گری اور آہنج کو پالینا کسی ہندو قاری ہی کا کام ہے۔ ورنہ آج کل اکثر مجلس تہذیب رہتی ہے۔ جہاں ہزاروں لوگ کسی ایک فقرے کی ظاہری تراش و خراش پر سوچے بگھے بغیر بے تحاشا قبضہ لگاتے ہیں۔ مگر اس ایک آنسو تک کون پہنچ سکتا ہے:

نکو کے مزاج اور طنز کی کئی پرتیں ہیں۔ اسی لیے شاید اُس نے اپنے نکا ہید کالم کا نام ”پیاز کے پھلکے“ رکھا ہے جو شمالی ہند کے روزنامے ”ملاپ“ میں بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے اور جس نے شمالی ہند کے لوگوں کی جس مزاج کی صحت اور تہذیب میں ایک بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پیاز کے پہلے دو ایک پھلکے زیادہ کر ڈئے نہیں ہوتے۔ یہی حال نکو کے مزاج کا بھی ہے۔ پھر جوں جوں پیاز کے پھلکے اُترتے جاتے ہیں اُس کی کر ڈواہٹ بڑھتی جاتی ہے۔ یہی حال نکو کے طنز کا بھی ہے۔ آخری گھنٹی بڑی کر ڈی ہوتی ہے۔ اس قدر کہ آنکھ میں آنسو آ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب آپ نکو کے مزاج کی آخری گھنٹی پر پہنچتے ہیں تو ذہن میں اس کی تلخی اپنی پوری تیزی اور تندگی کے ساتھ چھا جاتی ہے۔ پیاز کے پھلکے... اسم با ستمی اسی کو کہتے ہیں۔

نکوئی اعتبار سے وہ سوشلسٹ ہیں۔ انقلابی۔ آدرش وادی۔ وہ اس گلے سرے سماج کو بدلنا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی میثشت کو تانہ اور توانا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ماہر بری کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ پرانے فیوڈل اسالیب کی جگہ انسانیت پرست اقدار کو مدراج دینا چاہتے ہیں۔ زندگی میں جہاں جہاں پر بد صورتی ہے، ظلم ہے، پستی ہے، اندھی اعتقاد پرستی ہے۔ اس کی جگہ نکو اک ایسے نظام نو کے حامی ہیں جہاں رنگ و نور کی شادابی ہو، باہمی الفت اور محبت کی باریابی ہو اور نئی نکر و نظر اور نئے سائنسی علوم کی کامیابی ہو

نکو اپنے طنز و مزاج میں ہمیشہ ان مقاصد کے لیے لڑے ہیں جو کے لیے

صدیوں سے انسانیت پرست ادیب ہر ملک اور ہر عہد میں لڑتے اور جدوجہد کرتے آئے ہیں۔ نمکونے اپنے مقصد کی آفاقیت اور اپنے فن کی بلوغت پر کبھی حزن نہیں آنے دیا۔ ان کا مقصد اعلا ہے اور کہنے کا ڈھنگ نرالا ہے اس لیے ادب کی تاریخ میں وہ ہمیشہ عزت و احترام سے یاد رکھے جائیں گے۔

کرشن چندر

فکرِ بیتی

میرے جنم پر دلیوتاؤں نے آکاش سے پھول نہیں برسائے۔ کیونکہ وہ حدیث کے راج محل پر پھول برسائے میں مصروف تھے۔ وہاں ایک شہزادے نے جنم دیا تھا یعنی جنم سے ہی میرے اور دلیوتاؤں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اب تک کشیدہ ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ شہزادے اور ادیب کو ایک ہی تاریخ اور ایک نمکشر میں پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ ۱۔ سے آپ قانونِ فطرت کا نقص بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن دلیوتاؤں کا رول بھی غیر مشرعیانہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ انھیں پھولوں کے استغفال کا مناسب ڈھنگ آنا چاہئے تھا۔ اور اگر نہیں آتا تو خدا کو کچھ اشیاء جنٹ دلیوتا پیدا کر کے چاہئیں۔

میں تو نس میں پیدا ہوا۔ اگر تو نس میں پیدا نہ ہوتا تو لاڑکانہ میں پیدا ہو جاتا۔ نمکشو بھی کوئی بری بگ نہیں تھی۔ لیکن ہر جگہ مجھے فکر تھا کہا جاتا اور ہر جگہ میرا باپ چوہدری مزاحیہ سنگھ کہ میری مصیبت مائے ہی ہوتا۔ جس کے گورخ لال تو قح ایک ادیب بنے تھا۔ اور دلیوتا پھول نہ برساتے صرف اس کیلئے بنا پر کہ میری مصیبت کے نیچے ذیروہ کو کرے نہیں ہیں۔ صرف ڈیڑھ گھر ہے۔

بیس برس بعد میرے باپ نے عجب پرانکٹات کیا: ”تمہارے پیداؤش کی خبر

مجھے جیتو ساریاں نے سنائی تھی تو میرے منہ سے صرف اتنا نکلا تھا " پر ساتواں بچہ ہے اور شاید بچائیوں کی طرح بھوکوں مرنے کے لئے پیدا ہوا ہے؟

یعنی میرے والد (محترم) کے لئے میری پیدائش کی اہمیت صرف ہندسوں تک محدود تھی، پانچواں، چھٹا، ساتواں - نتیجہ یہ ہوا کہ دواؤں کے ساتھ ساتھ ہندسوں کے بھی میرے تعلقات بگڑ گئے۔ آج تک بگڑے ہوئے ہیں۔ ہندسوں کو قرآن ان کا مقدس نہیں بننا چاہیئے۔

مگر جیتو ساریاں مجھے ہندسے نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ ایک بچہ سمجھتا تھا جس میں معصومیت ہوتی ہے۔ وہ گلوں میں واحد شخص تھا جس نے مجھے پیار سے دیکھا محلے میں گڑکی ٹانگڑی یا نمٹی اور اتنا بھی نہیں سوچا کہ وہ ایک سستی اور گھٹیا چیز یا نمٹ رہا ہے۔ وہ صرف اس بات کا قائل تھا کہ خوشی باتیں چاہئے۔ چاہے وہ گھٹیا اور سستی ہی کیوں نہ ہو۔

اور پھر ایک دن مجھے یوں لگا جیسے جیتو ساریاں کی مٹی بپا لوجوان ہو گئی ہے اور بچاؤ کو دیکھتے ہی میں نے بھی چھلانگ لگائی اور جوان ہو گیا۔ اس چھلانگ پر مجھے حیرت ہوئی اور مسرت بھی ہوئی۔ اور پر مسرت بچہ لڑتی ہوئی خیرے ہم دونوں کے ہونٹوں پر گلاب کدائے ادھیرے پاپو جیتو ساریاں کی ڈاڑھی میں ایک دم سفید بال اگ گئے اور میں نے بچاؤ کے گھر پر ایک ہلکا ساٹن "کنکر پینیکا" جیسے اٹھائے ہوئے وہ کمونیکسے آ رہی تھی اس "ٹٹی" سے اس کے سر اور چھاتی میں ایک دلکش "ٹٹاؤ" آگیا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی" بچاؤ نے من تنائی چھاتی کو لپو سے ڈھانپ کر کہا۔ "آتی ہے" میں مسکرایا۔

وہ منہ پھیر کر شرما گئی وہ شرمانے کی ادب میں مسکرایا کرتی تھی۔ اور بھر گئی دن تک ہم اپنے دل کی دھڑکنوں کی بھاشا سمجھتے رہے اور بھڑل ہنس دل میں اعلاٰن کیا کہ یہ پیار کی بھاشا ہے اور اس پیار میں جیتو ساریاں

کو دہی معصومیت نظر آئی جو ایک بچے میں ہوتی ہے اور اس نے میرے باپ سے کہا
 "میرٹھی! تمہارا بیٹا میری بھانجی کے گھرے پر کنگر بھینکتا ہے۔"

"اے! ایسا نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ ہمارا خاندان شریف ہے۔" میرٹے باپ کا
 خیال تھا کہ میں بچوں کو باسی سرکھے شکرے پانی میں کھنگر کر کھائے جائیں وہ بھی شریف
 خاندان کے بچے کھلا سکتے ہیں، مرغ و بکاسی کی زرخیز غلام نہیں ہوتے

میرا باپ ایڈورن میں خوش رہنا زیادہ بہتر سمجھتا تھا، مگر اس خوشی کو ایک
 دن نمبردار کے لڑکے داؤد خاں نے زیر دست حلقہ کا دیا، جب بھانجی تو سشباب
 کا سرخوردہ بلند کے کمنوس سے آ رہی تھی، اور میرے کنگر کا انتظار کر رہی تھی تو، داؤد
 خاں نے اپنی ریشمیں قمیص کے بازو بھانجی کے راستے میں پھیلا دیئے، وہ بازو
 کنگر نہیں تھے، بلکہ داؤد خاں کی آغوش محبت سمجھ رہا تھا، اس نے بھانجی کو چیلنج
 دیا۔ "مجھ سے عشق کرو۔ ورنہ"

"ورنہ؟" بھانجی نے ورنہ جھٹکے بچے میں کہی، ایسی سنہ "وہ گاؤں میں
 سوائے میرے ہر ایک سے کہہ سکتی تھی مگر جیتو ساربان کے پاس صرف دو اونٹ
 تھے، اور نمبردار کے پاس تین گھوڑیاں، پانچ بیل اور چھ ذکاری کتے تھے، ان سبھوں
 نے مل کر بھانجی کو گوسوتے میں اٹھایا اور ایک پہاڑی کھوہ میں لے گئے، اور پھر پہاڑی
 کھوہ سے کچھ چھینیں سستانی دیں، اور انگوٹوں سے منحوس آواز میں نکالیں اور پیاری
 گوتے کہلاتے ہوئے کھوہ سے بھاگ گئے اور میری چھت پر آ گئے، یہ عشق کی معصومیت
 کی اور اس کی روح کی تو بہن تھی، جیسے آگے چل کر شاعر وادیب کے قلم میں اُحن
 تھا۔

"اے! کیا کیوں؟ آخر کیوں؟" میں نے باپ سے پوچھا، جیتو ساربان سے
 پوچھا، دونوں نے ہم آہنگ ہو کر جواب دیا "ایسا ہی ہوتا ہے بیٹا! یہ جنگ کی ریت
 ہے جس میں نمبردار اور خاندان ایک دستہ ترخان پر بیٹھ کر مرغی کھاتے ہیں، اور ان
 کے بچے باسی کڑھی کھاتے ہیں، مرغی ان کی فریاد نہیں سنتی۔"

اور پھر میں راتوں رات گاؤں سے بھاگ گیا۔ اور گاؤں میں کسی کو بھی نہیں بتایا کہ میں ایسے جگ کو بدل دوں گا اور مرعی اور باسی رونی کا فاصلہ مشادوں کا پھاتو کو بھی نہیں بتایا۔ کیسے بتانا۔ اس نے تو کنوئیں میں چھلنا تک لگا دی تھی۔ باسی ٹکڑے نے اپنی تو جہا کے بدلے خود کشی کر لی تھی۔

چنانچہ خود کشی کے ہی میرے تعلقات بگڑ گئے۔ ایسی پھاتو سے بھی بگڑ گئے جو خود کشی کر کے سمجھتی ہے کہ اس سے لغائبدار اور نمبردار کے دسترخوان سے مرعی بھاگ جائے گی۔

اور پھر ایک دن یوں ہوا کہ میری ضمنی معصوم بچی راج رانی جس کے پاس نہ راج نواز وہ رانی تھی۔ صرف ایک گلاسٹر اکیلا اور کتابیں تھیں۔ بستے میں باندھے اسکول جا رہی تھی۔ کہ یکایک خطرے کا مارن بجا آسمان پر ہوائی جہاز منڈلانے لگے۔ ان ہوائی جہازوں میں کوئی لبتہ کیلا اور کتاب نہیں تھی۔ بلکہ ہم تھے اور انھوں نے کہا کہ یہ جنگ ہے۔ اور اگر تم اسکول جاؤ گی تو ہم پینک کریم تھیں ہلاک کر دیں گے کیونکہ ہم نے کتابیں پڑھ کر ہی یہیم بنائے ہیں۔ اور معصومیت پر یہیم مجھے یوں لگا جیسے نمبردار کا لڑکا داؤد خان پھاتو کے گھڑے پر اپنے گھوڑے کا سہما کر کہہ رہا ہو مجھ سے عشق کرو اور نہ۔۔۔۔۔

اور مجھے غصہ آگیا۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ قصہ انسان کو اندھا بنا دیتا ہے۔ پھر میں نے لاڈا سپیکر اپنے کاندھے پر رکھ لیا اور گاؤں گاؤں گھومنے لگا۔ "ہم امن چاہتے ہیں۔ امن۔ کس لئے؟ ضمنی راج رانی کے لئے۔ اس کے بستے کے لئے۔ پرائمری فادرے کیلئے معصوم انکھوں میں گنگنائے ٹیگور اور کافی داس کے لئے۔

اور گاؤں کے ادبڑ کھابڑ راستوں پر مجھے کانٹے جیسے جھاڑیوں نے اچھایا کیڑے۔ لت پت کیا، سوکھی مٹھی چائے، ابلتی بھوک اور ہوشوں کی مٹیوں نے مجھے تھما منے دئے کہ یہ مقدس کا زہ ہے۔ مہتری پٹا لگا کے گی۔ اور مرعی اور باسی رونی کا فاصلہ مٹ جائے گا۔ اور کس پھاتو کا گھڑا خود کشی نہیں کرے گا۔ اور پھر

سہرائی جہاز کا ہم مشرم سے بچھل جائے گا اور معصوم راج رانی کا گھلا سڑا کیلا ایک سبب میں بدل جائے گا۔ اور اس سبب پر ٹیگور کی گیتنا بھلی لکھی جائے گی۔

لیکن جب میں امن کا لاڈلا سپیکر کا منہ پر رکھ چل رہا تھا تو ایک ٹیلے پر مجھے بابا گورو دھن سنگھ بلا جہندہ برس تک کیلئے کو سبب میں بدلنے کی خاطر جیل میں رہا تھا۔ اس کی معصوم بھیا تو کو کسی نے ہم سے ہلاک کر دیا تھا اور وہ غصے میں آکر عذری یا بابا بن گیا تھا اور امریکہ بھاگ گیا تھا۔ وہاں سے دغائی جہاز میں بندہ قیں بھرا یا تھا مگر جہاز کو بابا اور بندہ ق سمیت انڈمان جیل کی دلدل میں پھینک دیا گیا تھا۔ اسی تھا بابا گورو دھن سنگھ۔ اس نے میرے کندھے پر امن کی فاحشہ کو دیکھ کر استہزائیہ تہقیر لگایا اور کہا۔

”تم بیوقوف ہو نیگ مین!“

کیا امن کی صدا لگانا بے وقوفی ہے بابا؟

”کیا امن؟ کس کے ساتھ امن؟ وہ فتنے پھڑکا کر بولا۔“ جو لوگ شکاری تھے جھوڑ کر ٹیگور کی گیتوں کو بھنبھوڑتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہم امن سے کیسے رہ سکتے ہیں۔ مرلی کو تم نے پالا ہے مگر اسے نمبردار کا بیٹا تھا نمبردار کے ساتھ بیٹھ کر کھانا ہے۔ کیا ہم اس کے ساتھ امن سے رہیں! مختار ابا پت کیا کام کرنا تھا۔

”جو بد رہی خرائن سنگھ کا میری فتنی تھا“

”بس وہی! اس نے امن کا لاڈلا سپیکر زور سے گرا دیا۔“ مختار بے چہرے

پر حیرانی میں جو جھپٹیاں ہیں۔ وہ اسی خرائن سنگھ نے ڈالی ہیں۔ یہ جھپٹیاں جب مٹ سکتی ہیں جب ہم خرائن سنگھ سے جنگ کریں گے۔ امن نہیں۔“

کیا بابا گورو دھن سنگھ میرے باپ کی طرح ایمرشی ہیں خوش رہنا جانتا تھا؟ چند ماہ بعد تاکہ بابا گورو دھن کے تعاقب میں پورٹ لائڈ نے اس کی ریڑھ کی ہڈی پر گولی چلا دی۔ الزام یہ تھا کہ اس نے کسی جو بد رہی خرائن سنگھ کی جاگیر میں آتشیں اسلحہ دبا رکھا تھا تاکہ اس کی فصل۔

تعلقات کشیدہ کرنے کے لئے یہی اس دنیا میں آیا تھا۔

نہایت احترام سے یہ سوال میں نے جمینی داس رنگ سارے سے کیا۔ جو مجھ سے آٹھ گھنٹے روزانہ کام لیتا تھا اور دو آٹے روزانہ دیتا تھا۔ میں اس کی بھارت رنگ سارکسٹی میں حسینا دل کے دوپٹے اور معززیاں کی پگڑیاں۔ نارنجی۔ گلابی۔ سرسئی رنگت تھا کیونکہ مجھے بھوک لگتی تھی اور کمپنی کو اس بھوک کا علم تھا۔ دو آٹے میں دال روٹی تو ملتی تھی۔ لیکن آلو گو بھی کی سپیشل سبزی نہیں ملتی تھی۔ ڈھابے کے مالک سری چند کو میں نے لاکھ سمجھایا کہ سپیشل سبزی کے لئے میرا من بے حد دلچاں ہے۔ لیکن وہ کہتا۔ لاچ بری بلا ہے۔ شاستروں میں سے اسے پاپ سمجھا گیا ہے

میں نے سوچا۔ شاستر دو آٹے روزانہ پالنے والوں کے لئے نہیں لکھے گئے۔ اور ایک دن بور ہو کر میں نے جمینی داس سے کہہ دیا۔ "ماستر جی! کبھی کبھی یوں لگتا ہے، جیسے میرے آپ کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے۔" وہ بولا۔ "کوئی حرج نہیں۔ میرے تعلقات تو اس سپاہی سے بھی کشیدہ ہو گئے ہیں جو مجھ سے پانچ روپیہ ماہانہ رشوت لیتا ہے۔ ہم کیا ہو تم کو اتنا شعور بھی نہیں کہ نارنجی اور دیلا رنگ ملنے سے کون سا رنگ جنم لیتا ہے، قرمزی یا بادامی۔" میں نے کہا۔ "میں تو انتہا جانتا ہوں کہ تھا نیدار کا رنگ جیب کر سنی نوٹ کے رنگ میں ملتا ہے تو پھیل کا رنگ جنم لیتا۔ جسے آپ ہر شام شاموں پھیل فروش سے خرید کر کھاتے ہیں۔"

پس کر جمینی داس نے مجھے فحش گالی دی۔ اور ملازمت سے الگ کر دیا۔ اور کہا۔ تم دوپٹے رنگنے کا فن کبھی نہیں جان سکتے۔ زیادہ سے زیادہ تم پگڑی اور دوپٹے کی قوس قزح پر ایک نلکے لکھ سکتے ہو۔

لہذا ہنڈ اور بیوٹا!

میں نے تھا نیدار سے رپورٹ کی۔ اس نے کہا۔ اگرچہ فی الحال جمینی داس

سے میرے تعلقات کشیدہ ہیں۔ لیکن رنگوں کے متعلق اس کا نقطہ نگاہ صحیح ہے۔ وہ رنگوں کی بھاشا زیادہ سمجھتا ہے جنہیں تو مچھلی کھاتا ہے۔

میں نے دل ہی دل میں عقائد پر اپنی ہستہ اندلی۔ اور بھاگ گیا ، بھاگتا گیا ، بھاگتا گیا حتیٰ کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

دراصل بھاگتے بھاگتے میں تیل جنبیلی سپیشل کی فرم کے قریب سے گذر رہا تھا جس کے مالک دھوم مل نے مجھے پہچان کر مجھے دیکھ کر میرے ہاتھ میں برش اور سیاہی کا ڈبر بکھا دیا کہ ہمارے تیل کا اشتہار شہر بھر کی دیواروں پر لکھ آؤ۔ تم بہت ترقی کر جاؤ گے جس آدمی کو وہ لقمے مل جائیں۔ اسے ترقی کہتے ہیں۔

مگر میں نے سوچا کہ دو لقمے بانٹنے کا سہرا اچھیں ملتا ہے جو تیل کی ساخت میں نکالوں سے فراڈ کرتے ہیں۔ ایک دن میں نے دھوم مل فراڈ سے کہا۔ مجھے چار لاکھ عوامیت کر دیجئے۔ کیونکہ آج خطرہ ہے کہ اشتہار لکھتے لکھتے مجھے بھوک لگ جائے گی۔

وہ بولا۔ "میرے بزنس کا اصول ہے کہ مزدوروں کو جب پینہ آئے اسے اجرت دے دو۔ لہذا چاؤ پہلے پینہ پیدا کرو۔"

میں نے کہا۔ "بشارتیں اصول ہے۔ لہذا ہاں ہی ہاں!"

"ہاں ہی ہاں۔" اس نے میری تائید کی۔

اور پھر دن بھر مئی جینے کی انکارے انگلی دھوپ میں دیواریں لکھتے لکھتے مجھ پر ہندوستانی بھر کا افلاس گذر گیا۔ مجھے پینہ آیا۔ پٹریاں جھیں۔ آنکھوں میں جھنگاریاں تڑتڑائیں۔ جسم میں بے در پے تڑپٹریاں آئیں۔ ہڑام سے بھوک کے بھوک کے بھول لگے۔ نروس سسٹم کو سینکڑوں جھکولے کئے۔ اور میں دھوم مل کی فرم سے دس بارہ گز کے قافلے پر غش کھا کر گر پڑا۔ میرا پینہ دھوم مل نے دیکھا یا نہیں دیکھا جب چھتیس گھنٹے کے بعد مجھے ہوش آیا تو میں ایک تاب میں لیٹا تھا۔ ان

ساجاں پر دیش کی ایک حسینہ مجھے پنکھا تھیل رہی تھی۔

میں نے بوجھا : کیا تم جیتہ ساریاں کی بیٹی پھانسی ہو؟
 وہ پہاڑی چیل سے اپنی پتھری چھپاتیاں چھپاتے ہوئے بولی۔ " پہلے تم بتاؤ
 تمہارا گھر کہاں ہے۔ مجھے تم پر پیارا آرہا ہے۔ مجھے دلہن بنا کر گھر لے چلو
 میں نے کہا : اس دنیا میں جہنم لیتے ہی میرا گھر کھو گیا۔ جب تک میں اسے تلاش
 نہ کروں اس وقت تک تم میری دلہن بننا ملنوی کرو۔ "

لیکن اس نے بتایا کہ بہت جلدی میں ہے۔ دو چار منٹ میں کسی کی دلہن بننا
 چاہتی ہے۔ ورنہ وہ حرامی دوسرا زار آجائے گا۔ جو مجھے بہکا کر لایا ہے کہ میں تمہیں
 شہر کی راجکارمی بنا دوں گا۔ لیکن یہاں لا کر اس نے میرے کنوارے کا ریشہ مقرر
 کر دیا۔ اس لئے آؤ۔۔۔ آؤ ریشہ کی اس دنیا سے بھاگ چلیں اور کسی پہاڑی
 کھنڈ میں بیٹھ کر دہا دلہن کا ازلی گیت گائیں۔

اور میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ کل جب وہ دوسرا دنشہر میں میرے
 رخسار کو گنڈیری سمجھ کر جو س رہا تھا تو کھڑ رہا تھا کہ میں انسانیت پرست ہوں۔ اس
 بے برہنہ چھوڑے کو شرم سے اٹھا لایا۔ کہہ نہ اس کی ناک بڑی معصوم لگی، مجھے
 دھوکا نہ دینے والی لگی۔ میں دھوکے والی ناکوں کی خوب پہچان رکھتا ہوں میں اسے
 اپنا شاگرد بناؤں گا۔

مگر بعد دہا دلہن کے بھاگنے سے پہلے چھپا پار پولیس آگئی اور دوسرا باز کے شاگرد
 کو گرفتار کر کے لے گئی اور پھر دوسرا باز کو زندگی بھر سیکڑ سکی، پولیس کو اس کی اور میری
 ناک کی پہچان نہیں تھی۔ جیسی ناک اور پولیس سے میرے تعلقات کشیدہ ہو گئے
 آج تک کشیدہ چلے آ رہے ہیں۔

اور پھر مجھے یاد نہیں۔ میں رگ گیا۔ اور جیسے مجھ پر صدیاں گزر گئیں۔ ازل سے
 اب تک بھینٹنے والا انسانی کارواں گزر گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ کچھ گھاؤ ہیں۔ کچھ پتھریاں
 ہیں کچھ انگوڑے ہیں جو میرا مسلسل تعاقب کر رہے ہیں۔ انہوں نے گیا کے جنگل میں

مجھے روک لیا، وہاں شاید، ایک گھنٹا پڑ تھا اور وہاں ایک بودھ، ایک گھیا، بیٹھا
تپسیا کر رہا تھا اور پھر گیارے آسمان سے ایک قلم گرا اور صدا آئی: ”جہاں جہاں سے
بھانگے ہو، وہاں وہاں واپس جاؤ اور اس قلم سے تپسیا کرو اور اس تپسیا سے گھاؤ کو
اور پیڑی کو اور سنگارے کو صُ، جذبے اور الفاظ عطا کرو اور یہ خدا کا حکم ہے اور
یا درکھو، خدا کا حکم اٹل ہوتا ہے۔۔۔۔“

اور اس صدا میں مسرت تھی جو میرے ساموں سے پھول کی طرح کھل اٹھی اور
میں نے قلم ہاتھ میں پکڑ لیا۔ جس سے یہ پھول خوشبو دینے لگے۔ اور مجھے یوں لگا جیسے
یہ میرے مقصد حیات کی خوشبو ہے۔ کیلے اور سبب کے واسطے کو ختم کرنے والی خوشبو
ہے۔ اور اسی خوشبو پر تیرتے تیرتے میں دنیا کو یہ بتانے کا اہل ہو سکا کہ دیوتاؤں نے
میرے جنم پر پھول کیوں نہیں برسائے۔ اور کہ خدا صرف ایک شرط پر انسٹیجنٹ دیوتا
پیدا کر سکتا ہے۔ اگر پیاؤ خود کشی ذکرے بلکہ گور دھن باجے کی طرح نو سر بازوں
سے جنگ کرے۔

جنم سے پُچھو جنم تک

ہستی کے مدت فریب میں آجائو اسد
عالم تمام حلقہ دارم خیال ہے

آہ افکر تونسوی

یا لآخر سیدوستان کے ریزعم خود مشہور و معروف (ادیب جناب فکر تونسوی) راہی ملک عارم ہو گئے۔ اس سے پہلے ان کے والد صاحب بھی انتقال کر گئے تھے۔ اور اس سے پہلے دادا صاحب بھی۔

مرحوم موضع تونسہ ملک پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر مرے دہلی میں موت کے وقت بریلی میں ہوتے تو بریلی میں مرتے۔ جو انا مرگ نہیں تھے اور خوشی کا مقام ہے کہ وہ اپنی عمر سے نسبتاً زیادہ ہی جی کر مرے۔

مرحوم کو برسوں پہلے ایک پامٹ لے بنا دیا تھا کہ آپ کو مرنے سے پہلے بیش بہا دولت ملے گی۔ مگر فسوس کہ پامٹ کی صرف ایک بات صحیح نکلی یعنی وہ مر گئے اور دولت والی بات انتہائی بے بنیاد نکلی۔ اس پامٹ کے بارے میں عام مشہور تھا کہ اس کی وہی بات صحیح نکلتی ہے جو واقعی صحیح ہوتی ہے۔

مرحوم کے انتقال میں کوئی حرج نہیں تھا۔ صرف ایک لحاظ سے یہ موت دردناک ہے کہ وہ مرنے نہیں چاہتے تھے کیونکہ انھیں دنیا میں ابھی بہت سے کام کرنا تھے۔ مثلاً۔۔۔ انھیں ایک صوفیہ سیٹ خریدنا تھا جس کی تناوہ پندرہ سال سے لے پھرتے تھے۔ ایک پبلشر سے ٹوٹو میں کرنا تھی۔ جو ابھی تک (مرحوم کی شرافت نسبی کے باعث) قلمی چلی آرہی تھی۔ اور انھیں کسی حسینہ سے محبت بھی کرنا تھی۔ کیونکہ یہ کام بھی گزشتہ چالیس

برس سے التزام میں پڑا تھا۔

مرحوم کو وہم تھا کہ وہ کسی اونچی جگہ سے گر کر مر گئے۔ چنانچہ مرحوم نے ہر اونچی چیز سے پرہیز کرنا تھا۔ اونچے پیاز، اونچی سواری اونچے جانور، اونچے آدمیوں جی کہ اونچے عہدے پر پہنچنے سے بھی بچتے تھے۔ ایک مرتبہ انھیں اندر مشہد پیدا ہوا کہ کہیں زرق کر کے گرتے وہ فلیوینٹ پارٹی میں ریڈ رن میں جا بیٹیں۔ چنانچہ اسی ڈر سے فلیوینٹ پارٹی چھوڑ دی۔

بہذا وہ صرف پیدل ہی چلا کرتے تھے۔ پیدل چلنے کی انھیں کافی مشق تھی اپنے عہدہ افلاس کے پورے بیس سال پیدل چلنے کاٹ دیئے تھے۔ لیکن۔۔۔ نوشتہ تقدیر کو کیا کہیے کہ باوجود احتیاط کامل کے وہ اونچی جگہ سے ہی گر کر ہر لوگ سدھارے۔ ایک دن کتاب پڑھتے پڑھتے پیدل جا رہے تھے کہ سڑک کے ایک چھوٹے سے گڑھے میں پاؤں جا پڑا۔ گرے اور پھر اسی وقت اٹھے جب انھیں جنازے کے لئے اٹھایا گیا۔

احتیاط سے انھیں آخری وقت پر دعاوی حالانکہ انھوں نے پوری زندگی احتیاط میں گزار دی تھی۔ احتیاط کہی گول گپا تک نہیں کھاتے تھے کہ کہیں کھانسی نہ ہو جائے۔ اور جب کھانسی ہو جاتی تو اس کا علاج نہ کروانے کہ کہیں ڈاکٹر غلط دوائی نہ دے دے۔

مرحوم اپنے پیچھے ایک بیوی، انہیں نیچے اور چند دشمنی چھوڑ گئے۔ دشمن دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جن سے مرحوم نے قرضہ لیا تھا اور دوسرے وہ جنہوں نے مرحوم سے قرضہ لیا تھا۔ رسم جنازہ کے وقت تمام دشمنوں نے اعلان کر دیا کہ آج سے دشمنی ختم اور اب ہمیں مرحوم سے کوئی گلا نہیں رہا۔

مرحوم اس سے پہلے بھی ایک بار فوت ہوئے تھے اور ڈیڑھ ماہ تک فوت رہے تھے۔ آخر تنگ آکر ایک اخبار کو جھٹ لکھ دی کہ وہ گنگا پور ضلع چپارن میں بقیہ جاتا ہے۔ دراصل وہ فوت کا اعلان کر کے عامۃ الناس کو ایک خاک (S H OCK)

دنیا چاہتے تھے مگر سوائے بیوی اور مالک مکان کے کسی نے آنسو نہیں بہائے
لہذا وہ اپنی موت سے بے حد مایوس ہو گئے اور اعلانِ موت کی تردید کر دی۔

مگر اس مرتبہ وہ حقیقتاً انتقال کر گئے ہیں۔ اور ان کی موت کی تصدیق
بڑے بڑے اہل الرائے اور ثقہ حضرات نے کی ہے۔ ان کے جنازے میں علماءِ مدین
شہر شامل ہوئے۔ ایک مانتی جلسہ بھی منعقد کیا گیا، جس میں ان کے پساندگان
کے لئے چندے کی اپیل کی گئی۔ ایک دانی شہری نے برسرِ جلسہ اعلان کیا کہ انھوں
نے ایک فرم سے ڈیڑھ سو روپے لینا ہے وہ وصول کر کے میرے چندے میں شمار
کیا جائے (فرم مذکور دیوبند پرچہ کی تھی)۔ ایک پبلشر نے وعدہ کیا کہ انھوں نے مرحوم
پر جہازِ حبشیتِ عربی کا مقدمہ کر رکھا ہے اسے واپس لیتے ہیں اور اس واپسی
کو ہی ان کا ادراوی فنڈ تصور کیا جائے۔ اس پر تالیماں بجائی گئیں اور پبلشر کو
چھوٹوں کے ہار پٹائے گئے۔

مرحوم چند ایک اوصافِ حمیدہ کمالک تھے اور چند ایک اوصافِ حمیدہ کے
مالک نہیں تھے۔ اس لئے بڑے متوازن انسان تھے۔

دوسروں کو اذیت نہیں دیتے تھے۔ اپنے بچے کو چیت مارتے تو نیچے کے بجائے
خود رونے لگتے۔ شفقتِ پدری کے سبب نہیں بلکہ اس ڈر سے کہ بچہ برا مان جائے گا
بڑوسیوں سے بہت کم بولتے تھے کہ کہیں کوئی اختلاف رائے پیدا نہ ہو جائے۔ کم
تعلیم یافتہ لوگوں میں حسد کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ قرص نے کہا تھی جلدی لڑاوتی
تھے کہ قرص خواہ گوشت پر جانا کہ مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن کئی بار قرص نے کہیں واپس
ہی نہ کرتے۔ اور اپنے آپ کو کافی رزق محسوس کرتے۔ اصول طور پر خودی کے قائل
تھے۔ لیکن آخری عمر میں غاصے خوشامدی ہو گئے تھے۔ کہا کرتے تھے۔ خوشامد کے
بغیر خودی کو برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہے۔ مگر اپنی خوشامد کا مذاق پس انداز کرتے
تھے قرص بڑے رنگارنگ آدمی تھے۔

مرحوم کو اپنے خیالاتِ غلام کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اور یہاں شوقِ انھیں نے دوبا

میں اپنے خیالات ظاہر کر بیٹھتے اور — یوں اپنا ترکٹن خالی کر بیٹھتے۔ چنانچہ لوگ انھیں جتنا پاکر ہلاک دیتے، اپنی طاقت کو بڑا سرا نہیں رکھ سکتے تھے، نتیجتاً معمولی دھرمیوں اور علویوں تک سے مارکھا جلتے اور پھر ٹسوے بہاتے کہ دنیا کمینہ ہے کر رذوق ہے (آہ! دنیا کے متعلق مرحوم کا تجزیہ کتنا حقلانہ تھا؟)

مرحوم کی زندگی کا آغاز بے رذوقیوں سے ہوا۔ ماں رونی ٹکے سوکھے ٹکڑے پانی میں بھلکھ کر کھلائی تو پروٹسٹ نہ کرتے۔ ذوق دستور سے چباتے۔ استادان کی تعلیمی قابلیت کی داد دیتے تو وہ فخر کی بجائے شرم جلتے، بھجوری انھیں دھکا دے کر گرا دیتے تو اس کا ذکر کسی سے نہ کرتے۔ زیادہ سے زیادہ گھر اگر طرز تپاک اہل دنیا پر ایک نظم لکھ دیتے۔

غرض ایسی ہی پے در پے بے رذوقیوں میں ان کی روحانی نشوونما ہوئی اور اگر فطر تا ذہبی نہ ہوتے تو لوگ ان کی ہڈیاں ٹکس پیس دیتے یہ ذہانت خدا کی دین بھلی مانکا اپنا اس میں کچھ نہیں تھا۔ اپنی تو صرف بیہوشیاں تھیں۔ اس کے والدین کی مالی حالت بہرحم کھا کر تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور ایک ننگے بیز کے پاں پگڑیاں اور روپے رنگے کا کام کرنے لگے۔ بعد میں جب مشہور ادیب بن گئے تو بقیہ اس رنگ۔ ریز کے بڑے مغرور رہا گئے۔

مرحوم نے رنگ۔ ریزی کے بعد کئی پیشے اپنائے۔ رنگ۔ ریزی، اکبر زبیری، کلرکی، اسکول ماسٹری، پیپٹری، کانداری، چتر اسی گیری، طبابت — اور جب کہیں کامیاب نہ ہو سکے تو والدین نے ننگ۔ اگر ان کی شادی کر دی۔ اگر اس وقت شادی نہ ہوئی تو سنیا س دھارن کر لیتے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قدرت کو ان سے بڑے بڑے کام لیتے تھے۔ اس لئے قدرت نے ان کا بیاد کر دیا۔ اہلیہ محترمہ نے آتے ہی ان کی سجاوٹ اور شرافت پر نا بڑ توڑ ٹھٹھے شروع کر دیے۔ اور یہ اہلیہ محترمہ کی ہی دین سے کہ وہ آخری عمر میں بڑے ڈپلومیٹ بن سکے کہتے تھے۔ اگر میں کمینگی کو اپنا تا آج تک اسٹیٹ کا چیف منسٹر ہوتا۔

مرحوم اچھے خاصے انسانیت پرست تھے۔ ہر وقت انسانیت کی بربادی کا خطرو
 لاحق رہتا۔ جتنی دیر جئے، یہودی آدم کے علم میں جئے۔ اور اگر عمر خضر بھی مل جاتی تو بھی
 یہودی آدم کہتے رہتے۔ کچھ پوری طرح تو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس قسم کی یہودی آدم
 چاہتے تھے۔ لیکن ایک بات صاف تھی کہ انسانیت کو کافی زیادہ بلند کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً وہ چاہتے
 تھے کہ پورے عداوت کے سامنے جاتے ہی ان لے کہ میں نے چوری کی ہے۔ انھیں
 بہت سمجھا یا گیا کہ یہ ناممکن ہے مگر وہ مصرعہ کہ ممکن ہے صرف مرنے سے
 ایک دفعہ پہلے بخشش ماننے کو چھپاس فیصدی ممکن ہے۔

بہر کیف انھوں نے زندگی بھر بنی نوع انسان کی خاطر کام کیا۔ مثلاً نظموں
 کی ایک کتاب قلم بند کی۔ گھاس میں یہودی آدم کچھ زیادہ گہری ہو گئی کہ کسی آدم
 کی سمجھ میں نہ آ سکی۔ ادیبوں کی کئی نمونیں نام لیں، جو آپس میں لڑ جھگڑا کر ختم ہو گئیں۔ دو نمونہ
 اخبارات اور چار ادبی ماہنامے تجارتی کئے ہوئے بنی نوع انسان کی عدم توجہی کے باعث
 یکے بعد دیگرے بند ہو گئے۔ ایک مرتبہ دیواروں پر یہودی آدم کے نعرے لکھنے کے
 لیے نکلے تو تھکے تیز دھوپ کے باعث سرک پر بے ہوش ہو گئے، یہودی آدم کے سلسلہ
 میں ایک مرتبہ گرفتار بھی ہوئے تھے۔ لیکن میڈیکل گزٹرنڈ پر راکٹ پیسے گئے اور آئندہ
 گرفتاری سے توبہ کر لی۔ مگر عام طور پر انڈر گرڈ انڈر گسٹوں اور باغیوں کو اپنے
 گھر میں پناہ دیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے۔
 بعد میں معلوم ہوا کہ وارنٹ سیاسی خیالات کے باعث نہیں، بلکہ قرضہ کی وصولی کے
 سلسلہ میں جادی کئے گئے تھے۔ آخر پوری نے فیورینچ کر قرضہ چکا دیا۔ اس واقعہ کو یاد
 کر کے بڑے آبدیدہ ہو جاتے اور کہا کرتے، میری بیوی بنی نوع انسان کی بچی خادم ہے۔
 قیسری مرتبہ جب گرفتار ہوئے تو اس لیے کہ عالم سستی میں ٹیکسی دہلے سے لڑ پڑے، جو
 ناچانکر ایہ طلب کر رہا تھا اور یہ کہ یہ یہودی آدم کے منافی تھا۔ نتیجتاً ایک نائٹ ٹوٹ گیا
 ایک ناخن آٹر گیا اور پاؤں کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی۔

انسانیت کو بلند کرنے کے سلسلہ میں انھوں نے آجود ورجن طنز یہ کتابیں لکھ ڈالیں۔

جو سب کی سب مقبول عام و خاص ہوئیں۔ اگرچہ ان کے پیبشروں کو ہمیشہ شکایت رہی کہ ان کی کتابیں بکتی نہیں، جاسوسی ناول زیادہ بکتے ہیں، ایک بار انھوں نے ایک جاسوسی ناول بھی لکھا، وہ بھی نہیں بکا۔

اُن کی تمام کتابوں میں بہلول دی آدم کے ہی تذکرے نہیں، جن میں جاہلانی سے لے کر خداوند تنہائی تک ہر ایک نئے مخلوق کی گئی ہے کہ یہ چیزیں بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے ہی پیدا کی گئی ہیں، خدا کو بھی وہ پیدا شدہ چیز سمجھتے تھے۔ کانسرتھے تا۔ ۹، انوسس ہے کہ ان کی کتابوں کے صرف ایک ایک ایڈیشن ہی بچے اور بیہودہ آدم اور سوری رہ گئی۔

طغیہ کتابوں کے علاوہ ایک سیاسی کتاب بھی لکھی جس میں ایک سیاسی رہنما کا قصیدہ تھا مگر رہنما مذکور کے سیاسی نروال کے باعث کتاب مارکیٹ میں نہ آ سکی۔ یہ رہنما بھی بہلول دی آدم کے سلسلے میں ہی کام کر رہا تھا۔

اخلاقی پایہ کی ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے ایک نہایت گھٹیا بازاری مشق سے بہلول دی ناول بھی لکھا تھا، جو گلاسروں کی طرح خوب بچا صرف اسی کتاب کی رائٹنگ سے ہی ان کی بیوی نے طغیانی دیور بنوائے (مروج ان دیورن کو دیکھ دیکھ کر ہمیشہ مسد آہ بھرتے اور کہا کرتے:

مستمر! یہ زیور نہیں، بنی نوع انسان کی بڑیاں ہیں جو تم نے پہن رکھی ہیں۔ انوسس کسانوں نے غریب بازاری ناول لکھنے سے توبہ کرنی اور بنی نوع انسان کی مزید بڑیاں سونا نہ بن سکیں۔

اولاد: جب کہ مروجس دُنیا سے اُٹھ گئے ہیں، اُن کے کار ہاؤسے نمایاں کی دوبارہ ترمیم و منازات کرنا ضروری ہے۔۔۔۔۔ اگرچہ ان کی خاسیاں ان کے ساتھ ٹوٹ گئیں۔ اس لیے ہمیں کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اُن کی خوبیاں ہمارے درمیان رہ گئی ہیں، اور اب یہ دُنیا کا فرض ہے کہ ان خوبیوں کو تیریوں کی طرح پائے پورے اور بس عظیم کام کو مروجس

ادھر را۔۔۔۔۔ پھرتے گئے ہیں اسے پورا کرے۔ اور اگر پورا نہ کیا گیا تو خطرہ ہے کہ مرحوم کی روح ایک بار پھر یہاں آجائے گی اور ایک بار پھر دنیا میں انسانیت پر قہر کا پہیہ گھومتا ہو جائے گا۔ آمین۔ آمین !

میری وصیت

میں یہ وصیت نامہ اس لیے لکھ رہا ہوں تاکہ میرے بعد میری جائیداد پر جو
 دلچسپہ کرے کے مکان پر مشتمل ہے جھنگڑا کھڑا نہ ہو جائے اور میرے وارث ایک
 دوسرے کا خون نہ کر ڈالیں۔ کیوں کہ گزشتہ دنوں ہمارے محلے کے ایک بھائی نے
 دوسرے بھائی کا ایک گھٹنا اور ایک ٹانگ اس بات پر توڑ دی تھی کہ ان کا مرحوم باپ
 اپنے پیچھے جو اینٹیں چھوڑ گیا تھا ان کی تقسیم پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ ایک بھائی نے ایک اینٹ
 زیادہ اٹھائی تھی۔ اینٹ کا سائز چھ اینچ ضرب دس اینچ بتایا جاتا ہے۔

میں یہ وصیت پیشگی لکھ رہا ہوں، کیوں کہ میں نہیں جانتا کہ میں کب مروں گا
 مختلف جو تشریروں نے میری عمر مختلف بتائی ہے۔ ایک نے پچاس سال، ایک نے پچتر
 اور ایک نے نوے۔ یہ نینوں اندازے صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ کیوں کہ آج کل

کے جوتشی قلعہ پلشروں کی کتابیں پڑھنے میں۔ میری عمر اس وقت اسی سال
 ہے۔ میں ممکن ہے میں ایک سو اڑتالیس سال تک بھی زندہ رہوں۔ کیونکہ سنا ہے کئی بڑے
 بڑی بڑی بیسی عمر تک جیتے رہتے ہیں۔ اتنی ہی عمر تک زندہ رہنے کی صرف دو وجہیں ہو
 سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ زیادہ دیر تک صبح کی سیر کا لطف اٹھاتے رہیں اور دوسری
 یہ کہ ان کی خیر خواہوں میں شائع ہو سکے کہ غلام صاحب ایک سو اڑتالیس سال کی عمر کے ہیں
 لیکن ابھی زندہ ہیں۔ نہ جانے ان کے زندہ رہنے چلے جانے کی وجہ کیا ہے ؟

پھر کیف میں ممکن ہے صرف اخباریں خریدنے پانے کی خاطر مجھے بھی ایک سو اڑتالیس
 سال تک زندہ رہنے کی حماقت کرنی پڑے۔ حماقت انسان کی مجبوری ہے۔ خدا بخش نہیں ہے !
 میرے گھر کے چھاٹروں میں رسالوں زیر تعمیر ہے، میں نے زندگی میں جو کچھ کما لیا ہے
 انرا دل سے اپنا فرض منصبی سمجھ کر کھا گئے۔ میرا بیٹا لا کا جب خود کمانے لگا تو مجھے نمایاں غیرو
 دے کر مجھے سے الگ ہو گیا۔

چند سال پہلے ایک بیمار اینٹ نے مجھے موت کا ہزاؤ دکھا کر گمراہ کر دیا تھا اور میں
 نے دو ہزار روپے کا بھیر کھالیا تھا۔ دو سال تک قسطیں ادائیگہ کرتا رہا۔ اس دلدان میں
 وہ بیمار اینٹ خود مر گیا، اچانک ایک دن میں اپنے دو چھوٹے بچوں کی باتیں سن کر گمراہ
 راست چلا گیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”بچو! ڈیڈی نے یہ کہیں کو مار کھا ہے ؟“

”ہمارے لیے“

”ہمارے لیے کیسے؟“

”دیجئے وقت ! جب ڈیڈی مر جائیں گے تو یہ دو ہزار روپے ہمیں مل جائیں گے۔“

”نہ جانے ڈیڈی کب مرے گی؟“ ————— ”جب بنگوان چاہیں گی۔“

”نہ جانے بنگوان کب چاہے گا!“ (ٹنڈی آؤ !)

اور میں راہ راست پر آگیا اور بیچے کی مزید قسطیں دینا بند کر دیں۔ کیوں کریں نے
 سنا تھا کہ بنگوان نئے بچوں کی رعنائیں جلد قبول کر لیتا ہے..... اس لیے میں وصیت

مکہ کا جوں کہ اگر میری موت کے بعد میری کمپنی میری جمع شدہ قسطیں واپس کرے تو چھوٹے
میرے بچوں کو نہ دیے جائیں بلکہ کسی تاجر خانے کو دیے جائیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے بعد
میرے بچے بھی یہی کمپنی کھلائیں گے لیکن موت کے بعد میرے بچے بھی اپنے آپ بے بس ہیں۔

میرا جو فریضہ کمرے کا مکان ہے اسے میرے گھر کے چار افراد میں تقسیم کر دیا جائے
احتیاطاً عرض ہے کہ میں نے یہ مکان بھارت شدہ حارفناں کمپنی سے قرضے کے گریڈ پر
تھا اور میرے گھر واسے نہیں جانتے کہ اس نے قرض کی قسطیں کی کن غصہ مرقیوں سے ادا کیں۔
مثلاً میں نے بچوں کی نیکیوں میں سے کپڑا بچایا انھیں بوٹے دیئے جڑا ہیں بھالیں۔

ایک بار میں نے اپنے چھوٹے بچے سنتوش کو چھوٹے سائز کی سٹیٹ خرید کر دی یعنی سائز
بچایا۔ میں نے بچوں کے دودھ میں پانی ملا کر انھیں بتایا کہ بتلا دودھ صحت کے لیے مفید ہوتا
ہے۔ میں نے تین تین بچوں کو ایک ایک چار پانی پر سلا کر ان میں برادوں و انوت پیدا کی،
کایج کی چوڑیاں پہنا کر میں نے بیوی کو زیاور و وانگ اور و نکش کہا اور اپنی تین چوتھائی
عمر بیوی کو یہ سمجھانے پر صرف کی کہ تم چاند کی طرح حسین ہو۔ کیوں کہ چاند گھنے اور ساڑیاں
نہیں پہنتا۔

یعنی اس طرح میں نے قرض کی قسطیں ادا کیں اور یہ باتیں میرے گھنے میں کسی کو
معلوم نہیں۔ اگر میں اپنا غم نہ چھپاتا تو گھر واسے کسی خوش نہ ہوتے اور یہی میری ذہانت تھی۔
انسان غریب ہر تو ذہین ہو جاتا ہے اور صرف ذہانت ہی نے غریبی کا ساتھ دیا ہے۔ قناس
کپندیوں نے نہیں:

لیکن میری ذہانت کے باوجود قناس کمپنیوں کی قسطیں بھی تک باقی ہیں اس لیے
قانونی طور پر کمپنی ہی اس مکان کی مالک ہے۔ اگر میرے وارث میری قسطیں ادا نہ کریں
تو بلاشبہ اسے قرق ہونے دیں۔ میں اپنے مرنے کے بعد بھی اپنے اسلاف کو ہندو بھنا چاہتا
ہوں۔

میرے بعد میرے بچوں کا کیا مستقبل ہو گا؟ میں کوئی کالے نہیں چاہتا
کیونکہ میری تحریروں یہ ہے کہ ہر چہ اپنا مستقبل خود بنانا ہے۔ والدین تو بچے کی کڑی ہیں

جسے ہر بچہ آسانی سے توڑ دیتا ہے اور توڑنے کے بعد کوئی خواہ مخواہ لگایا ہے کوئی کلرک بن جاتا ہے۔ کوئی پریسٹر کوئی غنڈہ اور کوئی تھانیدار کبھی کبھی کسی خواہ مخواہ فروش کا بچہ وزیر بھی بن جاتا ہے اور اس وزیر کا بچہ جیپ کاٹتے ہوئے بھی پکڑا جاتا ہے۔

اس لیے بچوں کے ہاتھ میں پیپ کو دیتے کرنے کا کوئی حق نہیں، البتہ فروا فروا میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرا لڑکا پاشی تو ظلم، کیش ٹینے کے لیے بھاگ جائیگا، لیکن وہ تھائی لینہ میں بلیک کی ٹیمیں جتا ہے۔ دوسرا لڑکا رام کمار کوئی نہ کوئی سٹوڈنٹ بنے گا۔ اگرچہ اس بے چارے کو ابھی یہ علم نہیں کہ اس کے اندر دھرم کے نام پر لوٹ چائے کی کتنی صلاحیت موجود ہے۔

آج کل وہ ایک دیوی کا بھگت ہے جو ہزاروں گماتی ہے۔ رام کمار بھی ہزاروں کہنے لگا۔ گوردین کرکار پر چڑھے گا۔ ٹوٹے میں رہے گا۔ بڑے پٹنڈو سٹریٹس اس کے سپیے پاؤں و صوف میں جے جینا میں اس کے ارد گرد رقص کریں گی اور رام کمار انھیں بتائے گا کہ یہ رقص یہ خوشبو میں آتا اور پرہاتما کے وصال کا ذریعہ ہیں۔

اور اگر رام کمار یہ سب کچھ نہ کرے گا یعنی وہ ذرا سا بھی ٹھیک گیا تو ٹنگا میں جا کر چھلانگ لگا دیگا کیونکہ آتم ہتیا بھی آتما اور پرہاتما کے وصال کا ذریعہ ہے۔ تیسرا لڑکا مجھے ناتھ چنڈاسی، قلی، بس کھنڈیشٹر، اور ڈو ویزن کلرک، ان میں سے کوئی عہدہ پانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر سماج نے اسے ان میں سے کوئی چیز حاصل نہ کرنے دی تو وہ کیونٹ پادری میں شامل ہو جائے گا یا شاعر بن جائے گا۔ مجھ سے ناتھ بنیادی طور پر نیک اور خلص آدمی ہے۔ اس لیے اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ کلرک بن جائے، پھر شادی کرے، پھر بچے پیدا کرے، جیسا کہ ہر بے بس گھر بستی میں رواج چلا کرتا ہے۔ البتہ وہ منہ کا مزہ پانے کے لیے کلرک کے ساتھ ساتھ کسی سیاسی پارٹی کا صدر بھی بن جائے اور شاعری وغیرہ بھی کرتا رہے تو کوئی رنج نہیں۔ سوسائٹی ایسے لوگوں سے بھری چلی ہے۔

میری دولہاں بھی ہیں جنہیں میں لوگوں سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ بڑی لڑکی باہر اٹھائیس سال ابھی تک کنواری بیٹی ہے، وہ دوشیزگی میں بھی بیوہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس نے دوشیزگی اور بیوگی کی درمیانی سترل خواب ہی خواہیں پار کر لی ہے۔

میں نے کئی بار جان بوجھ کر آنکھیں بند کیں تاکہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے اور نہیں بھاگی
شائد اس کا خیال ہے کہ عزت و درخانہ انوں کی لڑکیاں کسی سے پیار نہیں کرتیں بلکہ پیار اور
شادی کے مراحل خواب میں طے کرنے کے بعد جو گن بن جاتی ہیں یا سماج سدھار کا کام
کرنے لگتی ہیں۔

بہر کیف بالا کا مستقبل طے شدہ ہے یعنی بیوگی اور سماج سدھار جب اپنا سدھار
نہ ہو سکے تو سماج ہی کا سدھار کرنا پڑتا ہے۔

دوسری لڑکی وینا ہے۔ دھڑکیس سال، اگر اس کی زندگی میں کوئی غیر متوقع حادثہ
نہ ہو گیا تو وہ اپنی بڑی بہن کے نقش قدم پر چلے گی۔ گزشتہ دو برس سے وہ اکثر خاموش رہنے لگی
ہے۔ یہ خاموشی خطرناک ہے۔ بچے شک ہے کہ وہ میری موت کا انتظار کر رہی ہے۔ کاش میں
میں جلدی انتقال کر جاؤں تاکہ اس کی خاموشی کے طوفان کو کنا دے توڑنے کا موقع مل سکے۔
بچے اس سے بچ کر بڑی محبت ہے میں نہیں جانتا کہ کیا یہ شادی سے پہلے اس پر بھی بیوگی کا زمانہ
آجائے، بیوگی سے پہلے کم از کم شادی شدہ تو ہونا ہی چاہئے۔ شادی نہ ہو ہی پیار رہا ہی !
وینا کا خاموش طوفان چھیری - منا - بڑ بڑلے گا تو میری دیت ہے کہ وہ ضرور
کنا دے توڑے اس سے میری ننا کو تسکین ملے گی۔ سماج سدھار کے لیے میں صرف ایک
لڑکی بھیٹ کر سکتا ہوں، دونوں نہیں !

میرے خاندان کی سب سے بڑی سنیا میری بیوی ہے، وہ سادی زندگی میری ساتھ
محبت اور نفرت کے درمیان شقی رہی ہے۔ میرے بعد وہ لڑکیں مار مار کر روئے گی کہ میرے
سر کو سایہ نہ دے گی مالا لاکھ میں اس کے سر پر ہمیشہ چھلپتی دھوپ کی طرح پھیلا رہا وہ میری پہلی کی طرح ہونگتی رہی۔
میرے بعد دھوپ اور چھلپتی دونوں کا ردل ختم ہو جائے گا اور گھبراہٹ میں ایک اندھیرا چھا جائے گا۔
اُس اندھیرے سے بچنے کے لیے یہی کہا کرتی ہے کہ "مے بھگوان اگلے میرے ہنڈی دیو سے پہلے
اس دنیا سے اٹھالے" اگر بھگوان ایسا نہ کر سکا تو مجبوراً میرے بعد ہی میری جائیں ہوگی۔
وہ ایک دلیر عورت ہے۔ لیکن صرف میرے لیے بڑ بڑلے کے سامنے۔ جب بڑ بڑلے درمیان
سے نکل گیا تو اس کی دلیری بیکار ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ میرے بعد وہ خاندان کے

شیرازہ کو بکرنے سے روک نہ سکے گی۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ جب شیرازہ بکھر جائے تو وہ کسی درحد اکثر میں داخل ہو جائے۔ کیونکہ ہر ہندوستانی عورت کی دو منزلیں ہیں۔ گھر ہستی اور وہ عورت اکثر درمیان کی سبھی منزلیں دھوکا میں، غریب ہیں۔ چھلاوہ ہیں۔

اس کے علاوہ میں اپنے نیچے کچھ دشمن چھوڑ کر جاتا ہوں۔ یہ سب دشمن کہیں میسٹر دوست تھے جب ایک ایک کے میرے دشمن بن گئے تو میں نے مزید دوست بنانا چھوڑ دیا۔ اس لیے اس وقت میں کوئی دوست نہیں ہے اور بغیر دوست کے مر جانے میں مجھے بہت ہمت رہی ہے۔ مجھے اطمینان ہے کہ اب میرا کوئی دوست میرے چھوٹے بھائی سے ہمدردی کرنے نہ آئے گا۔ صرف دشمن ہی آئیں گے جو کہیں گے۔ اب مرحوم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں رہی۔ میں نے زندگی میں کچھ لوگوں کے ساتھ نیکیاں کیں جن کا احترام زندگی میں کسی نے نہیں کیا۔ لیکن اب وہ انہیں اپنے دماغ کے قبرستان میں سے کھود کھود نکالیں گے اور کہیں گے۔۔۔ مرحوم عظیم تھا۔ ایک تھا جس کا پھل اسے فرو دینے کا تھا۔ وہ بلے کچھ مزید بچاؤ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ وہ اور نیکیاں بھی کرتا تھا۔

یہ سب کچھ لوگوں سے برائیاں بھی کی ہیں جنہیں لوگوں نے میری زندگی میں ہیشہ یاد رکھا ہے۔ لیکن میرے مرنے کے بعد وہ انہیں بھول جانے کی کوشش کریں گے۔ یہ ان کے کڑواہ کی جلدی ہوگی۔ اخلاق ہیٹھ موت کے بعد بلند ہوتا ہے۔ لیکن انہیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ انہوں نے بھی مجھ سے کافی برائیاں کی ہیں۔ اس لیے برائیوں کا حساب کتاب برابر سمجھا جائے۔ اور اس سلسلہ میں مزید حقیقات بند کر دی جائیں۔ اگرچہ مجھ تک بھگت میں نے نسبت گہریاں کی ہیں۔ میرے گھر میں کچھ فرسچو ہے، کچھ برتن ہیں، کچھ کپڑے ہیں جنہیں میرے گھر سے ہمیں میں تقسیم کر دیں یا نہ کریں ایک ایک گھر کی ادرا ایک ایک ساہیٹ پر ایک دوسرے گھسنے توڑیں یا نہ توڑیں، کچھ اس سے کوئی دل چسپی نہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ یہ سب چیزیں مائے ہیں۔ محاسن بھی گھٹنا ہیں۔ اس لیے؟

اس کے علاوہ میرے پاس کچھ کتابیں ہیں۔ ان میں اکثر ہانگے کی ہیں۔ کچھ جڑاں ہرن میں، کبھی لا بھریری کو دان کو دی جائیں۔ کچھ خلوطا ہیں، جن میں کچھ ان دوستوں کے ہیں،

جو انھوں نے دشمن بننے سے پہلے لکھے تھے، پھر رشتے داروں کے ہیں، جو زندگی میں بھی بے صغیٰ تھے اور مرے کے بعد بھی بے صغیٰ ہوں گے اور کچھ خطوط وہ ہیں جو میری بیوی نے مجھے لکھے تھے، دنیا کے ہر انسان کے پاس کم یا زیادہ ایسے پیغم پر ضرور ہوتے ہیں، لیکن میری بیوی بہت ایک شادی شدہ معززہ خاتون ہیں اس لیے میری وارثان خطوط سے بیک میل کرنے کی کوشش ضرور کریں گے لیکن موت سے ایک دن پہلے میں ان محبت ناموں کو تلف کرنے دوں گا۔ میں اپنی بیوی کو بھی وصیت کروں گا کہ اگر اس کے پاس بھی میرے کچھ خطوط ہوں تو انھیں تلف کر دے۔ رُسا ہونے یا کرنے کا کیا فائدہ۔ رُسا ہی صرف زندہ انسانوں کے لیے مناسب ہے :

اپنا وصیت نامہ ختم کرنے سے پہلے میں اپنے وارثوں کو ایک ضروری اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ مجھے ایک جیوشی پنڈت دکھو برویاں شامسری نے کہا تھا کہ میری موت کسی اونچی جگہ سے گرنے سے ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میرے وارثوں کو چاہیے کہ اس جیوشی کو بھڑکرا کر اسے کسی اونچی جگہ سے گلا دیں، تاکہ اس کا جیوش پن گریب حق میں صحیح ثابت نہ ہو تو اس کے حق میں ہی صحیح ثابت ہو جائے !!

عالم بالاپر

جب میرا انتقال ہو گیا اور شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہی، سچی کراس عظیم المرتبت ڈاکٹر نے بھی تصدیق کر دی جس نے امتحان کے فوراً بعد اپنی فیس مانگ لی تھی تو میری موت پر تمام اعدا اور اقربا روتے و رونے میں مصروف ہو گئے۔ چنانچہ اس مصروفیت سے فائدہ اٹھ کر میں نے نفس منصری سے پرواز کی اور گھر کی کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے راستہ باہر نکل گیا۔

باہر گشتا ٹوپ اندر میرا تھا۔ اگرچہ تھکے پوری آب و تاب سے جل رہے تھے لیکن اس کے باوجود کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے آنکھیں مل مل کر دیکھنا چاہی لیکن آنکھیں غائب تھیں اور میں اپنی بیٹک بھی گھر چھڑا رہا تھا۔ اللہ! میری آنکھیں کہاں گئیں۔ اور اگر آنکھیں نہیں ہیں تو یہ ہر تھکے تھکے کیوں دکھائی دے رہے ہیں۔ میں خوف زدہ ہو کر رو گیا۔ مجھ یوں لگا جیسے یا تو میرے پاؤں نہیں ہیں یا دھڑکی غائب ہو گئی ہے۔ میں نے گھبرا کر ہاتھوں کو پھرا، ہاتھ بھی نہیں تھے۔ میں نے سامنے فیکٹری ایریا کی طرف دیکھا، پورا ایریا غائب تھا۔ منہ موڑ کر اپنے گھر کی طرف دیکھا گھر بھی غائب! یا ابھی! یہ سب چیزیں کہاں گئیں؟ کیا یہ سب چیزیں مر گئیں؟ کیا میرے ساتھ ہی سب فنا ہو گئے؟ کیا جب ایک انسان مرنے والا ہے تو اس کے ساتھ ساری کائنات مر جاتی ہے۔ ساری سڑکیں مر جاتی ہیں۔ سارے مکان مر جاتے ہیں۔ سارا سڑک ٹک مر جاتا ہے؟

”اچھا ایک شمسوزمیز قہقہہ سنائی دیا۔ لیکن اگر میرے کان نہیں ہیں تو میں کس چیز سے رہا ہوں؟ سوچا کیے رہا ہوں اور چل کیے رہا ہوں؟ حواس غصہ کی یہ شرارت بڑی حیرت انگیز تھی۔“

دکتر جون مورس:

میں نے فقیر ہے خطاب کیا۔

اور یہ قوتِ ناحقہ کہاں سے آگئی ہے،

لتنے میں ایک نرم و ملازک ہاتھ نے مجھے اٹھا لیا اور مجھے لے کر فواریں میں اُڑنے لگا۔

میں نے عرض کیا۔

“مجلسه”

تجارتی طور پر

درستی آواز میں خواب آیا۔

مکون بر ۵۵۰۰

المعنى

1997

میں نے اسے

”تو بېركون موشو بھا، دُرغا، مالتی، رام پیاری.....“

”میں ان سب کا کچھ نہیں ہوں۔ یعنی ان میں سے کسی کے ہونٹ کسی کی آنکھیں کسی کے

اتھ کسی کے گیسو..... قہ قہ قہ تب مکمل محبوبہ قہقہاری تشاؤں کا مکمل ٹکس.....

”تم دنیا میں کیوں نہیں ملیں؟“ میں نے نئی قسم کا ڈائجسٹ بول کر ڈانٹک بننے کی کوشش کی۔

”کیونکہ دنیا میں تم صرف مسرت و اب و بخت تھے اور حقیقت سے لرزتے تھے، مگر

4. 333312222

میں قدرے ناموس ہوا۔

اس سے پوچھا۔

”اب تم مجھے کدھرے جا رہی ہو؟“

”تشنہ تناؤں کے پردوں پر سوار کر کے محبت تھیں اٹھائے لیے جا رہی ہے اس قوت اعلیٰ کے حضور میں جو تمام تر تشکیلات کی خالق ہے۔“

”میری محبوبہ تو ظالم سفر بھی ہے۔ چن مکر کر سوچا۔

مجھے اس کا فقرہ یوں لگا جیسے اس نے کسی کتاب میں سے رٹے رکھا ہے۔
مجھے شک۔ ہوا کہ میری محبوبہ چودہویں صدی کے فقروں کے چرائی ہے۔
یہ سوچ کر مجھے وہ شاعر حضرت نادر دولت آبادی یاد آ گیا جو اپنی منزل
شا کر ہمیشہ سب کرتا تھا،

”صاحبان ! یہ تو اوروں ہے، سرقہ نہیں ہے، دونوں

میں بڑا فرق ہوتا ہے!“

(اس کی تمام غزلوں کو ارد کا مشکار ہو گئی تھیں۔)

نہ جانے محبہ نے میرے دل کی بات بھانپ لی یا کیا ہوا کہ اچانک
اس نے مجھے کے ساتھ اپنا ہاتھ چھوڑ دیا اور میں جیسے کچھ و تنہا فضا میں جھولنے
لگا اور پھر جیسے ایک گہرا نیلا بادل میری گردن سے پٹ گیا۔ بالکل ایک رستی
کی طرح۔ اور مجھے یوں... محسوس ہوا کہ وہ مجھے یوں اوپر ہی اور پر کیچنے لگا ہے،
جیسے کنوئیاں سے پانی کی گڑوی کھینچتے ہیں۔

میں بیٹھا۔

”اے ظالم ! میرا دم گھٹ جائے گا۔“

بادل نے بڑے خاعرانہ لہجے میں کہا،

”گھراؤ نہیں۔“

دم ہوا کی موت ہے دم کے سوا کچھ بھی نہیں

مصرع سن کر میں نے داد کے بے تالی بھائی چاہی۔ لیکن جیسے قریب

سے کسی نے کہا

”ہش! یہاں تصنع ممنوع ہے، خواہ غواہ اپنی سزا میں کیوں اضااف کرتے ہو؟“

میں نے آواز کی طرف دیکھا

”آپ کا اسم شریف؟“

”رام پنساری“

میں اُسے پہچان گیا۔

میرا نام پنساری ہدی اور کالی سرچوں کا تھوک سوداگر تھا اور اُن میں ملاوٹ کیا کرتا تھا، اس کی گردن میں بھی بادل کا رشتہ بندھا تھا، پھر میں نے دور تک غور سے دیکھا تو بہت سے بادلوں کی بہت سی رہاں بہت سے انسانوں کے گلے میں بندھی ہوئی تھیں۔

”ہوں! تو سب حضرات انتقال فرما کر جا رہے ہیں۔

میں نے اُن میں سے کئی لوگوں کو پہچان لیا۔

بیس دوسرے دیکھیں تھا جس کی چار جوان بیٹیاں جہنم نہ ہونے کی وجہ سے کنوار ہی تھیں۔ کئی تھیں۔ گورنام ڈرائیور جس نے آٹھ آنے کی خاطر ایک دوسرے ڈرائیور کے پھسرا گھونپ دیا تھا۔ حیدر بخش کہاڑیا جو گورنمنٹ پور پیو کی دونوں سے دھوکا کیا کرتا تھا۔

کئی انتقال یافتہ حضرات ایسے بھی تھے جنہیں میں پہچان نہ سکا۔ کئی فرانس یا برطانیہ کے اطراف کے ملام ہوتے تھے، جنہوں نے بچے دیکھتے ہی نسلِ تعویب سے اپنا منہ موڑ لیا۔

(خدا کے سامنے جا کر ان کی شکایت ضرور کروں گا۔)

کچھ دیر اُڑتے رہنے کے بعد اچانک ایک دھماکا سا ہوا جیسے ہزاروں

سراپک ساتھ کسی چپت سے جا کرائے ہوں، اور پھر جیسے ہزاروں سوراخوں کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی اور ہزاروں اور خون پھنے لگے اور حادثہ کے ہزاروں گھنٹے گھنٹا اُٹھے!

مجھے شک ہوا کہ یہ شاید دنیا کے عظیم ترین طنز نگار فنکار تو نسوی کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میرا دل فردوسِ سر سے دھڑکنے لگا، کیوں کہ خدا کے ساتھ قربت کا لمحہ نزدیک آ رہا تھا۔ میں خدا سے دو چار ڈیڑھ گھنٹے باقی کرنا چاہتا تھا اور پانچویں دنیا کا اڈسبرجے کی حقیقی وجہ تسمیہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔

اُس وقت میں روئی کے ایک ٹکے پھلکے کائے کی طرح اڑ رہا تھا۔ فضا میں ہزاروں کائے میری طرح ٹھٹھے پھر رہے تھے۔ یوں تھا تھا جیسے بہت سے رفیوجی اپنے گھراؤں سے الگ ہو کر اپنے گیم کے فارم لائنوں میں لیے گھوم رہے ہوں، رفیوجیوں کے ساتھ یوں جھکتا ہے بڑا لگا۔ کیونکہ اس سے میری انفرادیت خطرے میں پڑ رہی تھی۔ چنانچہ میں نے زور سے پکارا۔

”اے خدا تو کہاں ہے؟“

ہزاروں آوازیں ایک ساتھ گنبد کی آواز کی طرح گونجیں۔

”اے خدا تو کہاں ہے؟“

میں نے کہا۔

”بٹیا تو نسوی! یہاں تو انفرادیت قائم رکھنا انتہائی مشکل نظر آتا ہے۔“ وہ بڑا

دوبارہ خدا کو پکارنے کا حوصلہ نہ ہڑا۔

میں نہیں جانتا، میں کتنے ہزار برس اسی طرح خلا میں بھٹتا رہا کیوں کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ عالم بالا کا ایک منٹ ہماری زمین کے سینکڑوں برسوں کے برابر ہے۔ وہاں وقت اتنا دیرسا چلتا ہے کہ پورا سنیہ صد آدھے منٹ میں ختم ہو سکتا ہے وقت کی یہ کاہلی مجھے غصے پسند آئی۔ بہر کیف بالا خسروہ وہ تانیہ آگیا جب ایک فرشتہ نے مجھے اپنی تنگنیا پر چڑھایا اور خلا کے بسیط دہالہ کے ایک دروازہ میں داخل کر دیا۔

دردِ ازم کے اندر ایک میز پر ایک کلرک ایک بہت بڑا حشر کھولے بیٹھا تھا۔
مجھے دیکھتے ہی بولا۔

”کون ہو کہاں سے آئے ہو؟ اپنا نام اور پتہ لکھو اور“
میں نے تڑپ کر کہا۔

”کیا مطلب؟ آپ مجھے نہیں جانتے؟ مجھے تو سارا ہندوستان جانتا ہے
میرا نام فکر تو فوسی ہے!“

کون سی مخلوق سے تعلق رکھتے ہو؟“ مجھ سے دوسرا سوال کیا گیا۔

”رائیٹر رائٹر۔ میرا مطلب ہے ادیب ہوں لیکچرر، طنز نگار
کلرک نے سر کھمایا۔ بے چارہ کوئی ان پڑھ ہو گا۔ رائیٹر کے معنی بھی نہیں جانتا
تھا۔ اس کے سامنے کلرک نے مجھ سے کہا۔

”دیکھو گھبراؤ نہیں۔ اپنا صحیح صحیح پتہ لکھو اور۔ تاکہ تمہارے لئے سزا و جزا کا فیصلہ
کرنا آسان ہو جائے۔“

میں نے جل بھن کر کہا۔ ”تو لکھیے۔ مکان نمبر سی، اکبریا ون موٹی سٹریٹ شہر دہلی
ملک ہندوستان۔“

”یہ ہندوستان کیسے؟ کون سے سارے میں ہے؟“

”آپ ہندوستان کو بھی نہیں جانتے؟ اتنی بڑی عظیم سنسکرتی کا ملک! اور آپ
پر جھٹتے ہیں۔ ہندوستان کیسے۔ سخت افسوس آتا ہے آپ کی نامکمل معلومات
پر اور اے صاحب! ہندوستان وہ ہے جہاں کشید کا میلہ لگتا ہے۔ جہاں پیلی کی پروجا
ہوتی ہے۔ جہاں گائے اور مسجد پر شاد ہرتے ہیں۔

سب کلرک جو فرشتے سے معلوم ہرتے تھے ایک دوسرے کا منہ نکلنے لگے۔ جیسے

کہہ رہے ہوں۔

”ہو پ لیں کیس ہے؟“

میرا اپنا کھلا بھی غرظ علم سے بھرا۔ کہیں کہ میرا تو خیال تھا کہ میری موت جس پر

سارا ہندوستان آئندہ بارہم تھا۔ اس کی اطلاع یہاں پہنچ گئی ہوگی۔ لیکن یہاں
فکر تو نسوی تو ایک طرف ہندوستان تک کو کوئی نہیں جانتا تھا اور اوہر سہارے
ہندوستانی تھے کہ دن رات خدا کے گن گنا تے تھے۔ چرنک خدا کا نام لے کر نقب
لگانے لگے تھے۔ یہاں خدا کے رحیم میں ہندوستان کے چوروں کا خانہ ہی غائب تھا۔
تھلا کر میں نے کلرک سے کہا۔

”دیکھئے صاحب آپ مجھے خدا سے ملا دیجئے۔ وہ مجھے آپ سے زیادہ بہتر
جانتے ہیں۔

”ذیری سوری!“ ایک فرشتہ نے کہا۔ ”وصال خدا صرف تیرا نوے جنم کے
بعد ہی ممکن ہے۔ آپ صرف یہ بتا دیجئے کہ آپ کون سے سیارے سے آئے ہیں؟
”زمین کے سیارے سے۔“

”زمین کا ستیہ کہاں واقع ہے؟“
فکر تو نسوی۔ دہلی۔ ہندوستان۔۔۔۔ اور اب یہ زمین کے سیارے کو بھی
نہیں جانتے۔۔۔۔ میں نے طنز آگیا۔

”حضرات! آپ کا جغرافیہ بہت کمزور ہے۔ ارے صاحب زمین وہ سیارہ
ہے جو چاند کے قریب واقع ہے۔ چاند یعنی چنداماں، جہاں ایک بڑھیا بیٹھ کر چرخہ کاٹا
کرتی ہے۔ جہاں پچھلے دنوں ہم نے ایک راکٹ بھیجا تھا۔
لفظ چرخہ جس پر ہماری پوری تحریک آزادی استوار کی گئی تھی بے کار رہ گیا
ایک بوڑھے فرشتے نے ملائمت سے کیا۔

”دیکھئے، آپ ذرا ہماری عیویں کا احساس کیجئے۔ خدائے بلند و برتر کی کاؤنا
بہت وسیع ہے۔ اس میں لاکھوں سیارے، لاکھوں چاند اور لاکھوں سورج
ہیں۔ اس لئے ناراض نہ ہو جائے اور ذرا رکے۔۔۔“

یہ کہاس نے ایک اور جیٹرا اٹھایا۔ تھوڑی سی مدد گردانی کی اور آخر ایک
نصفے سے خانے پر اونگلی رکھ کر بولا۔

”مل گیا! یہ صاحبِ دراصل زمین کے اس حقیقی تیار سے تشریف لائے ہیں جہاں انسان نامی مخلوق بستی ہے۔

انسان کے نام پر سب فرشتوں نے منہ بنالیا۔

بہذا اس کیس کو.....“ بوٹھے فرشتے نے بات جاری رکھی۔ ”آپ پسماندہ سیاروں کے سیکشن میں بھیج دیجئے۔“

اور پھر جب شفاف سافرشتہ مجھے پورا سنی جھنگلیا پر چپکا کر پسماندہ سیاروں کے سیکشن میں چھوڑ گیا تو میری جان میں جان آئی کہ کیونکہ یہاں میرا جانا پہچانا ماحول تھا۔ وہی غلاطیت، وہی ظلمت، وہی تنگی، وہی گھٹن جو میری پیاری زمین کے ساتھ مخصوص تھی، مجھے یہاں مل گئی اور میری روح موتیے کے پھول کی طرح کھل اٹھی۔ پسماندہ سیاروں کے سیکشن میں ان گنت کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ ٹرانسپورٹ سرورس کے فرشتہ نے مجھے عین اس کھڑکی کے پاس اتار دیا جس پر لکھا تھا۔

”اہل زمین کا دفتر اعمال!“

دفتر کے باہر انسان اور دوسرے حشرات الارض کا ایک جھوم تھا۔ جو مکھیوں کی طرح بھینٹنا رہا تھا۔ کوئی ڈسپلن نہیں تھا۔ کوئی کیو نہیں تھا۔ ایک بے ہنگم شور تھا، جیسے ہمارے یہاں کی کچیلوں یا انڈیو دفتر کے سامنے دوکری کے خواہشمندوں کا ہوتا ہے۔ اور ایک دوسرے کو دھکے مارا کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ہر شخص سب سے پہلے کھڑکی پر پہنچنے کا خواہش مند تھا۔ کچھ رو رہے تھے کچھ گارے تھے۔ کچھ ایک دوسرے کو قری اسٹائل مٹکا بازی سے لہو لہان کر رہے تھے۔ ان میں مختلف قوموں، ملکوں اور تہذیبوں کے افراد تھے۔ زرد، سرخ سفید اور سیاہ رنگ کے افراد اور وہ بھی ایک دوسرے کی انگلیاں توڑ رہے تھے۔ اور ہر انگلی ٹوٹنے پر انشا کبر اور بے شیعہ شیعہ کی قسم کے خدا پرستانہ نعرے لگاتے تھے اور قومی ترانے گانے تھے اور فتح کی خوشی میں بندوں کی طرح کودتے تھے۔

کچھ دیر تک تو مجھے اپنی نسل کی مخلوق میں رہ کر طبع آتا رہا۔ لیکن ایک مرتبہ

جب ایک ہاتھ نے مجھے خوا مخواہ مجھے سونڈ سے اٹھا کر اچھال پھینکا تو سارا مزا
بکر کرا ہو گیا۔

میں نے ہاتھ کی مذکور سے کہا۔

”حضرت! یہ غیر مہذبانہ حرکت کس سلسلہ میں ہے؟“

لیکن وہ چونکہ ایک کلاسکیکل سنگیت گانے والے کا کار کو سونڈ پر اچھالنے
میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس لئے میری بات کا جواب نہ دے سکا اور میں جو اتہال
کے بعد نہ جانے کیسے کیسے بلند خیالات اور احساسات لے کر یہاں آیا تھا یکدم احساس
ہو گیا۔ خدا سے ملاقات کی امیدیں تو پہلے ہی خاک میں مل چکی تھیں۔ اور اب اگر
کوئی احساس باقی رہ گیا تھا تو صرف اپنی بے مائیگی کا، اپنی بے بسی کا اور اس
فیصلہ کا جو میرے مستقبل کے بارے میں نہ جاننے تک پہنچا دالا تھا۔

بالآخر ہمت کر کے میں بھی انسان بن گیا۔ دھکم پیل شروع کر دی۔ اور کسی نہ
کسی طرح گھر کی گے پاس پہنچ گیا۔ اور کلرک فرشتہ کو جو ہمارے سڈل میکر ٹریٹ
کے کلرک کی طرح بے حد تھکا ماندہ اور پریشان خاطر نظر آ رہا تھا اپنا نام اور پتہ بتا کر
غرض بن گیا۔

”جناب! براہ کرم ذرا میرے اعمال کی فائل ملاحظہ کیجئے۔ اور بتائیے کہ میری
آئندہ پوزیشن کیا ہے؟“

کلرک فرشتہ نے بادل تاخراستہ فائل کھولی۔ اسے اٹھا لیا۔ اور ایک پسلی مسکرا
کے ساتھ بولا۔

”کیا یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری ماں تمہیں سر کھٹے ہوئے ٹکیٹے ایاں کرکھلا کر کرتی تھی؟“
”بجا فرماتے ہیں آپ!“

”کیا یہ بھیج ہے کہ تم اتنا نون کی اخلاقی غمراہوں اور نوبل حرکات سے بہت دکھی
رہتے تھے؟“

”یہ مجھے ہے جناب!“

”اور کیا یہی صحیح ہے کہ تم نے عمر بھر اپنی تحریروں سے نوع انسانی کی بہبودی کے لئے کوشش کی“

فرشتے نے ایسے ہی متعدد سوالات کئے۔ جن کا جواب مجھے مجبوراً اثبات میں دینا پڑا۔ کیونکہ جھوٹ بولنے پر سزا بڑھ جانے کا خطرہ تھا۔ اگرچہ صرف سچ بولنے کے نقطہ نگاہ سے میں نے فرشتہ مذکور کو یہ بھی بتا دیا کہ میں نے اپنی بے وقوفیوں کے یا عیث کئی احباب کو جلی گئی بھی سنائی۔ ایک بار بیوی کو بھی زود کو بکھا تھا۔ کئی بار اقتصاد کی تنگ دامن کے کارن جھوٹ بھی بولے تھے۔ اور وہ چار مرتبہ کچھ انسانوں سے دھوکا بھی کیا تھا۔

بالآخر فائل پر میرے دستخط کرانے کے بعد فرشتہ کلرک نے کہا۔

”تمہارے بارے میں حکم اپنی یہ ہوا ہے کہ تمہیں ایک بار پھر زمین پر واپس بھیجا جائے۔“

”کس جرم میں؟“

”میں نے پوچھا۔“

”کیونکہ تم ایک بھلے انسان ہو۔“

”کو کیا بھلا ہوتا جرم ہے؟“ میں تملایا۔ ”میں دوبارہ زمین پر نہیں جانا چاہتا تھا“

”مجھے جہنم میں بھیج دو۔“

”تم حکم اپنی سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے۔ زمین کے سارے کو تہا رہی بڑی ضرورت ہے۔“

”میں نہیں جاؤں گا!“

”میں نے پاؤں ٹپک کر کہا۔“

”تمہیں جانا ہی پڑے گا!“

فرشتہ نے گرج کر کہا۔

”میں نہیں جاؤں گا!“ — ”نہیں جاؤں گا!“ — ”میرا لہجہ تیز ہو گیا —“

”مجھے خدا سے ملا دو۔ میں خدا سے ڈار کر کٹ بات کروں گا۔ کہاں ہے خدا؟“

میرے اتنا کہتے ہی ایک ساتھ بہت سے قہقہے گونج اٹھے۔ اور پھر۔

”کہاں ہے خدا؟“

”کہاں ہے خدا؟“

کی کرداروں آوازیں آنے لگیں۔ اور پھر سارا ماحول گھومنے لگا۔ ہزاروں گھنٹے
 شناٹا اٹھے۔ اور خدائے عظیم کی حمد و ثناء میں کروڑوں نغمے ایک ساتھ گائے جانے
 لگے۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے جھینگلیا پر اٹھا کر زور زور سے
 گھمایا اور پھر اچھال دیا۔ اور میں لڑھکیاں سی کھا کھا کر گرنے لگا۔
 شچے۔

اور شچے۔

اور شچے۔

اور پھر ایک دم سکون سا چھا گیا۔ ایک عجیب پر اسرار طمانیت سی پھیل گئی
 (ایک خاموشی، شانتی اور تسکین۔ !)

جلیبے سمندر کا نہر میں کوئی ڈوڑھ جا کر بیٹھ جائے۔

اور پھر میں نے سنا۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا

”اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ مریضیں بچ جائے گا!“

خدا کی جنت

اور بیروں ہوا کہ میں جنت کے دروازے پر پہنچ گیا۔

مذہب نے وہ کون تھا، ہنر ور کرئی فرشتہ ہی ہو گا، جس نے مجھے جھٹکی پر اٹھالیا اور جیسے ہزاروں میل کا سفر ایک ثانیے میں طے کر کے مجھے یہاں چھوڑ گیا وہ اتنی عید کی میں تھا کہ میں اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔

دروازے کے باہر خدا کی درمی پہنے ایک مریں سا فرشتہ اسٹول پر بیٹھا سات نمبر کی بیڑی پی رہا تھا۔ میں نے اپنا شبہ دور کرنے کے لئے اس سے پوچھا ”جناب عالی! جہاں میں کھڑا ہوں کیا یہ جنت کا دروازہ ہے؟“

جہاں فرشتے نے میری طرف دو دلی چار قسم کی نگاہ سے دیکھا۔ جیسے کہنا چاہتا ہو، مگر میں بتا دوں تو تم اس اطلاع کے کتنے پیسے دو گے! — لیکن میری پسینہ پر حالت دیکھ کر وہ شاید مایوس ہو گیا۔ اور جیسے وہ کوئی ذمے داری لینے کو تیار نہ ہو، کہنے لگا؟ ”کون ہو تم؟“

”تو تو نسوی ہوں، کیا تم مجھے نہیں جانتے، ادبی رسائل نہیں پڑھا کرتے؟“ ادبی رسائل اور تو نسوی شاید اس کے لئے ناقابلِ فہم چیزیں تھیں، ہاتھ کے ایک جھٹکے سے جیسے اس نے ”شش اپ“ کہا اور بولا: ”ادب شرب کو چھوڑ کام کیا کرتے ہو؟“

پہلے شاعری کرتا تھا، اب

اسے جیسے کلیو (CLEW) ہاتھ آگیا، چیٹ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔
 ”شاعر ہو؟ تو پھر یہاں کیوں آگئے، یہاں سے یاں برابر فاصلے پر جہنم ہے، ابھی شاعر
 وہاں جاتے ہیں۔“

میں نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا۔ ”قبلہ! مگر میں شاعری جھوڑ چکا
 ہوں۔ اس نے جنت“

فرک شاعری کے علاوہ کوئی اور کوالٹی؟

”ایک تشنہ لب بیکاری کہ اپنا آخری سگریٹ دے دیا تھا۔ حالانکہ میں اسے
 خود پینا چاہتا تھا۔“

اس نے ایک ادبی بیڑی نکال کر سلگائی (مجھے آفر نہیں کی) اور اس سے
 پہلے کہ کوئی اور امتحانہ سوال کرتا کشاکش سے جنت کے پٹ کھلے اور اندر سے
 جیسے ہزاروں لاکھوں فرشتے ایک دم پکار اٹھے۔

اور دوسرے لمحے میں جنت کے اندر تھا

حیرت ہوئی کہ خدا کیسی چھوٹی، چھوٹی ڈانٹوں پر جنت عطا کر دیتا ہے، ابھکار
 کو سگریٹ دے دو، ننگے کو لنگہ، پنا دو، اندھے کو شرک پار کرادو — تو پھر
 لوگ جنت کے حصول کے لئے بڑے بڑے مندوسراٹھیں اور دھرمشالے کیوں بناتے
 ہیں؟ شاید خدا کو دھوکا دیتے ہیں۔ شاید خدا سے دھوکا کھاتے ہیں۔

جنت میں قدم رکھتے ہی مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ یہاں میری مادی اماں
 ضرور موجود ہوں گی۔ کیونکہ جب اس کا جنازہ اٹھا تھا تو سارے محلے نے دعا
 مانگی تھی کہ اسے خدا مرحومہ کو جنت میں جگہ دینا — اور کہتے ہیں، خدا اسے
 عامہ کا بہت احترام کرتا ہے۔

میرے دائیں پہلو میں دودھ کی ایک تہر بہہ رہی تھی اور ایک شخص جس
 کی مونچھیں کس مشہور انگریزی کی سی تھیں، اس تہر میں پانی کے ٹکڑے ڈال

رہا تھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا اور پوچھا: ”مکائی صاحب! کیا آپ نے اس جنت میں میری دادی پر بھادلیوی کو رکھ لیا ہے؟“
 اور جیسے نو وارد سے سبھی مذاق کرنے کے شوقین ہوتے ہیں، بولا ”کوئی پر بھادلیوی؟ یہاں تو ہر تفسیری عورت کا نام پر بھادلیوی ہے۔“
 میں نے دادی کا حلیہ بیان کیا اور کہا: ”مرحومہ کے پاس دنیا میں ایک گائے تھی، جس کا دودھ بیچ کر وہ گذر بسر کرتی تھی۔“
 ”کیا دودھ میں پانی بھی ملائی تھی؟“

”اوں ہوں! وہ ایمان اور عفت سے روزی کمائی تھی!“

شخص مذکور نے ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا: ”ایمان اور عفت؟ قہقہہ تو پھر جنت میں اس کا کیا کام؟ بال برابر قاصدے پر چہنہ ہے، اولم جا کر معلوم کرو۔“
 اور یہ کہہ کر اس جنت مکانی نے زور سے ہانک لگائی۔ دودھ لے لو دودھ لگاؤ کا خالص دودھ جنت میں ٹھیٹھ کیا ہوا۔“

کتنا بڑا جھوٹ بول رہا ہے شخص۔ ملاوٹی دودھ کو بھی خالص کہے جا رہا ہے اس نے میری دادی کے متعلق بھی جھوٹ بولا ہو گا۔ وہ ضرور جنت میں ہو گی۔ میں نے اس کی ہانک سے بچنے کے لئے کانوں میں انگلیاں دے ڈالیں اور تیزی سے آگے چل دیا۔

جنت کا ماحول انتہائی دل فریب و حسین تھا۔ ساری جنت ایر کنڈیشنڈ ہو رہی تھی۔ دودھ اور شہد کی نہریں تو ریں عام تھیں جیسے کسی امیر زاوے کی الماری میں رنگارنگ کی نکٹیاں لٹک رہی ہوں۔ چاروں طرف نرم اور سرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔ جیسے کنواری کنواری حسینائی، پتوں میں سے پھوٹ پھوٹ کر باہر آگئی ہوں۔ پیڑوں پر طرح طرح کے پھل، دیہات دھنیزاؤں کی طرح جیسے جھولنا جھول رہے تھے۔ اور ٹیلگوں اور سنہری پہاڑیوں کے عقب سے ایک مسخر کن مسخری نغمہ، ہر ابراہیم بکر کر رہا تھا۔

ماحول کے اس طلسم میں جیسے میں گھلتا جا رہا تھا۔ اگر یہ خراب نہیں تھا تو جنت
حق جنت نہیں تھی تو خدا تعالیٰ پر کھٹے دلوں میں سے جو بھی کیفیت تھی، اولادینا اور نسل حق میں
نے اپنے آپ سے کہا: "بٹیا فکر تو نسوی! بڑے خوش نصیب ہو۔ دنیا میں تم ایک
سنگترا خریدتے ہوئے گھبراتے تھے کہ تمہارے افلاس اور سنگترے میں عددیوں
کا فاصلہ تھا۔ لیکن یہاں صرف بعد کا وہی کو ایک سنگرٹ دینے کے بدلے میں بتیں بھلوں
کے باغ مل گئے۔ جنت میں افلاس کی نہیں، اگر دار کی عزت ہوتی ہے۔"

لیکن جنت میں گھومتے گھومتے مجھے ایک اجنبی ہر اکہ یہاں کی آبادی بہت
قلیل تھی کہیں کہیں کوئی اکا دکا آدمی نظر آ جاتا۔ نعمتیں زیادہ تھیں۔ انسان کم تھے
دجیا اور جنت میں یہ فرق تھا کہ وہاں نعمتوں کی اور یہاں انسانوں کی فیصل پلاننگ
ہو چکی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ جنت میں صرف خوش نصیب آتے ہیں اور خوش نصیبوں
کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ لیکن میں نے سوچا، اگر یہاں خچہ بد نصیبوں کو بھی بے ادیا
جاتا۔ تو ذرا درائی رستی۔ درمیان سنان جنت میں کوئی کب رہ سکتا ہے؟
گھومتے گھومتے ایک شجر سایہ دار کے قریب آ کر رک گیا۔ جس کے نیچے ایک
حسین چمیل سڈول بدن کی تنگ عورت کھڑی تھی اور ایک بے نڈا سا آدمی اس حسین
بدن کو اپنی زبان سے چاٹ رہا تھا میں نے اس سے پوچھا!

عبائی صاحب! کیا

عبائی صاحب نے جیسے ہم کر کہا: "یہ حور میری ہے تمہاری نہیں ہے۔"

مگر تم اسے چاٹ کیوں رہے ہو؟

"اس کے بدن سے شہد کی طرح شیریں رس چمکتا ہے، اس شہد کو چاٹنے

سے ہی جنت کا مزا آتا ہے کیا تمہیں ابھی تک کوئی حور لاٹ نہیں کی گئی؟"

میں نے کہا: "نہیں، ابھی خدا سے میری ملاقات نہیں ہوئی، تم یہاں کب سے
آئے ہوئے ہو۔ تمہارا اسم ستر لیت؟"

"میں دھومی مل ہوں ..."

”میری جس کی ریڈیفیکیشن تھی اور جہاں نوجوان کنواریاں نئی نئی روپے روزانہ پر مزدوری کرتی تھیں۔“

”ہاں اور یہاں میری خدمت خلق تھی۔ میں ان غریب کنواریوں کو روزگار دلانا تھا اور ان کے کنوارے بدن چائنا کرتا تھا۔“

”ذلیل!“ میرے حلق میں یہ لفظ اٹک گیا، اور سوچا، یہ عورت بھی حور نہیں ہوگی، اسی ریڈیفیکیشن کی ملازمہ ہوگی۔ جسے خدائے جنت میں بلایا ہوگا۔ تاکہ بدن چڑانے کے کام آسکے! خدا کو جنت کے لئے بھی دنیا ہی سے حوریں میسر کرنا پڑتی ہیں۔ میں نے دل پر جبر کر کے شخص مذکور سے پوچھا، ”خدائے دلچسپ کا دفتر کہاں ہے؟ جہاں میں اپنی آمد کی روپ کر سکوں۔“

”میں نہیں جانتا۔“ وہ شخص رکھائی سے ہلا۔

ننگی حسینہ نے شاید کچھ بتانے کے لئے اپنا منہ کھولا۔ لیکن اس شخص نے جھوٹا اپنا منہ اس کے ہوشوں پر رکھ دیا اور شہید چائے لگا۔ شہید ٹپکاتے برتن سرگاہ بھر کر رہ گئے۔

جنت کے تقارے دیکھ دیکھ کر کبھی یقین آتا ہی جنت ہے، کبھی شک ہوتا یہ جہنم ہے، یقین اور عدم یقین کی اس کیفیت نے مجھے نڈھال کر دیا۔ ایک حور ایک تالاب میں نہاتے ہوئے کنارے پر کھڑے ایک بھینے کو ہلترنگ سا رنگ تھی، ایک درخت پر بہت سے کرنی ٹوٹ اُگے ہوئے تھے۔ بھین کچھ آدمی توڑتے اور حلق میں نکل جاتے۔ ایک جھوٹی سی سبز بھاڑی پر ایک سرخ و سپیدہ بچہ بیٹھا تھا۔ دھکی کے ایک ٹب میں کھجوریں ڈبوڑو کر رکھا رہا تھا۔

اور ان کی گھٹلیاں نیچے پھینک رہا تھا۔ نیچے اپنے منہ کھولے کچھ نازاں اور لاغر نیچے کھڑے تھے۔ جب بھی کوئی گھٹل کسی بچے کے منہ میں آگرتی، وہ نعرہ لگاتا، ”انقلاب زندہ باد“ — اور باقی بچے ہنساتے نہایت آواز میں بہتے، ”ہمارے

رے ہیں کچھ انقلاب زندہ باد!

میں نے ایک خاتواں بچے سے پوچھا: ”برخوردار جنت میں آکر بھی گٹھلیاں کھا رہے ہو اور محنتی کھجور کیوں نہیں کھاتے؟“

وہ بچہ حیرت سے میرا منہ تکتے لگا اور ایک دوسرے بچے سے بولا۔

”ذرا سنا یہ آدمی کیا کہتا ہے۔ اس کی بولی میری سمجھ میں نہیں آتی۔“
”کوئی مشرک ہو گا۔“ دوسرا بچہ بولا۔

”جنت کی بولی نہیں جانتا۔“ بشیرا بچہ کہنے لگا۔

”تو پھر جنت میں کیسے آگیا؟ چونٹھے نے فرمایا۔

اور پھر بھی بچے ایک ساتھ محمد پر ہنسنے لگے۔

ہاں میں کیسے آگیا؟ کیسے؟ — معصوم بچوں کا یہ سوال ایک غمضیل ہونے لگا۔
”میرے حلق میں پھنس گیا، اور میں ڈر گیا مجھے پتہ نہ چل جنت کی زبان سیکھنی چاہیے
اگر مجھے جنت میں رہنا ہے تو مجھے جنت کی سی آنکھیں چاہئیں، جنت کے سے
کال، جنت کی سی سوچ۔ جنت میں آکر اصل فکر تو سنوئی کو مر جانا ہو گا اور
جنت مکانی فکر تو سنوئی کو زندہ کرنا ہو گا۔“

پریشانی اور سراسیمگی میں ایک دم میری چیخ نکل گئی: ”اے خدا! اے
خدا! تو کہاں ہے؟“

پھر وہی ڈراؤنی خاموشی چھا گئی۔ برے بچے ہو فکر تو سنوئی! یہ جنت
ہے یا گنبد! یہاں تو ہر چیخ کا ترجمہ چیخ میں کیا جاتا ہے۔ ہر فریاد کا مذاق فریاد میں
اڑایا جاتا ہے۔ کسی دُکھی طرح یہاں سے نکلتا چاہئے۔ تم یہاں رہنے کے اہل
نہیں ہو۔

میں گھبراہٹ میں ایک طرف کو بھاگا۔ لیکن، ایک عجیب نظارہ نے
میرے پاؤں روک لئے۔ پھولوں کے ایک نرم دھاڑک بستر پر ایک بوڑھا آدمی
دراڑ تھا، اس کے چاروں طرف الزام و اقسام کے کھانے اور پھلوں کا دسترخوان

بچا ہوا تھا جنہیں کتے اور گیدڑا درجو ہے نوٹ فرما رہے تھے۔ مجھے گھن آگئی۔
 لیکن گھن کے باوجود جستجو مجھے اس بوڑھے کے پاس لے گئی اور میں نے کہا
 ”السلام علیکم“

اب اسے گھن آگئی منہ پھیر کر بولا: ”میں اسلام کا دشمن ہوں، اس لئے غڈ
 ایوانگ کہو“

میں نے فوراً اپنی مذہبی اصلاح کر ڈالی اور انگریزی میں پوچھا۔ دلیل!
 آپ خود گھانا کیوں متبادل نہیں فرماتا؟“
 ”میں جانوروں سے پیار کرتا ہوں۔“
 ”انسانوں سے نہیں کرتے؟“

شاید وہ خوش نہیں ہوا، اس نے ایک کتے کی طرف اشارہ کیا اور اشارہ
 پا کر وفادار کتا مجھ پر عبور کئے لگا کتے سے شہ پاکرامیک جو ہے نے میرے پاؤں پر کاٹ
 لیا اور اس سے پہلے کہ کوئی گیدڑ مجھ پر حملہ کرتا۔ میں ٹب ٹب بھاگ گیا۔ اور جانوروں
 کے قہقہے روز تک میرا پیچھا کرتے رہے۔ یہ قہقہے مجھے مانوس معلوم ہوئے۔ دنیا میں
 ایسے قہقہوں کے کوئی ٹیپ ریکارڈ نہیں ہے مجھے چاہئے تھے اور ویڈیو اسٹیشنوں سے
 عام منائے جاتے تھے۔

بھاگتے بھاگتے یوں لگا کہ جیسے ایک شفقت بھرا مہربان ہاتھ میرے کندھے
 پر آ پڑا ہے۔ میں نے دک کر دیکھا ایک حسین و جمیل نورانی چہرہ میرے سامنے تھا۔ میرے منہ
 سے بے اختیار نکلا: ”مجھ پر اس نے کتے چھوڑ دیے۔ اس نے غلط سمجھا میرا کوئی قصور
 نہیں حضور!“

نورانی چہرہ مسکرایا: ”غلط تم سمجھ۔ یہ بڑھا اپنی دولت کو اپنے احباب
 اور معاصروں میں تقسیم کرتا تھا۔ دولت کی اس تقسیم پر خدا اس سے خوش ہو گیا
 اور چند روز کے لیے اسے جنت عطا کر دی۔“

میں نے کہا: "یہ کیسا خدا ہے، جو دولت کی منصفانہ تقسیم کے اصول ہی نہیں جانتا۔" میں نے احتجاج کیا۔ جنت میں آنے کے بعد خدا کا خوف میرے دل سے نکل گیا تھا۔

فرانی ہاتھ میرے کندھے غریب تھپانے لگا۔ فکر تو تسری صاحب! خدا کی عظیم حکمت کو سمجھو کہ اس نے بڑھے کو جنت تو عطا کر دی، مگر بھوک چھین لی تم نے دیکھا نہیں نعمتوں کا ڈھیر اس کے سامنے تھا۔ مگر عامۃ الناس اسے گھما رہے تھے اور وہ خود کھانے سے محروم تھا۔ بھوک کا چھین جانا قہر الہی سے کم نہیں ہوتا۔

مگر فرشتے کا یہ فلسفہ مجھے مبہم نہ ہو سکا۔ یہ جنت کی فلاسفی تھی اس لئے میں خاموش ہو گیا۔ اور موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا: "اے مہربان! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں جنت میں ہوں یا جہنم میں؟"

"ابھی بتانا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی دائیں انگلی سے خلا میں ایک گول دائرہ سا بنایا، اور پھر جیسے دور ہزاروں میلوں سے آواز آئی اس دائرے میں داخل ہو کر ہمارے پاس آ جاؤ۔

کیا یہ خدا کی آواز تھی؟

میں خوش ہو کر ہلکے عتابارے کی طرح دائرے میں داخل ہو گیا۔ اور پھر یوں لگا۔ جیسے حرم دناؤں کا ہوا کے دھال سمندر میں تیرتا جارہا ہوں، میں کہاں جا رہا ہوں وہ فرشتہ کون تھا؟ دائرہ کیا تھا، وہ جنت کہاں گئی؟ کیا سچ منج میں خدا کے حضور میں جا رہا ہوں۔ کیا وہ بلائے والی آواز کوئی دھوکا تو نہیں تھی؟ میز میز پر کہاں ہے؟ جنت یا جہنم؟ یا یوں ہی صدیوں تک، قرون تک اس سمندر میں تیرتے رہنا۔

اپنے ہی سوالوں کے بھجور سے میں گھبرا گیا۔ اور ایک کربناک چیخ

نکل: "اے خضر راہ! اے خضر راہ میں کہاں ہوں؟"

جواب میں میرے پاؤں کے تلوگوں سے جیسے ایک قہقہہ سا نکلا اور یہ قہقہہ تنچے اترتا چلا گیا اور قہقہے کے ساتھ ہی میں اتر گیا یہاں تک کہ میرے پاؤں ریشم ایسی مٹی سے جا لگے۔ اس نرم مٹی کے لمس سے میرا تناؤ ایک دم ختم ہو گیا۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ اور میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے سامنے کھڑا ہوں۔ جو بیر بہتی ٹکی طرح لال بھبھوکا پھلوں سے لدا ہوا ہے۔ اور اس کے تنچے ایک عورت۔

اورانی گاڈ! یہ تو وہی عورت ہے جس کے خواب جنم جنم سے دیکھتا چلا آ رہے ہوں، بالکل وہی سراپا جس کا میں ہی خالق تھا جس کا ایک ایک انگ میں نے ہی تراشا تھا۔ لٹائی حسن کے جس روپ کو خدا نے اُدھورا چھوڑ دیا تھا اُسے میں نے ہی مکمل کیا تھا۔ اور میں اس مکمل روپ کو تخیل کی مادی سے نکال کر حقیقت بنانے کے لئے صدیوں سے کھینکتا پھرتا تھا۔ اور آج وہ مل گئی تھی بالکل وہی میرے سامنے، کا پنچ کی طرح بلوری چتون کا لباس پہنے میرے سامنے کھڑی تھی۔

میرا دل ایک دم اچھل کر حلق تک آ گیا۔

"یہی تمھاری جنت ہے لیٹ جاؤ۔" پیر پر سے ایک آواز آئی۔

میں نے پیر کے ادبہ نگاہ ڈالی ایک قوس قزح رنگ کا نہایت ہی خوبصورت ناگ اپنی زبان یا ہرنگائے محمد سے مخاطب تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک لال بھبھوکا پھل توڑ کر تنچے پھینک دیا۔

"تم کرن ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں خدا ہوں۔"

خدا؟۔ میرا سر غرور خدا کے سامنے جھک گیا۔ "مگر اے خدا! تیری شکل سانپ کی سی کیوں ہے؟

"کیونکہ میں شیطان بھی ہوں۔"

شیطان؟ بڑا کنفیوژن تھا۔ کیا خدا ہے جو شیطان بھی ہے؟ یہ کیا شیطان ہے جو خدا بھی ہے۔ میرا دماغ چکر لے لگا۔ جنت اور میے درمیان صرف ایک پھل کا فاصلہ تھا۔ میں کروں؟ کس کو خیر راہ بتاؤں ہر سٹے بڑی گنجشک ہو رہی تھی۔

بے تابیہ میں اس سراپا محبوبہ کی طرف بڑھا۔ ڈارنگ!

محبوبہ بھی بے تابیہ میری طرف بڑھی ”ڈیر!“

”ہم آغوش ممنوع ہے؟ بے وقوف!“ پتھر پر سے آواز آئی۔

اچانک لال بھبھوکا پھل زمین سے اڑ پڑا تھا۔ اور ہم دونوں کے ہونٹوں کے درمیان آکر رک گیا۔ اب دوپہا سے ہونٹوں کے درمیان صرف یہی پھل حائل تھا۔

”اس پھل کو کھا جاؤ!“

”اس پھل کو مت کھاؤ!“

”اس پھل کو کھا جاؤ!“

”اس پھل کو مت کھاؤ!“

دونوں سختی اور مثبت آواز میں مسلسل آئے لگیں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی۔ ایک دوسرے سے لڑتی ہوئی، بالکل دو متضاد جمکڑوں کی طرح دو ہیپ ہپ پھاڑوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکراتے لگیں۔ اور جوں جوں یہیپ جمکڑا تیز ہوتا گیا۔ میں اور میری محبوبہ مارے خوف کے ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے اور قریب اور قریب اور پھر لپ لگا۔ جیسے ہمارے درمیان اس پھل کا فاصلہ بھی مٹ گیا۔ وہ پھل بھی جیسے شیریں رس بن کر ہم دونوں کے ہونٹوں میں گھل گیا۔ اور پھر ہونٹ مل گئے۔ لال بھبھوکا ہونٹ گرم گرم، پیار سے بیکے ہونٹ اور ہم دونوں کے بدن لال بھبھوکا ہو گئے۔ اور عجب پراسرار نشیلہ لہروں کے جمکڑوں میں جمکڑے لگے۔ اور دور سے، جیسے کسی بے بس خدا کی آواز

آئی رہی۔ "یہ گناہ گار ہیں، انہیں جنت سے نکال دو۔"

اور بے بس خدا کی اسی آواز میں گھل مل کر آئی ہوئی بے بس شیطان کی آواز چھپتی رہی۔ "ہاں انہوں نے ثواب کمایا ہے، انہیں جنت سے نکال دو۔" اور پھر خدا اور شیطان جیسے ایک دوسرے میں گھومتے ہوئے ایک دوسرے کا تقابض کرنے لگے اور پھر ہر شے گھومنے لگی، پیر، نہر، جنت — اور ہزاروں لاکھوں گھنٹے ایک دم بچ اٹھے، اور جھکڑ چلتا رہا اور ہم جھٹکے کھاتے رہے۔ پھر، شعلے، انگارے ہمارے ارد گرد بے پناہ تک رقص کرنے لگے۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز ہم دونوں کو جدا نہ کر سکی۔ اور پھر جیسے کوئی نڈھال ہو جاوے ایسے ہی ہم ایک دھماکے ساتھ جیسے کروڑوں میل کی بلندی سے پتھر آگے — اور پھر ایک دم پیارا پیارا سکون سا چھا گیا۔

اور ہم نے اپنی سہمی ہوئی آنکھیں کھول دیں اور کیا دیکھا کہ میں پھر جنت کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ اور وہی فرشتہ اسٹولی پر بیٹھا بیڑی پی رہا ہے۔ اس نے میری طرف مسکرا کے دیکھا اور بولا "جنت سے ہوائے بکسی لگی؟" میں نے کہا "اچھی ہے۔ بالکل ہمارا دنیا ایسی — عشق وہاں بھی شجر

ممنوعہ ہے اور یہاں بھی۔"

وہ بڑے غمزے بولا "میں نے تمہیں کہا تھا؟ جنت اور جہنم میں صُرف بال برابر کا فرق ہوتا ہے۔"

قبر سے واپسی

اور پھر مرنے کے ایک سہفتہ بعد قبر میں میری آنکھ کھل گئی۔

مگر یہ ہوا کیسے؟ میرا تو باقاعدہ انتقال ہو گیا تھا۔ اگر انتقال نہیں ہوا تھا تو میری قبر کیسے بن گئی؟ ہو سکتا ہے کہ قبر کسی اور کے لئے کھودی گئی ہو اور موقع پا کر دفن مجھے کر دیا گیا ہو۔ مگر نہیں، سماج ابھی اتنا کرپٹ نہیں ہوا کہ دوسروں کی قبر پر قبضہ کر کے اسے خود لاش بن کر لیٹ جائے۔

تو کیا یہ ڈاکٹر کی غلطی تھی؟ مگر ڈاکٹر تو بڑا کوالیفائیڈ تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے جتنے زندوں کو قبرستان پہنچایا تھا، ان میں سے ایک بھی زندہ ہو کر نہیں لوٹا تھا۔ میں بڑا پریشان ہوا۔ کس سے نقد لین کرائی جائے کہ میںا مرجکا ہوں یا نہیں؟ چنانچہ میں نے قبر میں بیٹھ لیٹے آواز دی: ”کوئی ہے؟“

جواب میں جیسے گہند کی سی صدا آئی: ”کوئی ہے؟“

میں نے پوچھا، ”تم کون ہو؟ ڈاکٹر ڈنگا سنگھ ہو؟“

جواب آیا، ”نہیں، میں فکر تو نسوی ہوں۔“

تعب تک گھاڑ! میں نے سوچا، اپنی ہی جان پہچان کا بندہ مل گیا۔ یہ میرے ساتھ ہلک میل نہیں کرے گا چنانچہ میں نے پوچھا، ”تم کہاں تہلے؟“

”میں تمہارے اندر ہوں۔“

”اندرونی؟ مگر تم تو باہر نکل گئے تھے! انتقال کر گئے تھے! لوٹ کیوں آئے؟“
جواب میں کچھ سسکیاں سی مٹائی دیں، جیسے کوئی مادام ہو، بے حد چھتارہم
ہو۔ جیسے کوئی بچہ گھر سے جھگڑ کر نکل جائے اور دن بھر بھوکا پیاسا رہنے کے
بعد گھر لوٹ آئے اور دیوار سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگے۔
میں نے پوچھا ”روکیوں رہے ہو فکر تو نسوی؟ میں پوچھ رہا ہوں انتقال
کے بعد لوٹ کیوں آئے؟“

وہ بولا ”در اصل غلط فہمی سی ہو گئی تھی۔ یعنی انتقال میرا نہیں
ہوا تھا، تنہا رہا تھا۔ میں تو تنہا سی روح تھی۔ تنہا رہے جسم سے نجاست پاکر
بڑی خوشی ہوئی تھی کہ چلو اس بے ہودہ انسان سے بندھ نہ پڑا۔ اب کسی معقول
جسم میں جا کر کچھ دن عیش کروں گی۔ چنانچہ مفتہ بھر تک مختلف جسموں کے دروازے
کھٹ کھٹائی پھری۔ ایک بادشاہ کے گھر گئی، ایک رئیس کے گھر، ایک نواب
کے یہاں، ایک اسمگلر کے در دولت پر۔۔۔ یہاں تک ایک منٹہ کے مہنت
کے یہاں بھی گئی مگر کسی نے بھی دروازہ نہیں کھولا سب نے جواب دیا ”گو
بیگ! ہم یہاں اپنے گلے نہیں منڈھیں گے جہنم میں جاؤ۔“
میں سنیں دیا۔ ”تو اصل جانیں جہنم میں۔“

وہ بھی سنیں دیں ”تم تو گئی کیوں جہنم میں۔ فکر تو نسوی اور جہنم دونوں ایک
دوسرے کا ترجمہ ہی تو ہیں۔“

”کتنا غلط ترجمہ ہے!“ میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا ”کاش! اس جسم
کا دروازہ بھی تم پر بند رہتا۔“

”کیسے بند رہتا؟ تم تو اپنے تھے، غیر مفروضے تھے! چلو نکلو اس قبر
سے باہر چلیں۔“

ادرا میں اپنی، گھنسی پٹی روح کے ساتھ قبر سے باہر نکل آیا۔ قبر کی مٹی ابھی
کچی تھی۔ پختہ نہیں کی گئی تھی۔ شاید میرے رشتہ دار اور مزاج پختہ قبر کے لئے بھی

چند فراہم کرنے میں مصروف ہوں گے۔ جیسے ہی میں نے قبر سے سر باہر نکالا اور آدھی جو شاید میری قبر کی مٹی گھوڑ رہے تھے مجھے دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگے۔ میں نے پیچھے سے آواز دی "تم کون ہو بھائی؟ میری قبر پر دیا جلائے آئے تھے۔ یا میرا کفن چرائے؟ اور اب دوبارہ کئی آؤ گے یا یہ تمہارا آخری وزٹ تھا؟"

مگر میری آواز پر ان کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ اتنی تیز کہ ان میں سے ایک تو جھاڑی میں الجھ گیا اور جھاڑی سمیت ہی بھاگتا چلا گیا، اور جیسے دل ہی دل میں کہتا گیا "واہ فکر تو نسوی! ہمیں تم سے ایسی توقع نہیں تھی، پرکار میں ہمارا قیمتی وقت ضائع کر دیا۔ اتنے وقت میں تو ہم کسی کے کھیت سے گئے تو ڈلیتے یا خدا کی عبادت کر لیتے۔"

مجھے ان کی مایوسی پر واقعی صدمہ ہوا کہ میں زندگی میں تو کسی کے کام نہیں آسکا، مرے بچے کے بعد بھی کسی کے کام نہ آیا۔ اگر وہ کفن چور تھے تو کم از کم میرا چند غز کفن ہی حاصل کر لیتے۔ اور اگر دیا جلائے دالے تھے تو خدا ان کے کچھ گناہ بھی بخش دیتا۔ میری بدولت انھیں کچھ تو مل جاتا۔ مگر آہ! یہاں بھی انھیں فکر تو نسوی کے سوا کچھ نہیں ملا۔

میں نے دیکھا کہ میری قبر کے باہر ایک تختی لگی ہوئی تھی، کچی قبر کی طرح یہ ایک کچی سی تختی تھی جس پر کچی سیاہی سے تحریر تھا۔

یہاں طنز نگار فکر تو نسوی ابدی نیند سو رہا ہے۔ وہ مر گیا، لیکن اپنی چھوڑی ہوئی جہانم توں کے باعث ہمیشہ لافانی رہے گا۔

تاریخ پیدائش: جس دن قیصر جرمنی مرا تھا۔

تاریخ وفات: جس دن کوئی بھی نہیں مرا، سو انگر تو نسوی کے۔

تختی پڑھ کر مجھے یاد آیا کہ یہ سب فقرے میرے ہی ایک مضمون سے چرائے گئے ہیں۔ مجھے اپنے مباحث اور دشتے داروں کے ذہنی افلاس پر بڑا فحش ہوا کہ میری موت پر دو اور کتبیل فقرے بھی نہیں لکھ سکتے تھے تو تختی کے نیچے

کم از کم میرے مفعول کا حوالہ دے دیتے۔

جب میں قبر سے باہر نکلا تو کھلی فضا اور ٹھنڈی ہوائ تھی جس میں قریب کی ریڈ فیکٹری کا کڑوا کسلا دھواں ملا ہوا تھا۔ یہ فیکٹری ابھی حال ہی میں سیٹھ جھنگن لال نے تعمیر کی تھی۔ قبرستان کے قریب اسے فیکٹری کی اجازت کیے مل گئی۔ یہ میں نہیں جانتا، لیکن اتنے مجھے ضرور معلوم ہوا تھا کہ سیٹھ جھنگن لال اب بھی گورنمنٹ کے ساتھ خط و کتابت کر رہا تھا کہ اس قبرستان کو یہاں سے ہٹا کر آبادی سے دور لیجا یا جائے اور یہ قبرستان مجھ الاٹ کر دیا جائے تاکہ میں فیکٹری کو پھیل کر ملک اور قوم کے لئے زیادہ سے زیادہ ریڈ پیدا کر سکوں۔

میں نے سنا تھا کہ لاشیں شتراند پیدا کرتی ہیں، مگر یہاں لاشوں کے بجائے ریڈ شتراند پیدا کر رہی تھی۔

اپنے کفن کو تہ بند کی طرح جسم پر پہنچے ہوئے میں نے شہر جانے کی ٹھانی اور گرد کی قبروں میں پڑے ہوئے مردوں پر حسرت کی ایک نگاہ ڈال اور ان سے کہا۔

اب تو جاتے ہی مے کد سے تیرے پیر ملیں گے، اگر خدا والا
بشیر کے بڑے گیٹ کے باہر ایک شال پر آج کا اخبار دیکھا، خرید نہیں سکا
کیوں کہ پیسے ہی نہیں تھے۔ اخبار میں وہی پرانی خبریں تھیں۔ گھروا، ہڑتالیں
بھڑی چھینروا، دوسری، کینرے ڈانس کے اشتہار، کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ اخبار پڑھ
کر یوں لگا جیسے باسی روٹی کھا رہا ہوں۔ اچانک ایک اخبار پر نظر پڑی جو میرے
ایک چوتھیں دوست جناب مجبور احمد کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ لکھا تھا۔

فکر تونسوی کا انتقال۔ پٹی گولی پر نکلی
مشہور چیئر ٹی آچار یہ جناب مجبور احمد جی نے دور رس پہلے نظر

نکر تو نسوی کی موت کی پیش گوئی کی تھی کہ آپ باون سال اور بڑھ گھنٹے کے بعد اپنے بال بچوں اور قرض خواہوں کو رتنا دھوتا چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ یہ بیٹی گوئی منٹ اور سکند کی حد تک جھج نکلی۔ لہذا اپنے مستقبل کے حالات جاننے کے لئے جبرائیل کچھ رانند کی خدمات حاصل کیجے۔

اشتہار پڑھ کر میں اداس ہو گیا۔ میرے زندہ سلامت لوٹ آنے پر چار کچھ رانند کے بزنس کو شدید دھکا لگے گا۔ کیا میں دنیا کا بزنس تباہ کرنے کے لئے واپس آیا ہوں؟ میں کچھ رانند سے مل کر اسے مشورہ دوں گا کہ تم ایک خنجر اٹھا کر مجھے دوبارہ مار دو۔

میں نے ایک اسکوٹر رکشا والے سے کہا گل مہر پارک چلو گے؟ ہمارے دہلی شہر میں یہ رواج تھا کہ اگر اسکوٹر رکشا والے سے چاندنی چوک چلنے کے لئے کہا جائے تو جواب دے گا کہ میں تو انڈیا گیٹ جاؤں گا۔ اور اگر انڈیا گیٹ چلنے کے لئے کہا جائے تو کہے گا کہ شاہدرہ چلنا ہے تو لے چلوں گا۔ مگر اس اسکوٹر والے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ ٹھکی بازہ کر مجھے گھورنے لگا۔ میرے بدن پر سستا سا ریشمی کفن بندھا دیکھ کر بولا: ”آپ کو کیا یہ مردے کا کفن کیوں باندھ رکھا ہے؟“

میں نے کہا: ”میں نکر تو نسوی ہوں۔ یہ کفن میرا اپنا ہے۔ چرایا ہوا نہیں ہے۔“
 ”نکر تو نسوی ہو؟“ اسکوٹر ڈرائیور گہرے گہرے اپنی سیٹ سے اچھلا۔ ”مگر وہ تو انتقال کر گیا ہے۔ اور تم؟“ یہ کہتے کہتے وہ اسکوٹر چھوڑ کر تیزی سے بھاگ گیا۔ شاید وہ مجھے بھوت سمجھ کر بھاگا تھا میری حالت میں کسی بھوت سے مختلف نہیں تھی بے سنگ بڑھی ہوئی ڈاڑھی، سرک بھائے بدن پر کفن، بھوک پیاس سے بڑیاں باہر اور آنکھیں اندر جسم پر جگہ جگہ مٹی لٹری ہوئی اور پاؤں سے بھی لٹکا دھرت ہے کہ وہ من کرتے وقت مردے کو جوتا کیوں نہیں پہنایا جاتا؟

ٹھکن، بھوک، لڑھکی اور اداسی۔ جو عام ہندوستانی کے نصیب

میں ہے، میں بھی ان کا مجموعہ بنا ہوا تھا۔ اب میری پوزیشن بے حد عبرتناک تھی
 نہ میں اپنے گھر جاسکتا تھا۔ نہ واپس قبرستان جاسکتا تھا۔ سگریٹ پینے کی خواہش
 تیزی سے اٹھی مگر جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا، بلکہ سرے سے جیب ہی نہیں تھی
 پہلے اپنے آپ کو فکر تو نسوی کہہ کر کسی بھی دکان دار سے سگریٹ ادھار لے سکتا
 تھا۔ مگر اب؟ حالانکہ میں سو فی صدی دہی فکر تو نسوی ہوں۔ لیکن مجھے
 کوئی سگریٹ تک ادھار نہیں دے گا۔ مرنے کے بعد فکر تو نسوی اپنا اعتماد
 اپنی ساکھ کھو چکا تھا۔ آہ! صرت سات دن میں فکر تو نسوی کیا سے کیا ہو گیا تھا۔
 نفکاہ مارا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں قریبی گھوٹا ہال کی میسرھیوں پر جا بیٹھا
 میسرھیوں کے اوپر کپڑے کا ایک بڑا سا نیلے رنگ کا ماٹو لگا ہوا تھا۔
 طنز نگار فکر تو نسوی کی یاد میں مامی جلسہ۔

رائٹز اینڈ جرنلسٹ ایسوسی ایشن کی طرف سے
 مائڈ پڑھ کر میرے دل میں ہرکس اٹھی۔ جی ہاں کہ عورت کے بعد عورت کا کفن
 بنانے والے احباب سے ملوں اور ان کے گلے سے لپٹ لپٹ کر روؤں اور کہوں،
 "یارو! میری جدائی میں ٹھنڈی آہیں مدت بعد میں لوٹ آیا ہوں۔"

میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا ہال کے اندر داخل ہوا اور احساس
 کمتری کے مارے سب سے کچھلی بچھ پر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ سارے ماحول پر دھماکا
 اور غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ایسٹ کے سیاہ پردے کے نیچے سے ایک مامی دھن
 نک رہی تھی۔ کتنی لطیف دھن تھی۔ ماتم میں بھی کتنی گہرائی اور کتنا وقار بہرتا ہے
 جی جی ہاں کہ یہ دھن بھنی رہے۔ بجتی رہے اور میں مراد ہوں۔ مراد ہوں۔

اتنے میں جیسے کاسکریٹری مانک پر آیا۔ میں اسے جانتا تھا۔ اس نے ایک
 ادنیٰ میگزین میں ایک موشیہ لکھا تھا، "فکر تو نسوی کے طنز کی موت اسی دن واقع
 ہو گئی تھی جس دن اس نے طنز پر مضامین لکھنے شروع کئے تھے۔" اور میں نے یہ

فقیر بڑھ کر کہا تھا: ”اگر یہ فقروں کی سنہرے موتیا تو میں اس حاسد شخص کے منہ پر طمانچہ لگا دیتا۔“ اب سکرٹری نے زندہ ہوئے گلے سے کہنا شروع کیا: ”دوستو! مقامِ ناسف ہے کہ آج ہمارا محبوب و مقبول طنز نگار فکر تو نسوی ہمارا محفل میں موجود نہیں ہے۔ وہ ہمارے طنز پر ادب کو سوتا کر کے چلا گیا۔“

ناٹم گسارا حباب نے دفور جذبات سے داد کی تائیاں بجا دیں۔ ایک تالی میں نے بھی بجائی اور طنز پر ادب کو سوتا کر کے غم میں شریک ہوا۔

اگلی نشستوں پر دو صاحب بیٹھے کھسکھس کر گئے گئے۔ ایک نے کہا ”حرام زادہ بکو اس کر رہا ہے: فکر تو نسوی سے تو یہ انتہائی نفرت کرتا تھا۔“
دوسرا بولا ”اور میں نے سنا ہے کہ اس نے مرحوم کی بیوہ کی اولاد کے لئے پانچ ہزار روپے چندہ اکٹھا کیا ہے جس میں آدھا ہڑپ کر گیا ہے۔“

”ہی ہی ہی! کیوں نہ کرتا؟ یہ خود بھی تو ایک بیوہ ہے۔“

اس کے بعد صدر جلسہ نے مرحوم فکر تو نسوی کی قد آدم تصویر کو ایک پھول والا پتائی پر پھول مالا کی خوشبو اور ملائم گنت مجھے اپنے بدن میں محسوس ہونے لگی بعض اوقات ٹرسچڈ بھی کتنی ملائم اور مسطر ہوتی ہے! میں جیسے سستی میں ہراسا گیا صدر جلسہ نے پھول مالا پتائے وقت گلوگیر بچے میں ایک شعر پڑھا:

سب کہاں کچھ لالہ لولہ گل میں نمایاں ہو گئی

حاک میں کیا صورتیں ہو گئی کہیں ان گھٹیں

حاضر جم میں سے ایک پنگ ٹرک قسم کا ادیب بے اختیار کچا رہا تھا: ”اے! ظالم نے کتنا صحیح شعر کتنے غلط موقع پر پڑھا ہے۔“

میرے ایک انتہائی مداح دوست نے اسے گردن سے پکڑا اور کٹاں کٹاں ہر جا کر بھینک آیا۔

اس کے بعد صدر جلسہ نے ناٹم گسارا حباب کو تقریریں کرنے کی اجازت دی۔ اور ہر ایک نے ثابت کر دیا کہ صرف وہی فکر تو نسوی کو قریب سے جانتا تھا ایک ڈاکٹر صاحب

ایک ایکٹ کے اس ڈرامے میں کلائمکس اس وقت پیدا ہوا جب سیاہ سارٹس میں ملہوس میری بیوہ بھری گوما ٹیکر وفرن پر آسنو بہانے کے لئے لایا گیا۔ اس نے سہاگ کی آخری چوڑی سیج پر توڑی، ماتھے کا سیندر اور بندہ میٹائی آنکھوں کا کاجل پونچھا اور پھر ان میں آسنو بھرائی۔ اس ماتمی حالت میں میری بیوی مجھے تنہا دل کش اور دل ربانگی بیواؤں کی شخصیت میں بھی ایک عجیب سی سستی، بھینگی بھینگلی جاذبیت ہوتی ہے۔ میں نے جی ہی جی میا کہا: ”اے ظالم! تو میرے جیتے جی بیوہ کیوں نہیں بتی تھی؟“

اس کی مسلسل سبکیوں سے محفل کی تمام آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر ریم کے نہیں، خوشی کے آنسو تھے، کہ کم از کم میری موت کے بعد تو مجھے بیوی کی محبت ملی، ورنہ اس سے پہلے جب بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آتے تھے، اپنی ماں کی یاد میں ہی آتے تھے۔

اور پھر میری بیوی کی خاموش ماتم گساری سے محفل پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ کسی کے منہ سے کوئی لفظ نکل نہیں سکتا تھا۔ نہ آہ کا نہ واہ کا۔ چنانچہ محفل کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر سکریٹری نے جلسہ کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اور ”فکر تو نسوی میموریل کمیٹی“ کے پانچ معزز ممبران میری بیوی کی دلجوئی کے لئے قریبی ریسٹوران میں چلے گئے۔ یہ ریسٹوران کافی اور آلیٹ کے لئے بہت مشہور تھا۔ کاسٹ میں ان سے اتنا کہہ سکتا: ”حضرات میرے نام کے چندے میں سے ایک کافی اور آلیٹ اس بد نصیب کو بھی مل جائے۔“

ہال ماتم کرنے والوں سے خالی ہو گیا میں آخری آدمی تھا جو اپنی نشست پر بیٹھا رہا، بیٹھا رہا۔ نہ جانے کتنے سال بیٹھا رہا، نہ جانے کتنی صدیاں کہ اچانک کسی نے میرا کندھا جھنجھوڑا اور اکیچہ کر خست سی آواز آئی: ”صاحب! اٹھئے“ میننگ ختم ہو گئی۔

اور میری صدیوں کی نیند کھل گئی۔ میرے سامنے کمیونٹی ہال کا چتر اسی کھڑا تھا۔ میں نے ہرٹھاکر پوچھا "میں کہاں ہوں۔"

چتر اسی سنسن دیا۔ "فکر صاحب! آپ کمیونٹی ہال میں ہیں۔ آپ ملک کے مشہور شاعر جناب گھانگل نامراوی کے ماتھی چلے میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ جلسہ کی کاغذات ختم ہو گیا۔ آپ گھر نہیں جائیں گے کیا؟

میرا پتر ختم

اور پتروں ہوا کہ میرا پتر ختم ہو گیا۔ چاروں طرف نظر ڈالنے پر معلوم ہوا۔ کہ میرے ساتھ میری بیوی نے پتر ختم نہیں کیا، معلوم ہوتا تھا، وہ مجھ سے دور ہو چکی تھی اور میرا بھی یہی خیال ہے۔ کہ بیوی سے ایک ختم کی رفاقت ہی کافی ہوتی ہے بیوی ایک مطبقہ ہے جو دھرانے سے باسی ہو جاتا ہے۔

میں دوبارہ ختم نہیں لیتا چاہتا تھا، کیونکہ میرا یہ بچہ یقین تھا کہ آٹا ایک مرغ کی مانند ہے جو ہر ختم میں کلکڑوں کوں ہی کرتی ہے۔ اگر کبھی کلکڑوں کوں کی بجائے میاؤں میاؤں کرنے لگے تو دنیا جہنم لینے میں کوئی برائی نہیں۔ اس لئے میں چاہتا تھا، یا تو میری آتما پر م آتما میں مل جائے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو۔ تو مجھے ان کی بجائے آؤ بنا دے لیکن پر م آتما نے اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر مجھے پھر انسانی چرلا دے دیا۔ کہ انسان کو آؤ بننا بھی نصیب نہیں۔

جس گھر میں پیدا ہوا۔ وہ میرے سابق مکان سے تین گز کے فاصلے پر تھا حالانکہ خدا کی دعوت اتنی وسیع تھی کہ وہ مجھے کہیں اور پیدا کر سکتا تھا۔ اگر میں اتنا ہی کیا گذرا تھا۔ یعنی ادیب تھا تو مجھے کائنات میں پیدا کر دیتا جزیرہ سناٹا میں پیدا کر دیتا سندن میں کوئی برا نہیں تھا۔ اس سے ذرا دائیں ہستی لیکن ہوا یہ کہ محلے کی ایک گلی سے میری لاش نکلی اور دوسری گلی سے میری آتما پھر داخل ہو گئی۔ بعض آتما میں اتنی

سست رفتار ہوئی تھیں۔ کہ صرف دو گھنٹوں کا فاصلہ دو جنموں میں طے کرتی تھیں۔

میرے سال بچہ والد صاحب کا نام کشن داس تھا، موجودہ والد کا نام لیشن داس۔ دونوں کسی بامعنی غزل کے دو قافیے معلوم ہوتے تھے۔ دونوں پڑوسی تھے اور رواج کے مطابق جانی دشمن تھے۔ اور پھر ابھی دونوں کا پتر جنم بھی نہیں ہوا تھا۔ انسانی رشتوں کی تاریخ میں شاید سب سے پہلی درگھٹنا سمن کا ایک بیٹے کے دو والد تھے، دونوں جائز تھے اور دونوں ابھی زندہ تھے۔

چنانچہ میں چھ برس کا ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں دو کشتیوں میں سوار ہوں مجھے ارد گرد کی ہر شے جانی پہچانی لگی۔ وہی درد دیوار، وہی گلی۔ وہی گلی کے سرے پر گزری نالی کے قریب کھانا ہوا بابا مکندا۔ وہی بیروہ رام دلاری کے وصول سمن میں ٹوٹے ہوئے ننگے بچے۔ جنہیں میرے دو جنموں کے دوران بھی تھوڑا کھانے کے کپڑے نہیں مل سکے تھے۔ اور وہی میرا ادارہ بھائی کالوجہ سستی کی ٹیکسٹ بلیک میں بچا کرتا تھا اور مجھے کہا کرتا تھا۔ "یوشٹ اپ! بھگوان جسے بھی پیدا کرتا ہے اسے روزی ضرور دیتا ہے۔ چاہے کسی ڈھنگ سے دے"

شروع شروع میں تو مجھے تعجب ہوتا رہا اور میں خاموش رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ گذشتہ جنم کی بہت سی یادیں میرے ذہن کے سمندر میں سے لاشوں کی طرح ابھرا بھر سے بہا ہونے لگیں۔ اور میں بے چینی ہوا تھا۔ اور آخر ایک دن اپنے موجودہ والد صاحب سے کہا۔ "جناب معاف کیجئے، آپ میرے والد نہیں ہیں۔"

والد صاحب مسکرا دیے۔ ہر والد اپنے بچے کی معصوم شرارت پر مسکراتا ہے اور بلند آواز میں میری موجودہ والدہ کو پکارنے لگے۔ "سنا تم نے! تمہارا بیٹا کیا فرما رہا ہے۔ کہا ہوا ہے!"

میں نے کہا۔ "مگر وہ بھی میری والدہ نہیں ہیں۔"

اس پر والد صاحب گنبد برگرہئے۔ ایک ہلکا سا تپڑ عرصہ کرتے ہوئے بولے۔ "تمہارے تاپتار! تم کون ہو؟"

”میں فکر تو نسوی ہوں“

فکر تو نسوی ۔ ؟ والد صاحب کو یہ تمام کچھ باتوں سے معلوم ہوا۔ شاید وہ میری تحریروں کا مطالعہ کرتے رہے تھے بڑے یقین سے ہوتے۔ ”مگر وہ تو انتقال کر چکا ہے۔“

میں نے کہا: ”بجائے فرمایا۔ مگر اس کا مستقل انتقال نہیں ہوا۔ دراصل اسے کسی نے قتل کر دیا تھا۔ اور۔۔۔۔۔“

والد صاحب بولے: ”میں جانتا ہوں“

میں نے کہا: ”ہاں، اور اس کے بعد۔۔۔۔۔“

وہ بولے اور اس کے بعد تم سیدھے ہمارے گھر میں آ گئے؟ اور پھر دو سکند سوچنے کے بعد انھوں نے میرا مزید امتحان لینے کی خاطر پوچھا: ”اچھا، تمہارے پہلے والد صاحب کیا کام کرتے تھے۔“

میں نے کہا: ”ہلدی میں ملاوٹ کرتے تھے۔“

پر سننے ہی ان کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔ اور مزید پیلا ہونے کے شوق میں کچھ اور سوالیہ کئے جن کے میں نے سو فی صدی صحیح جواب دیئے مثلاً ”رام دھن بجاچ کی میری برہم کاریوں کے ساتھ اچانک گئی تھی۔ علاقے کے اسکول کے پرنسپل صاحب گھڑیاں منگول کرنے کے جرم میں گرفتار ہو گئے تھے اور مندر کے پڑوت، درشنا نند ایک بھگتسی کو بھگوان کے ڈائریکٹ ور شی کرانے کے لئے اغوا کر کے لے گئے تھے۔“

اس پر والد صاحب کی حالت غیر ہو گئی۔ اور جب انھوں نے والدہ صاحبہ کو بتایا کہ ہمارے گھر میں جس لڑکے نے جنم لیا ہے۔ وہ پچھلے جنم میں شاعر اور ادیب تھا تو والدہ نے سر پیٹ لیا۔ کہ ہاں بھگوان! ہم نے کوئی بڑے کرم کئے تھے۔ کہ ہمارے گھر میں شاعر پیدا ہو گیا مگر میں نے والدہ صاحبہ کو سمجھایا۔ کہ اب میں اس جنم میں شاعر اور ادیب نہیں بنوں گا۔ بلکہ ایک پورٹ امپورٹ کا بزنس کروں گا۔

مگر والدہ رکھتے ہوئے بولی متبادرا صورت جسم بدلا ہے روح تو وہی ہے۔ اور روح اپنا کردار غفور کے بدلتی ہے۔

ہوتے ہوئے سارے شہر میں داویلا پھیل گیا۔ کہ لشن داس کیلشن ایجنٹ کے گھر جس بچے درشن کمار نے جہنم لیا ہے۔ وہ دراصل فکر تو نسومی ہے۔ یہ خبر میرے سابقہ والد صاحب کٹن داس تک بھی پہنچی تو انھیں بہت رنج ہوا۔ اور ایک دوست سے کہنے لگے۔ ”دھککار ہے ایسے بیٹے پر جب اسے معلوم تھا کہ لشن داس سے بہادری ویرینہ عداوت ہے۔ تو اس میں کیوں پیدا ہوا؟ وہ بالکل ناخلف ثابت ہوا۔ بعض بیٹے زندگی میں ناخلف ہوتے ہیں، مگر میرے بچے کے بعد ناخلف نکلا۔

اور میرے من کر مجھے بڑا افسوس ہوا کہ وہ آواگون کی تصویر کی ہی خلاصہ ہو گئے ہیں۔ اور کہتے پھرتے ہیں، وہ میرا بیٹا ہی نہیں ہے، بجائے کون ہے حالاً میں جانتا تھا کہ وہ پہلے آواگون کے زبردست حمایتی تھا وہ کہا کرتے تھے، ”بیٹا! تمہاری ماں بچھلے جہنم میں بھینس تھی۔ ایک بار میں نے اس بھینس کو ڈنڈا مارا۔ تو اس نے دھمک دی تھی کہ میں اس کا بدلہ لوں گا۔ چنانچہ اب وہ میری بیوی بن کر بچھلے جہنم کے ڈنڈے کا بدلہ لے رہی ہے۔“

میرے درشن کے لئے غول کے غول ہمارے گھر آئے تھے۔ آئے والوں میں میری محبوبہ بھی تھی۔ جو پہلے میرے بچہ میں رونی تھی اب دھمال پر بدلے لگی۔ کیوں کہ اب مجھ پر عشق کی بجائے بچپن سوار تھا۔ اور میں بھی اپنے سابقہ والد صاحب کی بچا کر اسی بیوی کو دیکھ آیا اور اس کی بیوی پر چور می پیسے روٹا رہا۔ کیونکہ یہ ایک غیبی بے ڈھنگی صورت، حالات تھی۔ کہ ایک عورت کا خاوند زندہ تھا۔ مگر سماج اسے بیوہ کے جا رہا تھا۔

اخباروں نے ایک مشرارت یہ کی کہ میرے سابقہ اور موجودہ جہنم دونوں کے فوٹو ساتھ ساتھ شائع کیے گئے اور اس طرح اپنے گاہکوں کو احمقانہ مسرت عطا کی۔ دوسری طرف آواگون کے حمایتیوں اور مخالفوں میں خانہ جنگی کی خبریں آئے لگیں۔ اور ان

میں زخمی ہو کر ہسپتال میں بھی پہنچ گئے۔ میرے پچھلے جنم کے احباب مجھ سے ملاقات کے لئے قشرباغ لائے اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔ فکر تو نسوی! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

میں نے کہا۔ ”مجھے پزیر جنم ہو گیا ہے۔ خدا تم سب کو پزیر جنم عطا کرے۔“

محلے کی رام دہی مجھے ملنے کے لئے آئی۔ مجھے دیر تا سجدہ کر چرن چھو نے ہوئے بولی۔ ”بٹیا تم بھگوان سے مل کر آئے ہو۔ اُدھر تم نے میرے بیٹے دولت رام کو تو نہیں دیکھا۔“

میں دولت رام کو جانتا تھا۔ اس کے نصیب میں دولت کم اور زخم زیادہ لگے تھے۔ وہ شاعر رواج کے مطابق بھوکا نہنگا تھا۔ وہ گھٹیا، سستی شراب پیتا تھا۔ اور چتے چتے بھگوان کو پیارا ہو گیا تھا۔ ”میں نے کہا“ لیکن ماں جی! زخمی صاحبہ..... تو ادھر کہیں دکھائی نہیں دیے۔ ممکن ہے میری طرح پزیر جنم لے چکے ہوں۔“

وہ بولی۔ ”لیکن کہاں — بٹیا! اس کی تو کوئی سدم خبر ہی نہیں“ میں نے دانشوروں کی طرح جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے وہ اسی محلے میں پیدا ہو چکے ہوں، لیکن ماں جی! جنا جنم تو کروں کے مطابق ملتا ہے۔“

وہ بولی۔ ”کرم تو اس کے اتنے اچھے تھے بٹیا! کہ وزیر ہی سکتا تھا۔“

”پھر وہ ترکس میں گیا ہو گا ماں جی۔“ میں نے کہا۔

رام دہی مجھے گالیاں دینی ہوئی چل گئی۔

میری سر جو دھوا لٹھا جب بجا فرامی تھیں کہ میرا جسم بدلا تھا۔ روح وہی تھی۔ وہ کھرا پی، وہی بے لاگ، لپٹ گفتگو، یعنی وہی راست بازار حماقتیں۔ اب لوگ میری باتیں سن کر خوش نہیں ہوتے تھے، نالاں ہو جاتے تھے۔ دھیرے دھیرے انہوں نے ہمارے گھر آنا جانا بند کر دیا۔ محلے کے معززین نے اپنے بچوں کو میرے ساتھ کیلئے

کردنے سے منع کر دیا۔ عورتوں نے میری ماں سے مردوں نے میرے باپ سے بول چال بند کر دی اور اب ماں باپ مجھے سانپ کا بچہ سمجھ کر پالنے لگے۔

امیدویاس کے ماحول میں میں بہت افسوس ہو گیا۔ راتوں کو تنہائی میں زار و قطار رو دیا کرتا کہ اے خالق کل! میری یادیں مجھ سے حسین ہے۔ کچھلے جنم کا ہر عطیہ اس لیے ہے۔ لیکن خالق کو شاید منظر نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ زندگی میرے لئے دوبارہ مورتی گئی۔ خالق نے مجھے شیا جنم ضرور دیا تھا، نئی عقل نہیں دی تھی۔ اس لئے دنیا خدا سمجھنا مجھ سے خوف کھانے لگی، مجھ سے دور بھاگنے لگی۔ اور میں چھ برس کا ننھا سا لڑکا اتنی وسیع، عریض دنیا میں تنہا ہو گیا۔ اور اپنی زندگی صرف اپنے ساتھ گزارنے لگا۔

لیکن اچانک ایک دن تنہائی کا یہ مطلقہ ٹوٹ گیا۔

دراصل اخباروں میں برابر مطالبہ ہونے لگا کہ فکر تو نسوی کو جس آدمی نے قتل کیا تھا ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا۔ اس لئے کمیوں نہ اب فکر تو نسوی سے ہی قاتل کا نام پوچھ لیا جائے۔ قانون اگر نالائق ہے تو پھر جنم سے کمیوں نہ قاتل اٹھا جائے۔

اس مطالبے پر شہر بھر میں میرا مردہ بھر زندہ ہو گیا۔ ایک ہجوم نے غصے میں آکر قتلے کو آگ لگا دی۔ آخر تنگ آکر سرکار نے ایک پولیس افسر میرے پاس بھیج دیا اور وہ بولا: "صاحب!"

میں نے کہا وہ فوت ہو چکا ہے

وہ بولا "آہ! اس کی موت ہی تو ہماری مصیبت بن گئی ہے۔ آپ ہی ہیں اس مصیبت سے چھٹکارا دلائیے اور تھائیے کہ آپ کو کس نے قتل کیا؟"

میں نے کہا: "ایک سکورڈ رائیفر نے"

"وجہ"

"بہت معمولی۔ اس نے مغز کھانے سے بیسی سپر زیادہ طلب کئے تھے

میں نے اسے شرم دلائی۔ میں پر اس کا پارہ چڑھ گیا۔ اور اس نے چہرہ نکال کر میرے پیٹ میں بھونک دیا۔

پر اس افسر بولا: "صرف بیس پیسے کے لئے؟ اتنے بڑے ادیب کو صرف بیس پیسے کی خاطر مار ڈالا۔"

"جہلم! ان دنوں بیس پیسے میں ایک سنگترہ آجاتا تھا۔ مگر ادیب لوگ پانچ پانچ پیسے میں مل جاتے تھے۔ ریٹ کا فرق تھا نا جی!"

پر اس افسر کو طیش آگیا۔ "بولا۔" ہم اچھے بھانسی پر لٹکا دیں گے، آپ اس کا نام بتائیے۔ بسکوٹ کا نمبر بتائیے۔

مجھے اس کا علیہ اور سکوٹر نمبر پوری طرح یاد تھا۔ لیکن... لیکن۔ کیا یہ اسے بھانسی دیا گئے؟ میرا تھا سا جسم کا نپ اٹھا۔ یوں لگا، جیسے بھانسی کا پتھر آہستہ آہستہ سکوٹر ڈرائیور کی بجائے میری طرف بڑھ رہا ہے، نہیں نہیں، میں اس کا علیہ نہیں بتاؤں گا۔ مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ اور میں کچ بچ بھاگ کھڑا ہوا، زور زور سے بھاگتا گیا۔ بھاگتا گیا، گلی ٹرنک، بازار۔ اور پھر میں پھیا کرنے والوں کی نظر بچا کر ایک تنگ زنار یک گلی میں گھس گیا۔ اور پھر لوں محسوس ہوا، جیسے اس اندھیرے میں ایک چہرہ ابھرا ہے، یہ چہرہ بھانک تھا۔ اس کے آنکھوں میں خراں اتر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمکیلا چڑا تھا۔ اور میں نے اسے پہچان لیا یہ وہی تھا، بالکل وہی۔ وہی سکوٹر ڈرائیور۔

اور اس نے میرے پیٹ میں چہرہ لگھو نپ کر ایک بار پھر مجھے قتل کر دیا۔

زورِ خطابت

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مشاعرے میں صدارتی خطبہ

معزز حاضرین! اور ان کے اطفال کرام!

آپ نے مجھے اس مشاعرے کی صدارت کا اعزاز عطا کر کے عجمانت کا ثبوت دیا ہے یا ذمہ داری کا۔ میں نہیں جانتا۔ لیکن گزشتہ کئی دنوں سے مجھے شک ہو رہا تھا کہ مجھ سے کوئی نہ کوئی تازیبا حرکت سرزد ہونے والی ہے۔ ایک خوف یہ بھی تھا کہ شاید مجھے کسی قبر کا مہوار بنا دیا جائے گا یا کسی اجتماع کی صدارت سونپ دی جائے گی۔ جیسے گائے یا بچہ ہو جائے تو اسے نگوشت خانہ میں دان دے دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شاعر، شاعری ترک کر دے تو اسے کان سے پکڑ کر مشاعرے کی صدارتی گہری تک پہنچا دیتے ہیں۔

سباغیر! اس گہری رکشا "پر میرے ساتھ ہمدردی کیجئے۔"

پرسوں کی بات ہے۔ یہی سکریٹری صاحب جو مرغابی کی طرح گردن پھیلائے خوش خوش نظر آ رہے ہیں میرے پاس ماتمی چہرہ لئے ہوئے تشریف لائے اور بولے۔ "فکر صاحب! براہ کرم آپ ہمارے مشاعرے کی صدارت قبول فرمائیے" میں نے کہا۔ "مگر آپ نے ترجمانِ بقل بطور صاحب کو صدر بنانے کا اعلان کر رکھا ہے"

وہ بولے۔ "افسوس! کہ کل وہ اچانک انتقال فرما گئے"

سامعین حضرات! میں نے بہت مشکل سے آنسوؤں کو روک کر اسٹیج
 شکر ٹیری سے کہا آپ مجھے جس راستے پر ڈال رہے ہیں وہ سیدھا قلبی بطور کی طرف
 جاتا ہے۔ لیکن شاعر و ادب کی خدمت کے لئے میں جہنم یا جنت دونوں جگہ جانے
 کے لئے تیار ہوں۔ بھائیو! آپ نہیں جانتے کہ میرے جہنم جانے کی پیش کش پر اسٹیج
 شکر ٹیری صاحب کس قدر مسرور ہوئے۔ جو لوگ دوسروں کی خوشی کے لئے مری جا
 ہیں۔ مثلاً ہے ان کا جنازہ مشاعرہ گاہ سے سیدھا قبرستان تک پہنچ جاتا ہے!
 اور سامعین حضرات! جب مجھے ایک آراستہ کار میں بیٹھا کر اس مشاعرہ گاہ تک
 لایا جا رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایک بکرا ہوں اور مجھے قربانی
 کے لئے قصائی کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ ابھی ابھی ایک صاحب نے میرے
 صدر بٹنے کی تائید فرمائی تھی، آپ کو ان کی تائید سے گمراہ نہ ہونا چاہئے، ریاضہ و
 سہنہ کی تائید انھوں نے دل کی گہرائیوں سے کی ہو۔ نہیں جناب! تائید کرنا ایک
 عادت ہے۔ جیسے سگریٹ پینے کی عادت، جھوٹ بولنے کی عادت، لگائی دینے
 کی عادت۔ صرف عادت پر ادب عالیہ کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ آپ یہ نہ سوچتے
 کہ انہیں میرا صدر بٹنا پسند تھا، بلکہ ان کی شریکداری ہے کہ وہ منہ بھٹ نہیں ہیں۔
 جبکہ اسٹیج شکر ٹیری نے میری گردن میں پھولوں کے ہار ڈالے ہیں۔ میں اپنے
 آپ کو آپ لوگوں سے الگ تعلق محسوس کر رہا ہوں۔ جیسے میں آپ سے زیادہ معزز
 شخص ہوں۔ اندازہ لگائیے، صرف پچیس پیسے کے ہار سے انسان معزز بن جاتا ہے
 پھر بھی سماج میں اس کی عزت ہمیشہ خطرے میں رہتی ہے۔ کیونکہ پھولوں کا ہار ہناسیت
 کمزور بنیاد ہے۔ بلکہ — کوئی بھی شخص پچیس پیسے کا ہار خرید کر اپنی گردن میں ڈال
 لے گا اور کہے گا۔ "میں صاحب صدر ہوں۔" اس کا مطلب ہے حضرات!
 کہ نہ میں معزز ہوں نہ آپ ہیں۔ معزز یہ ہار ہے! اگر ابھی ابھی ایک صاحب پچاس
 پیسے کے دو ہار پہن کر اسٹیج پر آجائیں اور کہیں کہ میں آپ سے ذیل معزز ہوں! تو
 میں صدارت کا بائیکاٹ کر دوں گا۔ کیونکہ یہ اصول کا سوال ہے۔ آپ جانتے

ہیں اصول کے لئے لوگ آنم واہ تنک کر لیتے ہیں عزت یا تواصول میں ہوتی ہے یا دلوں میں۔ صدارت میں کبھی نہیں ہوتی۔

جناب! اگر یہ دلوں والی صدارت کا قصہ آپ کو پسند نہ آیا ہو تو ایک اور صدر کا قصہ سن لیجئے۔ جس نے صدارت خریدی تھی اس نے مشاعرے کے منتظمین کو ایک سو ایک روپیہ چندہ عطا سینٹ فرمایا۔ جب وہ صدارت سکے لئے اسٹیج پر تشریف لائے تو صدارتی کرسی پر کوئی دوسرے صاحب تشریف فرما تھے۔ انھوں نے منتظمین کو ایک سو ایک بار جھاڑنے کے بعد پوچھا۔ یہ کیا بات سنیں ہے؟ اسٹیج سکرٹری نے معذرت طلب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا کوئی قصہ نہیں۔ ان صاحب نے ایک سو ایک روپے کی پیش کش کر دی تھی۔ اس لئے ہم انھیں صدر بنانے پر مجبور ہو گئے۔

دوستو! میں ان دردناک حادثوں کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں تاکہ آپ کو نقب دلا سکوں کہ میں آپ سے زیادہ معزز نہیں ہوں۔ موجودہ صدارت کے دوران مجھے برابر یہ کھٹکا لگا رہا ہے گا کہ آپ میں سے کوئی بھی خوددار شخص اٹھ کر اسٹیج پر آجائے گا اور کہے گا، "فکر صاحب! کرسی صدارت خالی کیجئے اس پر میں بیٹھوں گا! کیونکہ میرا تنک سینٹیں آپ سے زیادہ ہے!"

لیکن اس کے باوجود جناب! مجھے نہ جانے کیوں یہ امید ہے کہ آپ یہی ادھی حرکت نہ کریں گے کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں میری باتیں سن کر آپ کے چہرے زرد پڑ گئے ہیں اور زرد چہرے کبھی خوددار نہیں ہوتے۔

اور شاید اب آپ انتظار کر رہے ہوں گے کہ میں کوئی صدارتی فرض ادا کروں گا۔ نہیں صاحب کرسی صدارت پر بیٹھنے کے بعد صدر اپنے خطری انجام تک تک جائیختا ہے اور اب میری حالت زیادہ سے زیادہ اس قیدی کی سی ہے جس کی آزادی کا کھانا گھونٹ دیا گیا ہو۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ صدر کی کرتیا چار گھنٹے مسلسل کرسی پر معزز بن کر بیٹھے رہنا کتنا ذہنی عذاب ہے! اب میرے پاس

اچانک باقی رہا، جو کچھ ہے آپ حضرات کا ہے، میں آپ کی تمنائوں کا غلام ہوا کر
 کر سہی پر مہینچا رہوں گا۔ ہلکی سی کروٹ بھی لوں گا تو آپ سوچنے لگیں گے صاحب صدر
 بور ہو رہے ہیں اور بور ہوتا عداوت کی شان کے شایاں نہیں، میرا سگریٹ سلگاتا
 بد تمیزی سمجھا جائے گا، میز پر عینک اتار کر رکھنا غیر مہذب مغل تصور ہو گا۔ یعنی
 میں اپنی حالت زار پر نہ روسکوں گا نہ سنسکوں گا، جناب میں سالس ہنگ روئے
 سکوں گا، دوزخ شعراء حضرات سمجھیں گے میں اٹھیں ہوٹ کر رہا ہوں، اب میں
 آپ کی آنکھیں بچا کر ہی انگڑائی لے سکوں گا، اگر تازہ ہوا کے لئے دو چار منٹ
 کے لئے کھل فصحا میں جاؤں گا تو آپ سمجھیں گے مشاعرہ ختم ہو گیا ہے۔

ہاں پیارے دوستو! میں کوئی ایسی حرکت نہ کروں گا جو انسان کی معصوم
 اور معمولی مہالی فطرت سے تعلق رکھتی ہو، آہ! آپ نے ایک نیچرل انسان کو ان نیچرل
 بنا کر رکھ دیا ہے، اور اس کے باوجود آپ کہتے ہیں کہ آپ نے میری عزت کی ہے۔
 ابھی ابھی آپ کے سامنے بڑے بڑے مفکر شعراء اپنی تخلیق قیامت پیش کرتے
 کے قشر لٹ لائیں گے، جب سے شاعری نے جنم لیا ہے میرا اور آپ کا یہ اندھ
 و مشا اس رہا ہے کہ شاعری آسمان سے اترتی ہے اور شعراء حضرات پیغمبر ہوتے
 ہیں، ایک بار میں نے پیغمبر بننے کا تجربہ کیا تھا، اور جس طرح کئی تجربے ناکام ہو جاتے
 ہیں، اسی طرح میرا پیغمبر بننا بھی ناکام ہو گیا، حادثہ یہ ہوا کہ میں آسمان سے جو پیغام لایا
 تھا، زمین پر کسی کی سمجھ میں نہ آیا، کیونکہ آسمانی بات کا تعلق اپنی سمجھ سے نہیں اور دوسروں
 کی سمجھ سے ہوتا ہے، اسے ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے، ایک بار ایک
 کٹر امیری منڈیر پر پر پیغام لے کر آیا کہ میری محبوبہ آنے والی ہے، تو جناب میں نے فرط مشرقت
 میں اس کو لے کر پھل کھلائے، چائے پلائی سگریٹ نکھ پیٹی کیا، لیکن اس پیغام کا
 نتیجہ یہ نکلا کہ میری محبوبہ کی بجائے کچھری کا بلیٹ آگیا جو مجھے سرکاری قرضہ دار نہ کر سکے
 کے جرم میں گرفتار کر کے لے گیا!

چنانچہ حضرات! میری پیغمبری کا بھی یہی انجام نکلا کہ میں کوئے کے پیغام کا

مفہوم نہ سمجھ سکا۔ اس نے پکڑا لیا۔ میری شہریت بھی دوسروں کی سمجھ کی غلام کہنی۔
اس نے ناکام ہو گئی کیونکہ میں پنھنکڑی کی بات کرتا تھا تو لوگ اسے مجرب کی حرفیں
سمجھتے تھے۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ میں شاعر کی بجائے صدر بنا بیٹھا ہوں!

میں نے شاعری ترک کر دی۔ لیکن ترک شاعری کے باوجود میں نے دیکھا کہ
شاعری کی عظمت کم نہ ہوئی، مصیبت یہ ہے کہ ہر دور میں کئی شاعر ایسے ضرور پیدا
ہوتے ہیں جو شہر مچاتے ہیں کہ شاعری کا زوال قریب ہے اسے پھر بلندی عطا کرنی چاہیے
یہ اول درجے کے شعرا دکھانے لگتے ہیں۔ یہ دیکھ کر دوسرے اور تیسرے درجے شعرا
پریشان ہو جاتے ہیں کہ اعلیٰ شاعری کو بر باد کرنے کے لئے ان کا مشن قبل ہو رہا ہے۔
ان میں سے کئی دریا میں چھلانگ لگا کر مر جاتے ہیں اور مرنے سے پہلے دریا کے کنارے
پر کاغذ کا ایک پرزہ چھوڑ جاتے ہیں کہ یہ جاہل دنیا اس کی عظمت کو سمجھ ہی نہ سکی۔ لیکن
کچھ شعرا جو دریا کے ٹنڈے پانی سے ڈرتے ہیں خود کہتی نہیں کرتے تنقید نگار بن جاتے
ہیں۔ ایسے ہی ایک شاعر نے انتقام لینے کی غرض سے ایک پورٹ امپورٹ کا دھندا
شروع کر دیا اور خوب نام اور دام کمائے۔ اس طرح ایک اور شاعر نے شاعری سے
بدل لینے کے لئے ”نا شاعری“ شروع کر دی جس کے یہ چند مصرعے عجیب بھی نہیں تھے۔

میں اپنے والد کی کھلی کا ایک مسہ ہوں

جی میں آتا ہے کہ

اپنے والد کی قبر پر گروں

اور کہوں

عمہ سے اپنی یہ جائیداد لے لو۔

میرے اندر کا جو چرما ہے، لٹہ ہوا ہی بھلا۔

اور پھر قبر پر نور سے نئے کروں۔

تو یقیناً جائیداد لوٹا دوں!

لیکن سامعینِ کرام! شاعر چاہے خود کش کر لے، چاہے کھلی کا مسہ بن جائے۔

لیکن صرف ایسے ہی شاعروں کی بدولت مشاعروں اور میگزینوں کی رونق قائم رہتی ہے۔ یہ اتنا بڑا سماج جو مزدوروں سے لے کر ستم خانوں سے ہونا ہوا راج محلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ صرف دو چار عظیم شاعروں کے بھروسے پر نہیں چل سکتا۔ غالب، نیگور۔ اور اقبال سے اس سماج کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر غالب اور اقبال کے پیچھے کئی ڈویژن شاعر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک آدھ ڈویژن اس شاعرے میں بھی موجود ہے۔ اگر اس شاعرے میں صرف نیگور ہوتا تو شاعر مندرہ میں منٹ میں ختم ہو جاتا۔ لیکن اب اللہ کے فضل سے یہ شاعرہ رات کے تین بجے تک چلے گا۔ بڑے شاعر صرف بڑی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن سماج کو چھوٹی باتوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ چند دن ہوئے کافی ہاؤس میں دو شاعروں نے ایک دوسرے کے منہ پر کا پچ کے گلاس پھینک کر ایک دوسرے کو لہوا کر دیا۔ گویا کہ دونوں ایک دوسرے کو گھٹیا شاعر کہہ رہے تھے حالانکہ دونوں اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ نیگور گھٹیا شاعر تھا۔

حضرات! میں دیکھ رہا ہوں کہ شعراء حضرات میرے خطبے سے بور ہو رہے ہیں اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے ہوٹ کرنا شروع کر دیں میں اس سچے سکریٹری سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ شاعرے کا آغاز کر دیں اور شاعرے کی حسین روایت کے مطابق پہلے گھٹیا شاعروں اور پھر ان سے کم گھٹیا شاعروں کو!!

محلہ سدھار کیٹی

بھائیو، بہنو! غور سے ماس والداد اور بہت سے بھائیو
 آپ نے یہ اچھا نہیں کیا کہ مجھے محلہ سدھار کیٹی کی اس سالانہ مٹنگ کا
 مہمان خصوصی بنادیا۔ میں مہمان خصوصی بننے سے ہمیشہ بدکھتا ہوں۔ کیونکہ یہ
 ایک ایسی عزت ہے جو انسان کو غیر فطری بنا دیتی ہے۔ اور اس سے راست
 گفتاری چھین لیتی ہے۔ مثلاً اب میں اتنا بھی نہیں کہہ سکتا کہ جس کرسی پر بیٹھا ہوں
 اس کی ایک ٹانگ لٹٹنے کے قریب ہے اور میں پورے وقت ایک پہلو بیٹھ کر
 اپنے آپ کو سنبھالتے رہا ہوں۔

حضرات! کسی بھی مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ پورا محلہ ایک کرسی ہے۔ جس کی ایک
 ٹانگ ہمیشہ لٹٹنے کے قریب رہتی ہے اور ہم سب ایک پہلو بیٹھے اپنے آپ کو
 سنبھالتے رہتے ہیں۔ اس سنبھالتے پر ہمارا کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ میرا
 خیال ہے وقت کا یہ اتنا ہی بھونڈا استعمال ہے لیکن ہمیں اپنے محلے سے چونکہ
 بے حد محبت ہے۔ اس لئے محبت کی خاطر ہمیں یہ بھونڈا پن کرنا ہی پڑتا ہے۔
 جناب والا! محبت انسانی کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ یہ تو ہماری ذمہ داری
 ہے کہ ہم نے اس بدقسمتی کو قربانی کا دغریب نام دے کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا
 ہے۔ درنہ خدا نے تو ہمیں جذبہ محبت عطا کر کے ہمارے ساتھ کافی بڑا

کیا تھا۔

میں نے ابھی ابھی آپ سب صحابیوں بلکہ صحابہ کی تقریریں سنیں جو محلہ سدھار کے عظیم مقصد سے کی گئی ہیں، ان تقریروں سے میں مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ہمارا محلہ بگڑے ہوئے انسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس لئے ہمارا سدھار برتنا چاہئے۔ آہ! یہ کتنی شرمناک بات ہے کہ خدا ہی اپنے آپ کو ذلیل انسان کہہ کر ذلیل کر رہا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل تسلیم کر لینا بہادرى ہے۔ اور ہم بہادر لوگ ہیں۔ صحابیوں! انہیں ایسا ہے تو میں حیران ہوں کہ آپ بہادر انسانوں کا سدھار کیوں کرنا چاہتے ہیں کیا یہ وقت کا بھونڈا استعمال نہیں ہے کہ آپ پیغمبروں کو نصیرت کریں کہ آپ کے بگڑے میلے ہیں، انہیں دھویا کیجئے حالانکہ پیغمبر اگر بگڑے نہیں دھوتا تو اس کی کوئی گہری اور فلسفیانہ وجہ ہوگی۔ جو اسے خود اچھی طرح معلوم ہوگی۔

اس لئے جناب امیری مائے قراس محلہ کا سدھار صحت کیجئے، اگر آپ کے کپڑے میلے ہیں تو صابن سے دھو لیجئے صرف صابن بگڑا پیگنڈہ کی خاطر اسے زیادہ لوگوں کو ایک منیگ میں اکٹھا کرنے کی کیا ضرورت ہے! — چند دن پہلے اس محلہ کے ایک بزرگ ابدیدہ ہو کر کہنے لگے: "نکر صاحب! اس محلہ میں چوبیسوں کی تعداد صحت بڑھ گئی ہے۔ مگر کوئی دن کا تدارک کرنے والا نہیں ہے۔" میرا خیال ہے کہ وہ چوبیسوں کی سینہ فندری پر ابدیدہ نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کی آنکھوں میں کھڑے تھے۔ ورنہ جو ہے تو چوہے دان کے ذریعے بھی آسانی سے پکڑے جاسکتے ہیں۔ اگر ہم چوہے دان اور صابن کا استعمال نہیں جانتے تو جناب بھی خدا سے دعا کرتے چاہئے کہ ہمیں اگلے جنم میں انسان نہ بنائے بلکہ چوہے بناوے۔ جو کپڑے نہیں پہنتے اور جنہیں صابن کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیا آپ نے سمجھیں دیکھا کہ چوبیسوں نے کبھی چوہا سدھار کیٹی بنائی ہو۔ اور لکڑوں کی آڑ میں آستہا بھائے ہوں۔ بھائی اور بھائی! برا نہ مانئے میں کہوں گا کہ جو ہے ہم سے زیادہ فطری زندگی گذار

آپ شاید عجب پر شک کر رہے ہوں گے کہ میں محلہ کا سدھار نہیں چاہتا۔ ایسا ہی شبہ مجھ پر اس محلہ میں بھی کیا گیا تھا جہاں میں دو سال پہلے رہتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے بھائیو کہ دنیا کے ہر محلہ میں رات کو بے نوا شاگئے بھونکتے ہیں جس سے اہل محلہ پریشان رہتے ہیں۔ ہر محلہ میں ایک جھگڑا لڑو عورت رہتی ہے جو قتلِ امن کا باعث بنی رہتی ہے۔ ہر محلہ میں دو چار تارہ گرد و جوان لڑکے پیدا ہو جاتے ہیں جن سے محلہ کا اخلاق تلوار کی لمبائی پر رہتا ہے اور ہر محلہ میں پانچ دس ریشا رٹو بڑھے بھی ضرور رہتے ہیں جو نصیحتوں کے چراغ اپنے سر لانے جلا کر بیٹھے رہتے ہیں۔

اور دوستو! یہ سب خدا داد نعمتیں ہیں۔ ان سے ہم بچ نہیں سکتے۔ ان کی کسی بھی محلہ کو ان نعمتوں سے محروم کر دیا جائے تو وہ محلہ نہیں رہتا بلکہ جنت بن جاتا ہے اور معاف کیجئے جنت ایک انتہائی آنا دینے والی چیز ہے، جنت شوقیہ میں اتنا دھڑلا ملک کی ایک چیز ہے جس کے لب اگرچہ لعلیں ہیں مگر ان پر کسی کا بوسہ ثبت نہیں ہوا، کیونکہ اس بوسے میں نہ حلاوت ہوتی ہے نہ حرارت۔ سچ بتائیے کیا آپ پلاٹنگ کی اس حسینہ کو کوئی محبت نامہ بھیج سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آپ اس جہنم کے خلاف کیوں شور مچاتے ہیں۔ میں توجیب محلہ کی کسی جھگڑا لڑو عورت یا آوارہ گرد لڑکوں کو دیکھتا ہوں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے جنت کے سافہ جہنم بھی پیدا کر دیا اور ہمارے محلہ کو پلاٹنگ کی حسینہ بننے سے بچا لیا۔ جانا والا! خدا پر اعتبار کیجئے وہ ہم سے زیادہ ذہین اور دور اندیش ہے۔ جس نے ہمیں زندگی کی حلاوت اور لذت بخشنے کے لئے انکو رہی عطا نہیں کئے۔ بلکہ ریشا رٹو بڑھے بھی عطا کر دیئے جو لوٹری کا رول ادا کرتے ہیں۔

آج کی مٹنگ میں ایک معزز مقرب نے اشارتاً ذکر کیا ہے کہ ہمارے محلہ میں ایک شاعر رہتا ہے جو رات کو شراب میں دھت ہو کر آتا ہے اور ادھم مچاتا ہے۔

انتظار نہیں کیا۔ دراصل لالہ کانشی رام سے زیادہ بھی پولیس میں روحانی جذبات پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ کیرتن کے تعداد میں اس طرح ہتھکڑیاں پہنائی جاتی نہیں گی۔

جب میں نے جیل میں لالہ کانشی رام سے ملاقات کی اور پوچھا کہ کیرتن کا یہ غلط نتیجہ کیوں نکلا تو محض نے قلا سفروں کی طرح جواب دیا۔ "لوہے کی بلیک ایک انفرادی مسئلہ ہے۔ آپ اسے کیرتن کے جماعتی نتیجے سے کیوں ملاتے ہیں۔ دیکھ لیں نتیجہ کیرتن کا پھل الگ ملے گا۔ اور میں جھوٹ جاؤں گا۔"

"کیسے؟ میں نے نشریجا پوچھا۔

وہ مسکرائے اور بولے: "بھگوان نے میری عبادت سے متاثر ہو کر پولیس کی بدھی بھرشت کر دی ہے اور وہ میرے ساتھ رشت کی بات چیت چلا رہی ہے کیرتن کا پھل رائیگاں نہیں جاتا فکر صاحب! آپ کی عبادت میں سچی عقیدت اور خلوص ہونا چاہئے۔ میں پوچھتا ہوں ذرا بتائیے، پولیس کی بدھی بھرشت کرنے میں کسی کا ہاتھ ہے؟"

بھائیو۔ بہنو۔! لالہ کانشی رام کی یہ تشریح اگرچہ دوکھی اور قابل فہم تھی لیکن اگر وہ واقعی رہا ہو گئے تو کیا ہم میں سے کس کی جرات ہے کہ کیرتن کے روحانی اثرات سے انکار کریں۔ البتہ صرف ایک شبہ میرے دل میں ابھی تک رہا ہے کہ اس کیرتن کے بعد محلے کے بھگوان داس چپرا کی کاسا مان جب اس کے مالک شری تارن داس نے باہر پھینک دیا تو کیرتن کا پھل بھگوان داس چپرا کی کوکھوں میں ملا۔ حالانکہ کیرتن میں اس نے سب سے زیادہ شری اور عقیدت اور خلوص کے ساتھ ڈھول بجا یا تھا اور رات بھر گایا اور گانا مارا تھا۔ کیا کوئی ایسا استہمام نہیں ہو سکتا کہ خدا ہی اپنی بدھی بھرشت کر لے۔ یہ محض سدا جاکشی کا فرض ہے کہ وہ رشت کا نتیجہ کرے اور بھگوان داس چپرا کی گود بارہ مکان دلاوے ورنہ خطرہ ہے کہ محلے میں کیرتن کی روایت غلط شکل اختیار کر جائے گی۔ اور کیرتن کے روحانی اثرات میں نقص پیدا

ہو جائے گا۔ کم از کم عبادت کی سطح پر تو چراسی اور آئین مرجٹ میں فرق مٹ جانا چاہئے۔ ورنہ ہمارے محلے کے لوگ کیرتن کے لئے چندہ دینے سے ہچکچاتا شروع کر دیں گے۔ ذرا سوچئے اگر چندہ جمع کرنے میں رکاوٹ پیدا ہو گئی تو کیا کیرتن منڈلی والے کم اجرت پر کیرتن کرنے سے انکار نہیں کر دیں گے

محلے کی ایک تعلیم یافتہ خاتون مسز و ملا نے اپنی تقریر میں دھمکی دی ہے کہ اگر محلے کے بچوں میں گندی گالیاں دینے کی قبیح عادت ختم نہ کی گئی تو میں محلہ چھوڑ کر چلی جاؤں گی حضرات مجھے یقین ہے کہ وہ محلہ نہیں چھوڑیں گی۔ کیونکہ ان میں لیڈرانہ صفات پائی جاتی ہیں اور وہ محلے کی عورتوں کی لیڈر بننا چاہتی ہیں اگر محلے کے تمام بچے آج قنصلہ کر لیں کہ وہ گندی گالیاں نہیں دیں گے تو مسز و ملا کے لئے یہ انتہائی رنجیدہ فیصلہ ہو گا۔ کوئی لیڈر یہ نہیں چاہتا کہ گندی اور بری چیزیں ختم ہو جائیں۔ ہماری کمزوریاں، گندگیاں اور برائیاں ہی مسز و ملا کا من بھاتا دکھائیں۔ ان کا خاتمہ مسز و ملا کا خاتمہ ہو گا۔ ایک تیر انداز سے اگر یہ کہا جائے کہ تم بغیر نشانہ کے تیر چلاؤ تو اسے اپنے آرٹ کی توہین سمجھے گا۔ اسے آپ پر غصہ آئے گا۔ اور ممکن ہے، غصہ میں محلہ چھوڑ کر چلا جائے۔ اگر مسز و ملا ابھی تک محلہ چھوڑ کر نہیں گئیں تو صرف اس لئے کیونکہ یہاں کے بچے برابر گندی گالیاں دیے جا رہے ہیں اور مسز و ملا ان کی ماؤں کو برابر بھوٹڑ، بدتمیز اور بد نصیب کہے جا رہی ہیں۔ جناب عالی — ایک تعلیم یافتہ عورت کے ذہن پر غیر تقسیم یافتہ عورتوں میں احساس کمتری کا گناہ اٹھا ہے اور جب لوگوں میں احساس کمتری پیدا ہو جائے تو وہاں ایک نہ ایک لیڈر ضرور پیدا ہوتا ہے جو اس احساس کمتری کی ستار پر اپنا نعشہ لٹاتا ہے۔

اس لئے حضرات! مسز و ملا کی دھمکی کو بھی ایک قسم کا نغمہ سمجھئے۔ خدا نہ کرے کہ ہمارے محلے کی عورتیں بھوٹڑ اور بدتمیز نہ رہیں اور یہ نغمہ بند ہو جائے جسے سب ہی کر ہمارے محلے کی عورتیں مست ہو رہی ہیں — یہ صحیح ہے کہ گندی، نامی تنہ زیب کے زوال کی علامت ہے۔ اور مسز و ملا نہیں چاہتیں کہ اس کے اپنے بچے بھی گندی گالیاں

سیکھ جائیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسز و ملا یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ ایسے
 تھینے محفلے کو جہاں بد ہنڈی زوروں پر ہے۔ چھوڑ کر چلی جائیں۔ دراصل مسز و ملا
 اس محلہ کی عورتوں اور بچوں میں تہذیب کی داغ بیل ڈالنا چاہتی ہیں۔ چاہے اس
 کے لئے انھیں کتنی قربانی دینی پڑے۔ چاہے اس کے اپنے بچے گندی گالیاں سیکھ
 جائیں۔ جناب! لیڈروں میں قربانی کا زبردست جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس لئے
 مسز و ملا کو قربانی کا موقع دیجئے۔ درمیان کی افسردگی اور بڑھ چائے گی اور آنکھوں
 کے سیاہ محفلے اور گہرے ہو جائیں گے جو محلہ کی بد تمیزی پر گڑھتے رہنے کی وجہ سے
 پیدا ہو گئے ہیں۔

سباؤ اور سبزا! — اپنی تفریح ختم کر کے سے پہلے میں ابھی گزراؤں کروں گا
 کہ اس محلے کے سدھار کے علم کو اتنا گہرا مدت بنائیے۔ بلاشبہ آپ اس میں چند مسلمی
 تبدیلیاں لے آئیے۔ مگر کوئی بنیادی تبدیلی لانے کی ضرورت کی ضرورت نہ کیجئے۔ بیشک
 آپ چاہیں کہ محلہ بدر کر کے لے لیاں پانے کا پلان بنائیے ان کے ساتھ کچھ
 بچے بھی لے آئیے گا تاکہ بلیوں کی زندگی "ڈل" نہ ہو جائے، محلے کی صفائی ستھرائی
 کے لئے کوئی مشترکہ فنڈ قائم کر لیجئے (فنڈ اتنا کم نہ ہو کہ اس میں فن کی گنجائش نہ رہے)
 چوروں کو ڈرانے کے لئے ایک بانٹواہ پیرے دار میں رکھئے وہ پیرے دار سونے صدی
 جفاکش اور احمق ہوتا کہ چوروں سے نہ مل جائے، محلہ میں کسی کا انتقال ہو جائے
 کسی کا جنم ہو جائے کسی کی شادی ہو جائے یا کسی کا لڑکا لڑکی بھاگ جائے تو بچا
 سب مل کر آئندہ بھائی یا قہقہے لگائیے (اور یہ سب کچھ اس لئے کیجئے کہ آپ سب
 ساتھ بھی یہ ساتھ ہو سکتے ہیں)۔

غرض یہ سب کچھ کیجئے۔ جس کا آپ کے دل سے
 کوئی گہرا تعلق نہ ہو۔ جناب! میں یہ غور ڈمی سسی کڑوی بات
 اس لئے کہہ رہا ہوں کیونکہ ہم اس سے زائد کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ وہ
 ہمیں سے کوئی فرد و محفلہ سدھار نہیں کرے یہ اجازت دے گا کہ اس کے دل

اور صبح کی سلطنت پر حملہ کروے۔ کیا آپ محلہ سدھارکشی کو یہ اجازت دیں گے کہ وہ آپ کو انڈا کھانے کا حکم دے جبکہ آپ ٹماٹر کاٹ کر کھا رہے ہوں۔ ایک بار میں نے محلے کے ایک شخص سے کہا: "جناب! آپ کے چہرے پر جو ڈاڑھی ہے وہ اتنا ہی بد تما لگتی ہے آپ روزانہ شیو کیا کیجئے۔" تو وہ مجھ سے اتنا ناراض ہوا کہ میں اب اس سے ڈر کے مارے وہ دس روپے بھی نہیں مانگتا جو اس نے مجھ سے قرص لے لئے تھے۔ اسی طرح ایک بار محلہ کے ایک معزز آدمی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ آپ پان مہنت کھایا کیجئے۔ اس سے آپ کے دانت جھڑ جائیں گے۔ میں جبران ہوا کہ میرے دانت جھڑنے سے اس آدمی کو کیا دلچسپی ہے؟۔ کیا صرف اس لئے میں اس کی بات مان لوں کہ میں کہیں کھیا راہس سے اخبار پڑھنے کے لئے مانگ لانا ہوں؟ اس لئے جناب! ہم ایک محلے میں رہنے کے باوجود الگ الگ انسان ہیں محلہ سدھارکشی اگر ہم الگ الگ انسانوں کو ایک داسٹھ سے ہٹکنا چاہتی ہے تو یہ اس کی سنگدلی ہے بلکہ ایک غیر فطری حرکت ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ نے مجھے خصوصی مہمان کی عزت دے کر غیر فطری باتیں کہنے پر پابند کر دیا۔ آپ کے مانگنے پر اس وقت جو شکن پڑ رہے ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں نے اس پابندی کو کیوں توڑ دیا ہے اور اس کرسی کے ٹوٹنے والے پائے کا ذکر کیوں کر دیا جو شاید لالہ کانشی رام کے عمر سے لائی گئی ہے اور جو آج کل بلیک کے جرم میں جیل میں بند ہیں۔

لیڈروں کی محفل میں

معزز سہیلیاں قوم!

آپ نے مجھے اپنی محفل میں مدعو کر کے جس عظیم روایت کو توڑا ہے، اس کے لئے میں ممنون بھی ہوں اور حیرت زدہ بھی۔ روایت یہ ہے کہ لیڈر بونا ہے اور عوام سفلے ہیں۔ لیکن آج عوام بولنے کا اور لیڈر سننے گئے۔ یعنی آج ہم دونوں غلط نشستوں پر بیٹھے ہیں۔ روایت سے اس بقا و بہت کے کارکن میری پوزیشن مفنکہ خیز ہوئی ہے یا آپ کی، میں نہیں جانتا۔ لیکن ایک بات صاف ہے کہ آپ کے سامنے تخریب کرتا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی افسر لڑائی، بڑی بوڑھوں کو تعظیم کرنے بیٹھ جائے کہ دھوپ میں بال سفید کرنے کے کیا کرتے ہیں۔

حضرت! یہ آخری فقرہ میں بڑی محنت سے تیار کر کے لایا تھا، تاکہ آپ کے قابو ہو کر اس پر تالی بجائیں۔ لیکن آپ تو گم سم بیٹھے ہیں، اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا۔ کہ ایک اچھے سامع اور نالائق سامع میں کتنا فرق ہوتا ہے اور تاریخ میں جتنے لیڈر ذلیل و خوار ہوئے ہیں، صرف نالائق سامع کی وجہ سے ہوئے ہیں۔

لیڈر صاحبان! اس محفل کے معزز میزبان نے جسے اپنا لیڈری کے عروج میں پھانسی کی سزا ہوئی تھی، مگر ایک تکنیکی وجہ سے رکہ سزا کے حکم میں ان کے والد صاحب کا نام غلط لکھا گیا تھا، پھانسی نہیں مل سکی تھی۔ وہ آج کل مکھن

اور کریم کی ایک بہت بڑی فیکٹری چلاتے ہیں۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں لیڈر اور سیاست کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں مگر یہ مشورہ ناقابل عمل ہے کیونکہ نہ تو میں یہاں رہوں کہ سچ بول سکوں اور نہ سیاست واں ہوں کہ ممبر پارلیمنٹ سکوں اور ایک اچھی تقریر کے لئے یہ دونوں گن لازم ہیں۔

لہذا اس پیچیدہ صورت حال سے بچنے کے لئے میں آپ کو اپنے پڑوسی غنقا سنگھ کی بات سناتا ہوں۔ غنقا سنگھ بڑھی ہے، وہ نہایت نفیس اور خوبصورت کرسیاں بناتا ہے، لکڑی یعنی "جینوئن" استعمال کرتا ہے اور یہ اس کی خاندانی روایت ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ شیر کے متعلق اس کی معلومات نہایت محدود ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے سیاست کے متعلق میری معلومات ناقص ہیں۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ جو آدمی "جینوئن" کرسی بنالیتا ہو وہ شیر کے شکار کو بھی جایا کرے۔ ایک بار کچھ لیڈروں نے میرے "جینوئن" خیالات کی بنا پر مجھے سیاست میں گھیر کے سازش کی تھی۔ بلکہ ایک سیاسی پارٹی کا لیڈر تک بنا دینے پر تیل گئی تھی۔ لیکن کچھ مدت بعد مجھے دیانت داری سے خیال ہوئے لگا کہ جینوئن خیالات سب سے بڑی حماقت ہیں یہ کتنا صحیح مگر کتنا کرب انگیز خیال ہے کہ آپ ایک جینوئن کرسی بنا سکتے ہیں مگر بنانا نہیں چاہتے۔ یا بنانا چاہتے ہیں مگر بنائیں نہ سکتے۔

رہنمایان ملت! میرے محلے اور میرے شہر میں ان گنت غنقا سنگھ رہتے ہیں جنھیں اپنی اس کم نفسی برتاؤ سے کہ وہ شیر کا شکار کرتا نہیں جانتے۔ صرف کہیں کھار بال بچوں کو جڑیا گھر لے جاتے ہیں۔ اور شیر کو دیکھ آتے ہیں! بالکل ایسے جیسے وہ کہیں کھار آپ کی تقریر سننے آ جاتے ہیں۔ جناب والا! جب تک دنیا میں غنقا سنگھ بڑھی موجود ہے۔ شیر اور لیڈر کی عظمت کا خوف بھی موجود رہے گا۔ غنقا سنگھ کی کم نفسی اور جینوئن کرسی بنانے کی حماقت جب تک زندہ ہے اس وقت تک شیر کی طرح جڑیا گھر کے پتھر سے میں بند ہے گی اور آپ کی لیڈر کی محفوظ رہے گی۔ دہلیاں بجا لے گا ایک اور نادر موقع!

صحابان! میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے ماتھے پر کچھ بل آئے ہیں، کیا آپ پر کبنا چاہتے ہیں کہ ریڈر جینیٹکس بھی ہوتا ہے آپ تعجب کر سینگے کہ میں بھی اسے تسلیم کرتا ہوں۔ کیونکہ حضرات! جینیٹکس ہونا — ایک کیلیکولی جنز ہوتا ہے۔ پھل جانے والی مائع حقیقت مثلاً ہٹلر اور شالمن دونوں اپنے اپنے نقطہ نگاہ سے جینیٹکس تھے۔ لیکن دونوں میں بعد المشرقین بھی تھا۔ بظاہر یہ بات بڑی احمقانہ لگتی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ جینیٹکس بعد المشرقین اور قرب الطرفین دونوں سانچوں میں بڑی آسانی سے ڈھل جاتی ہے۔

مگر قومی رہنماؤں مثلاً سنگھ بڑھئی کے لئے یہ بات بڑی پریشان کن ہے کہ وہ کسے جینیٹکس مانے، کیونکہ وہ سیدھا سارا آدمی ہے۔ اسے حب بتایا جاتا ہے کہ اب ہٹلر جینیٹکس نہیں رہا اور اب شالمن بھی جینیٹکس نہیں رہا۔ تو وہ اور اس ہو جاتا ہے۔ اور کئی کئی دن تک اپنی پیاری بیوی کا بوسہ تک نہیں لے سکتا۔ جناب عالی کہیں ایسا تو نہیں کہ دنیا میں طلاق کے جتنے واقعات ہوئے ہیں۔ وہ آپ کی دھم سے ہوئے ہیں۔ اور دنیا میں جو بڑی بڑی قومیں اور تہذیبیں فنا ہو گئیں وہ آپ کے جینیٹکس ہونے کی وجہ سے فنا ہوئیں، خدا کے لئے حضرات! مثلاً سنگھ کی پریشانی ددر بھیجئے اور اس کے لئے جینیٹکس کو پرکھنے کا کوئی ہیما نہ دریا منت کر ڈالئے۔

کبھی کہیں مجھے شک ہوتا ہے کہ آپ جینیٹکس نہیں ہیں۔ یعنی اس طرح آپ کا اور بڑھئی کا علم ایک ہی سطح پر آ جاتا ہے۔ کیا آپ میں ایسے ریڈر موجود نہیں ہیں جو جینیٹکس کو سیاں بناتے بناتے لیڈر بن گئے اور کئی اپنی جینیٹکس کا شکار ہو کر خرطہ گھر کے بنجرے میں قید کر ڈالے گئے۔ اور اس بے بس میٹر کو دیکھنے کے لئے کئی لوگ آسنے لگے۔ حضرات! کیا یہ جینیٹکس نہیں ہے کہ چڑیا گھر کے مستحکم، بنجرے میں بند میٹر کو دکھانے کے لئے دس دس پیسے ٹکٹ لگا دیں اور اس واقعے کو تاریخ کی کتابوں میں شامل کر کے اسکولوں میں پڑھا دیا جائے۔

ملک و ملت کے پروانہ!

کہتے ہیں لیڈر پیدائشی ہوتا ہے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ میں نے ایک ڈپٹی کمشنر دیکھا جو سادھوں میں گیا۔ مجھے شک ہوا کہ ڈپٹی کمشنر دراصل پیدائشی سادھو تھا۔ چنانچہ اس کے سدس نے کئی پیدائشی ڈراما یور دیکھے، پیدائشی پہوان، پیدائشی صاحبان۔ اس لئے مجھے یقین ہو گیا کہ دنیا کی سرچیز پیدائشی ہوتی ہے۔ لیڈر بھی ضرور پیدائشی ہوتا ہوگا۔ یعنی اس کا پیدائشی ہونا کوئی سماجی حادثہ نہیں ہے چند دن ہوئے میں نے اخبار میں ایک مضمون پڑھا جو ایک لیڈر کے متعلق تھا کہ دو بچپن میں اپنی چھوٹی بہن کو خوب پیٹا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ مضمون میں اس چھوٹی بہن کا ذاتی بیان بھی درج کر دیا گیا تھا۔ افسوس کہ میں مضمون پڑھ کر متاثر نہیں ہو سکا، کیونکہ میرا خیال ہے کہ تانوسے فی صدی لڑکے چاہے بڑے ہو کر کلرک کیوں نہ بن جائیں اپنی چھوٹی بہنوں کو ضرور پیٹا کرتے ہیں۔

اس لئے حضرات! آپ یقینی کیجئے کہ آپ پیدائشی لیڈر ہیں مگر آپ میں سے کوئی اب بسکٹ فیکٹری کا بیکر بننا چاہے تو نہیں بن سکتا۔ کیونکہ قدرت نے بیکریوں کے لئے کچھ اور انسان ارسال کر رکھے ہیں۔ اس لئے اگر آپ بیکر کی جائے لیڈر بن گئے ہیں تو صرف اس لئے کہ بیکری کی صنعت کو بریادی سے بچانا مقصود تھا جناب والا! آپ فطرت کی ادھ پٹانگ طاقتوں کا شکار ہیں میں ایک

لیڈر بننے کے شگم چند جی کو جانتا ہوں جو سندھوستانی قوم کا لیڈر ہے۔ اگر فلسطین میں لیڈر بننا تو جہاں قوم فلسطینی قوم کے لیڈر کو اپنا مائے ناز سپوت کیسے مانتی جو سندھوستان کی بجائے فلسطین میں پیدا ہوا۔ دراصل حضرات! آپ سب بے شگم چند ہیں۔ اور معاف کیجئے آپ کی مٹی میں پلید ہے کہ آپ کبھی سندھوستان کے لیڈر بنائے جاتے ہیں۔ کبھی سپی کے کہیں اٹلی کے اور کبھی فرانس کے، ہر جگہ آپ کا نام بدل جاتا ہے، کام وہی رہتا ہے۔ لیکن اپنی قوم کو اٹھاتا اور دوسری قوم کو گرانہ۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس دنیا پر صرف درجن دو درجن بے شگم چند مصلط میں جو ایک دوسرے کو گرانے میں مصروف

رہتے ہیں۔

ایک مرتبہ کاؤکے کے چرنی کالج ہنگم چند فرانس کے بے شکم چند کے ساتھ ایک میز پر ڈنر کھاتے دیکھا گیا۔ ڈنر کے بعد دونوں نے مل کر فریڈ کھنیا یا، مل کر ایک ناچ دیکھا۔ ملکر تقریباً کس۔ دونوں ملکوں کے قومی نژاتے بجلے گئے۔ دونوں قوموں نے باہمیں کھنیاں بہپ بہپ ہرے کہا اور پھر باہمیں اور بہپ بہپ ہرے کی ایک فلم تیار کی گئی جو کئی مہینے چلتی رہی۔

لیکن چند سال بعد دنیا نے دیکھا کہ دونوں بے شکم لیڈروں نے ایک دوسرے کو دار تنگ دیدی، حملہ کر دیا۔ دونوں قومیں ایک دوسرے کا خون شیش کرنے لگیں حملے کی بنیاد یہ بنائی گئی کہ جرمنی کے بے شکم چند کی بیوی کو فرانس کے ایک دکاندار نے جرابیں بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔ جس پر جرمن قوم کی سوئی ہوئی خوار میں پیدا ہو گئی اور وہ غیرت قومی کی خاطر اس غیرت قومی کی خاطر جرابوں کی وجہ سے نشہ و خمار پا کر حملہ ہو رہی تھی، جرمنی کا بے شکم چند حملہ کرتا۔ تو اس قوم کی بے شکم چند کی جرابیں انکار کر تا رہا اور دہشت اور خود ا سے پھر بار بار کر ہلاک کر دیتی۔

لیڈر دوستو! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ میں سے ہر ایک کا اہتمام ختم سے ہلاک ہونا ہے یا خود کشی ہے۔ جو قوم آپ کی لاش کو تڑک ماحضام سے اٹھاتی ہے وہی قوم آپ کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا کرتی ہے۔ آپ میں سے کتنے افراد ہیں جو سمندر میں پھینکے جانے کے لئے تیار ہیں۔ یہی صرف اس لئے پوچھ رہا ہوں تاکہ میں آپ کی انفرادی آزادی کی حدود معلوم کر سکوں۔

انفرادی آزادی؟ — آہ حضرات۔ وہ آزادی جو آپ دوسروں کو دہانا چاہتے ہیں۔ خود اس سے محروم ہیں۔ مثلاً آپ وہل کے چاندنی چوک میں کھڑے ہو کر گول گئے نہیں کھا سکتے۔ دنیا آپ کو کھاتے دیکھ کر منہ میں انگلیاں دبائے گی وہ آپ کے ارد گرد کھنیاں ہر جا کی اور کہے گی۔

”بے شکم چند جی زندہ باد!“

”انقلاب تندرہ باد“

بھارت ماما کی ہے۔“

اور میر فوٹو خرافہ کلک کلک کرتے آگے بڑھیں گے۔ اور گول گے کے ساتھ آپ کا فوٹو کھینچ لیں گے۔ اور ممکن ہے، قوم آپ سے تقریباً مطالبہ بھی کرے۔ اور آپ گول گے کی ٹینٹل انڈسٹری کے مستقبل پر لکچر دے ٹالیں۔

پیارے بیڈر صاحبان! آپ آزادوں سے ایک گول گے پائیں نہیں کھا سکتے۔ حالانکہ گول گے پکا کھانا ایک عام سا معمولی فعل ہے۔ بالکل ایسا فعل جیسے درزی سے کوٹ سلانا۔ پبلک پارک میں بیٹھ کر سونگ بھیل کھانا۔ پنوارسی سے پان خریدنا۔ مگر آہ آپ ان میں سے ایک معمولی کام بھی آزادی سے نہیں کر سکتے۔

مجھے ہمیشہ رینشولٹس رہی ہے کہ لیڈروں نے اپنی انفرادی آزادی سے محروم ہونا کیوں پسند کر لیا۔ ممکن ہے، یہ بات آپ کے لئے تسکین دہ ہو کہ انفرادی آزادی کی قربانی رائیگاں نہیں جاتی (جیسا کہ ہر قربانی کی خصلت ہے) اور اس قربانی کے عوض قوم آپ کو بہت کچھ دیتی ہے مثلاً اگر آپ کو دکام ہو جائے تو روزانہ آپ کی صحت کے بیٹھن شائع کرتی ہے۔ آپ کی موٹر کے راستے میں مینڈیاں لگاتی ہے۔ تقریر کے وقت آپ کی میز پر پانی کا گلاس رکھ دیتی ہے۔ آپ کے خداداد فوٹو اپنے گھروں میں لٹکاتی ہے جس سے آرٹسٹوں اور فریم میکرز کا بزنس ترقی کرتا ہے۔

کبھی آپ نے سوچا کہ قوم یہ سب کچھ کیوں کرتی ہے۔ کہیں کہ اس سے ان کا بیڈر اپنے اصول پر ڈال رہا ہے۔ جناب بیڈر صاحبان! کسی دن آپ اپنے اصول کی خاطر بری قوم کی قوم کو بحر سندھ میں غرقاب کر سکتے ہیں۔ قوم سنہن خوسٹی غرقاب ہو جائے گی۔ لیکن اگر آپ نے پیپر کو رٹ کر دیا۔ تو آپ کو گولی مار دے گی۔ جناب عالی! قوم صرف آپ کی مصنوعی اور جھوٹی زندگی کو ہی پسند کرتی ہے۔

مجھے ایک ایسے بیڈر کے مستقبل معلوم ہے۔ جس نے مرنے سے چند برس پہلے مصنوعی زندگی ترک کر دی تھی۔ چنانچہ اس کی اسٹیج کے ساتھ صرف تین افراد

تھے۔ ایک اس کی بیوہ اور دوسرا ملحق اٹھانے والے اور وہ بھی گریہ کے مزدور۔
 اور چونکہ اسی روح اس کا گھر مل گیا تھا۔ جو صرف اپنی حیرت دور کرنے کے لئے ساتھ
 ہر لیا تھا۔ اس لئے لیڈر حضرات آپ اس "حادثہ" سے فائدہ اٹھائیے اور آخری
 سانس تک اپنے اصول سے نہ ہٹئے۔ تاکہ کم از کم ارٹھی قوجاہ و جلال کے ساتھ اٹھے
 آپ کی موت اور جاہ و جلال کی موت ایک ساتھ نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ جناب
 ارٹھی اٹھانے کے لئے گمراہی کے مزدور تو ہر ایک کو مل جاتے ہیں۔

اور رہنمایان قوم! آخر میں ایک بات کہہ کر اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ کہ
 آپ اپنی پہچان کے لئے کوئی نہ کوئی اسمبل ضرور بنانا چاہئے، اسمبل کوئی سا بھی ہو آپ
 سے وابستہ ہو کر وہ قومی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ مثلاً گیوں نہ آپ ہمیشہ اپنے
 ہاتھ میں ایک طوطا رکھیں۔ کہ جب بھی طوطے کا ذکر کیا جائے لوگ سر جھکا دیں
 طوطے کی بجائے آپ حق رکھ سکتے ہیں۔ بانس کا ڈنڈا رکھ سکتے ہیں۔ کئی لیڈر گئے
 ہوئے سر کو ہی اسمبل بنا لیتے ہیں۔ ایک اور لیڈر نے ٹخنوں تک کوٹ پہنا شروع کر دیا
 تھا۔ تو ٹیلر ماشروں کو لمبے کوڑوں کے لاکھوں آرڈر ملنا شروع ہو گئے تھے۔ ایک لیڈر
 نے سیاہ قمیص کو اپنا اسمبل بنا لیا تھا۔ جسے وہ مرتے دم تک نہیں اتار سکا کیونکہ قوم اسے
 کسی اور رنگ کی قمیص پہننے ہی نہیں دیتی تھی۔

بہر کیف صاحبان! اسمبل آپ کی بہتری کی بنیاد بنا سکتا ہے۔ اسے اسمبل موت
 بولئے۔ اپنے اصول کی طرح۔ کیونکہ لیڈر کا اصول بھی ایک قسم کا طوطا ہوتا ہے۔ گھٹا
 ہوا سرا بانس کا ڈنڈا، سیاہ قمیص، لمبا کوٹ — یہ سب چیزیں اگرچہ مضحکہ خیز لگتی ہیں
 لیکن کیا کیا جائے کہ قوموں کے نصیب میں صرف لیڈر ہی نہیں بلکہ ان کی مضحکہ
 خیزیاں بھی لکھی ہیں۔

بیالیسواں جہنم دن

پچھلے دنوں اجاب نے سازش کر کے میرا جہنم دن مٹا ڈالا۔ اس غیر ضروری تقریر پر مجھے بھی تقریر کرنے کے لئے کہا گیا۔ یہ میری زندگی پہلی تقریر تھی جو پسند کی گئی۔ اہل اس نے پسند کی گئی کہ یہ تحریر بھی تقریر تھی۔ تقریر یوں تھی۔

جناب صدر اور باقی ماندہ حضرات! آپ لوگ جو میرا جہنم دن مٹانے کے لئے جمع ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ بہت عظیم لوگ ہیں۔ یہ بات میں یقین سے کہہ رہا ہوں کیونکہ جو لوگ عظیم نہیں ہوتے وہ کبھی کسی کا جہنم دن نہیں مٹاتے جتنا کہ اپنا نہیں نہیں مٹاتے۔ ایسے لوگوں میں ایک صاحب نام خود مولیٰ تھے جو پچھلے دنوں راہی ملک عدم ہو گئے۔ انھوں نے مرتے دم تک اپنا جہنم دن نہیں مٹایا کیونکہ انھیں عمر بھر سچ ہی نہ چلا کہ وہ جہنم لے چکے ہیں۔

ابھی ابھی جو صاحب تقریر کر کے گئے ہیں، آپ ان کی باتوں پر قطعی اعتبار نہ کیجئے۔ وہ میرے گہرے دوست ہیں اور گہرے دوستوں کی یہی ٹریڈ پی ہے کہ وہ صرف تعریف و تحسین ہی کر سکتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک گہرے دوست سے میں نے کہہ دیا کہ تمھاری جرابوں سے سخت بدبو آ رہی ہے تو انھوں نے میرے خلاف تھاڑ میں رپورٹ لکھوا دی۔ حالانکہ بطور گہرے دوست کے میرا فرض تھا کہ ان کی جرابوں

کی تعریف کرتا۔ صاحب! بچائی اور دوستی میں اتنا بڑا فرق ہے کہ اسے مٹانا بنی آدم کے بس کا روگ نہیں۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ میرا بیالیسواں جنم دن ہے۔ بظاہر بیالیس کا ہندسہ ایک معمولی ہندسہ ہے۔ لیکن یہ ہندسہ مجھے نہایت تشریفناک غم میں ہو رہا ہے کیونکہ اس ہندسہ کا مطلب یہ ہے کہ میں اب بچہ نہیں رہا۔ جوان بھی نہیں رہا اور بڑھاپا ابھی بہت دور ہے۔ عمر کی عجیب منزل ہے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ نہ مصوم نہ افسردہ بزرگ۔ یہ عجیب بے بسی کی عمر ہے۔ مذہبی اصطلاح میں اسے عالم برزخ کہا جاتا ہے۔ جب خدا کسی روح کو نظروں سے گرا دیتا ہے تو اسے بیالیس سال میں پہنچا دیتا ہے۔

ذرا اندازہ فرمائیے کہ اب میں ستر عیسویں پر پاؤں جما جا کر رکھا کروں گا ڈاکٹر محمد سے کہا کریں گے کہ آلودہ کھانا کھانے کی تمیز نہیں گا مگر شرما تا میں رہوں گا۔ اور نیم سنجیدہ باتوں کے بارے میں سوچا کروں گا۔ مثلاً یہ کہ میں کیا ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں جاؤں گا اور کب جاؤں گا؟ اور جا کر جب مرٹاؤں گا تو چیونٹی بن کر یا مل بھٹی بن کر؟ دراصل صاحبان! آپ چیونٹی بن جائیں یا مل بھٹی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ انسان کا سب سے بڑا غم موت ہے اور موت ہم میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا۔ ہم سب کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ چاہے شکل چیونٹی کی ہو یا مل بھٹی کی۔ اور چونکہ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اس لئے ہم نے روح ایجاد کر ڈالی ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ روح ایک لامتناہی چیز ہے۔ کبھی نہیں مرنے والی۔ اور یہ اتنی چلیلی ہے کہ ایک چیونٹی کے اندر بھی سما جاتی ہے اور مل بھٹی کے اندر بھی۔ صاحب! روح کی ایجاد ہم انسانوں کا ایک لامتناہی کارنامہ ہے۔ جس پر خود خدا بھی سبکت حیران ہو گا!

مجھے خطرہ کہ میرا بیالیسواں جنم دن میرے ماضی کو فنا کے گھاٹ اتار رہا ہے اور اس کی بجائے میرے مستقبل کو جنم دے رہا ہے۔ اب میں ماضی کی قبر پر بیٹھ کر

مستقبل کی مجاہدہ میں کیا کروں گا۔ یہ ایک بڑی بے سنگم بات ہے کہ میں صرف مستقبل کا ہو کر رہ جاؤں۔ اپنی روح کا مستقبل، اپنے بچوں کا مستقبل، اپنی صحت کا مستقبل، نوع انسان کا مستقبل، مذہب، اخلاق اور راستی وغیرہ کا مستقبل صاحبانِ اربع کج تنبیہ آپ میرے ساتھ یہ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ ایک پریشان انسان کو کہیں مجبور کر رہے ہیں کہ وہ صبح چار بجے اٹھ کر سیر کر جایا کرے۔ پرسوں کی بات ہے لالہ گو بی نانہ جی ریشا رڈ ایڈوکیٹ میرے پاس آئے انہوں نے بڑی ذمہ داری کے ساتھ ٹھنڈا سانس بھرا اور کہنے لگے۔

”نکر صاحب! میں حیران ہوں کہ خدا جب ایک ہے تو یہ مختلف مذہبوں والے ایک کیوں نہیں ہو جاتے؟“

تو حضرات مجھے اس وقت شہر ہو گیا تھا کہ لوگ مجھے سنجیدہ سمجھنے لگے ہیں چنانچہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ کس درد و کرب کے ساتھ میں نے ریشا رڈ ایڈوکیٹ کے سامنے تسلیم کیا کہ ”میں آپ کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں۔“

ایڈوکیٹ صاحب کے جانے کے بعد میں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ کیا میرے جہنم کا مقصد یہ تھا کہ میں خدا کو ایک ثابت کروں؟ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کیا واقعی میرے جہنم کا کوئی مقصد تھا بھی؟ غالب شہر یہ ہے کہ مقصد ضرور ہو گا۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ مجھے پیدا کیا جاتا!

میں پر خیال خواہ مخواہ ”کرم فلاسفی“ کی طرف چلا جاتا ہے۔ نہ جانے یہ فیصلہ کیوں کیا گیا کہ مجھے ہندوستان میں جنم لینا چاہئے۔ ممکن ہے یہ فیصلہ میرے سابقہ کرموں نے کیا ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے سابقہ کرم کیا تھے۔ کیونکہ میرا حافظہ اتنا نہیں کہ پچھلے کرموں کو یاد رکھ سکوں۔ لیکن ایک عام اندازے کے مطابق وہ اچھے کرم ہوں گے کیونکہ سنا ہے کہ اچھے کرموں سے ہی انسانی چلا ملتا ہے۔ مجھے اپنے گم کے مرنے پر اکثر ترس آتا ہے کہ بے چارے کو بڑے کرموں سے مرغا بنا دیا اگرچہ کئی بار خیال بھی آتا ہے کہ مرغا مجھ سے بہتر زندگی گزار رہا ہے کیونکہ جب کسی بے گناہ کو پھانسی

کی سزا ملتی ہے تو میں ادا اس ہو جاتا ہوں۔ لیکن مرے پر اس پچاسی کا کوئی اثر نہیں پڑتا وہ بدستور مرے کے ساتھ دوماٹک ڈائلاگ بولتا رہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قانون مرے نے نہیں بنائے، جو قانون بنائے گا وہی ادا اس ہوگا۔

میں امید کرتا ہوں کہ مرغا موجودہ جنم میں ضرور اچھے کرم کرے گا۔ تاکہ اگلے جنم میں وہ انسان بنے اور کسی بے گناہ کو پچاسی دے اور پھر ادا اس ہو جائے۔ میرے پچھلے اچھے کرم کون سے ہوں گے؟ ممکن ہے جناب! میں نے پچھلے جنم میں کسی اندھے کو اپنی ایک آنکھ نکال کر دے دیا ہو۔ کسی کی قبر پر جا کر ڈیا جلا یا ہو۔ کسی دوسرے کے فائدے کی خاطر جیل کاٹی ہو۔ لیکن اس بار پوزیشن قطعی مختلف ہے اس جنم میں مجھے عینک لگوانی پڑی تھی بار نقاہت کے باعث بے ہوش بھی ہوا لیکن کے لئے کوئی تعین نہیں کیا ملا۔ حالانکہ ایک صاحب جو مشکل سے دستخط کر سکتے ہیں ہمیشہ پارکر میں لگائے رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان پین والے صاحب نے پچھلے جنم میں اپنی ایک بھی آنکھ کسی کو نہ دی ہوگی اور اندھے کو اندھا رہنے دیا ہوگا۔ اس لئے اسے اس جنم میں پارکر میں مل گیا۔ یہ اس نے دورانِ نشی کی بات کی۔ اگر کسی کو انسانیت جنم دیا جائے تو ساتھ ہی دورانِ نشی بھی دی جائے۔ صرف اچھے کرموں ہی سے پارکر میں نہیں ملتا۔ ممکن ہے میں نے پچھلے جنم میں کسی بدتماش امیر کی تعریف میں کوئی قصیدہ رقم کیا ہو۔ بدتماش کی تعریف کوئی احمق کرم نہیں ہے۔ بداحیرت ہوتی ہے کہ جب میرے کرم اچھے نہ تھے تو مجھے اتالی چولا کس بنا پر دیا گیا۔ حضرات! میں سڑ کی کرم تقیور کی کو چیلنج نہیں کر رہا۔ بلکہ صرف تقدیر کے جج کو گاہ کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے موجودہ جنم میں کسی زخمی چڑیا کو پانی نہیں پلایا۔ لہذا اگلے جنم میں اس کے بدلے مجھے صرف دستخط کرنا ہی سکھایا جائے اور سابقہ غلطی کو دہرایا جائے۔

میں نے بیالیس سال میں قاضی تجربات کئے ہیں۔ لیکن سب سے مکمل اور سب سے ناگوار تجربہ یہ تھا کہ انسان کو تنہائی نصیب نہیں۔ پیدا ہوتے ہی اس کی تنہائی چھین لی جاتی ہے۔ اس کی وجہ خدا ہے۔ یہ خدا کی مجبور دیا ہے یا جانے کیا ہے کہ اس

نے بیک وقت بہت سی چیزیں پیدا کر دی ہیں۔ مثلاً اس نے جھنجھنا پیدا کر دیا۔ جو آپ کے پیدا ہوتے ہی بجھنے لگتا ہے۔ آپ جھنجھنے سے الگ ہو گئے تو اچانک ایک بجلی کی آواز آتی۔ ”میاؤں!“ آپ میاؤں سے گمروں نے لگتے ہیں تو ایک رومال آگے بڑھتا ہے جو آپ کے منہ پر پونچھنے لگتا ہے۔ ایک بار مجھے یاد ہے کہ ثانی اچھو ہوا اور بولا۔ ”بھئی! بال کتر والو۔ ایک بار ایک کوڑا ٹھونگ مار کر مجھے زخمی کر گیا پھر ایک بار میں یتیم ہو گیا تو میری خالہ آدمکی اددیولی۔“ اب تو میرا بٹلیہ۔ میں مجھے بن مان کے ایک دن نہیں دیکھ سکتی۔ ”غرض پورے بیاسیس برس میں مجھے ایک پل بھی تنہائی نصیب نہیں ہوئی۔ جی کہ سوتے وقت جب میں قطعی تنہا ہوتا ہوں تو تنید میں کوئی دیو آجاتا ہے اور میری گردن مروڑنے لگتا ہے۔ کوئی پرہی آجاتی ہے جو مجھے اٹھا کر آسمان کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ ساری صورتِ حالات نہایت ناگوار ہے۔ دہانے لوگوں کو یہ کیوں معلوم ہو جاتا ہے کہ میں پیدا ہو چکا ہوں۔ ایک سائنسدان نے مجھے بتایا کہ دراصل یہ ایٹم کی فطرت ہے کہ جنہی ایک ایٹم پیدا ہوا، دوسرا ایٹم اس کا نقاب کر لے لگتا ہے۔ آپ انسان بن جاتے ہیں تو ننگے نہیں رہ سکتے لہذا پٹرا آپ کا نقاب کرتا ہے۔ پٹرے کا نقاب درزی کرتا ہے اور درزی کا نقاب اس کی بیوی کرتی ہے۔ بیوی کا نقاب اس کے بھوکے ننگے بچے کرتے ہیں۔ غرض ہر ایٹم دوسرے ایٹم کے نقاب میں ہے۔ صاحبان! میں آپ کو ساکنس کا سبق نہیں دے رہا بلکہ صرف اپنے ذاتی ایٹم کا دکھ بیان کر رہا ہوں کہ جتنائی کسی ایٹم کو نہیں ملتی۔ مجھے درزی کا بل دینے پر ہرگز اعزاز نہیں ہے۔ لیکن وہ درزی مجھے شرمی سناتا ہے جو تا شائستہ حرکت ہے۔ اگر درزی کے بچے کے پاس نیکر نہیں ہے تو یہ ٹیکسٹائل ملوں کا فرض ہے کہ اسے نیکر مہیا کریں۔ آخر بے نیکر بچے مجھے کیوں مجبور کرتے ہیں کہ ہمارے تن کی عریانی پر مضمون لکھوں۔

میں کہیں کہیں سوچتا ہوں اگر ایک ایٹم دوسرے ایٹم سے جدا ہو جائے تو کیا ہر ہر ایٹم اپنی الگ زندگی گزارنے لگے۔ جیسے قبر میں ہر مردہ الگ الگ پڑا رہتا ہے

بے نیکنہی کی الگ قبر پر میری مضمون نگاری کی الگ قبر ہو۔ اور ایک قبر دوسری قبر سے واسطہ نہ رکھے تو ہنگر آہ ایسا کبھی ہوتا نہیں اور تنہائی کبھی طبعی نہیں۔ میں نے کئی بار ہمالیہ پرست پر جا کر قیسوی بننے کا بھی ارادہ کیا لیکن شک ہے کہ وہاں خدا موجود ہو گا۔ اور تنہائی وہاں بھی نصیب نہیں ہوگی۔

اور زندگی میں دوسرا تلخ تجربہ مجھے یہ ہوا کہ موت آسان نہیں۔ حالانکہ بیاضی سال کے فوراً بعد موت کو جانا چاہیے۔

ایک بے ٹوہنگی بات ہے کہ ہر انسان کی موت کا وقت مقرر ہے۔ منطق اعتبار سے یہ غلط سمجھ ہے۔ مثلاً ماہرین عمر کی رائے ہے کہ پچاسی برس سے پہلے مجھے موت نہیں آئے گی۔ میری ماں دعا مانگا کرتی تھی کہ تم سو سال تک جیو۔ ایک صاحب کچھلے دس برسوں سے مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ اگر تم سگر ریٹ اور پان کا استعمال ترک کر دو تو تمقاری عمر لمبی ہو سکتی ہے مجھے یہ سب کچھ ایک بے لطف لالچ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بیا لیس برس زندہ نہ کریں تو جو کچھ دیکھ لیا ہے وہ کاتی ہے اب میری بیا لیس سال زندہ رہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ کیونکہ اگر میں زندہ رہا تو آئینہ بھی وہی دیکھوں گا۔ جو دیکھ چکا ہوں۔ آخر کوئی آدمی مجھ سے وعدہ کرے کہ وہ باقی عمر میں مجھے ایک ایسا مرغاد کھائے گا جو بانگ نہ دیتا ہو تو میں مزید بیا لیس سال زندہ رہنے کے لئے تیار ہوں۔ ورنہ لمبی عمر اس وقت بے سگر ریٹ کی طرح ہے جسے چنتے پینتے جیڑے ٹھک جاتے ہیں۔ دراصل لمبی عمر کی خواہش نے انسان کو بری طرح بھکا دیا ہے اور وہ غیر فطری حرکتیں کرتے کرتے زندگی کی غامض لذت سے محروم ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک صاحب لمبی عمر پانے کے لئے ہر روز صبح اڑھائی گھنٹے سیر کرتے ہیں۔ یعنی عمر کا خاصا حصہ سیر میں ضائع کئے جا رہے ہیں اور ایک اور صاحب عمر بھر پیدل چلتے رہے حالانکہ اگر وہ گھوڑے موٹر یا ریل پر سوار ہو کرتے تو زیادہ لذت اٹھاتے۔ ایک بڑے بوڑھے سے ملاقات ہوئی۔ فخر سے کہنے لگے۔ میں اب بھی داخوں سے کاٹھا ہوا دم توڑ سکتا ہوں۔ یعنی وہ صرف با دام کھانے کے لئے سو سال تک زندہ رہنا چاہتے ہیں

حالانکہ بادام اگر تیر سے نوڑے جائیں تو بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ ایک اور حساب
ہیں وہ خدمتِ خلق کے لئے زیادہ دیر تک زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ
اگر چار پانچ سال خدمتِ خلق کر لی جائے تو اس میں زیادہ لذت ہے تاکہ اس
کے بعد کسی اور آدمی کو خدمتِ خلق کا موقع دیا جائے۔

میرا خیال ہے یہ سب زندہ رہنے کی چال بازی ہیں اور انہیں چال بازیوں
کا نتیجہ ہے کہ موت آسان نہیں رہی۔ لوگ یا تو مرنے میں نہیں آتے یا جب مرنے
پر آتے ہیں تو آٹھ سال کا معصوم تجھ بھی مرنے پر آمادہ ہے جسے اتنا بھی علم نہیں ہوتا
کہ حسینہ کے ہونٹوں میں کشتی کیوں ہوتی ہے اور لیلیٰ بچوں کی شریچہ کیوں وجوہ
میں آئی تھی۔

اسی لئے حضرات! میری غرض یہ ہے کہ حسینہ کے لبوں کا اندازہ لگائے
کے بعد انسان کو مرنا چاہیے، لیکن اس بچہ کو نہیں مرننا چاہیے۔ جو ابھی اپنا نام لکھنے
کی لذت سے بھی آگاہ نہیں۔ اس کے علاوہ عمر کو لمبا کرنے کے جتنے طریقے ہیں انہیں
بزرگ کرنا چاہئے تاکہ زندگی میں آسان ہو جائے اور موت بھی حادثہ نہ رہے۔ لیکن
جب مجھے خیال آتا ہے کہ مجھے مزید قیدتالیس برس زندہ رہنا ہے تو جی چاہتا ہے کہ طب
مینا رہ جا کر جھپلا ٹنگ لگا دوں۔ لیکن اب تو دماغ بھی لوہے کا جنگلا لگا دیا ہے
لہذا میرا مرنا مشکل ہے، کیونکہ منہ سے جس کو راکھے سائیاں، مار کے نہ کھٹے۔

جناب صدر! ادھر حاضرین! اب میں اپنی تقریر ختم کرنے لگا ہوں۔ کیونکہ
معتنی باتیں میری پاس تھیں وہ سب ختم ہو چکی ہیں۔ یہ باتیں بیالیس سال کی زندگی
کا پتھر ہیں۔ آپ شاید چاہیں گے کہ میں کچھ اور فردی باتیں بھی کروں جن سے دنیا کو فائدہ
ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بھلی کئی نسلوں سے فردی
باتیں کہی جا رہی ہیں۔ لیکن دنیا کو ان سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ چونکہ رفاہ عام کی
عادت ہم اوسوں میں عام ہے۔ اس لئے آخر میں چند چیزوں کے بارے میں ضرور عرض
کروں گا کہ میرا کیا رد عمل ہے۔

مثال کے طور پر میں نے ان بیالیں برسوں میں محسوس کیا ہے کہ کوڑے کاٹیں گامیں کرنے میں جگہ سے اتنے بیوقوف نہیں ہوتے جتنے سمجھے جاتے ہیں۔ ادا کسی کسی کے باپ کی میراث نہیں۔ چنگے روشنی پر مرتے ہیں۔ لیکن انسان کی جان کھا جاتے ہیں۔ گیڈو کو معلوم ہے کہ شہر میں اس کے کھانے اور رہنے کا کوئی بندوبست نہیں۔ اور گائے اگر شہر کا یا کیکاٹ کر کے جنگلوں میں سکونت اختیار کر لے تو وہ بھی اتنی ہی خوفناک ہو سکتی ہے جتنا شیر اور بھیریا۔

صاحبان! ان بیالیں برسوں میں مجھے صرف ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔ بعض جانور انسان کے اتنے قریب کیوں آگئے ہیں۔ اور بعض جانور انسان سے اتنی دور کیوں چلے گئے ہیں۔ کیا ان میں اب بھی مفاہمت کی کوئی صورت نکل سکتی ہے یا دائمی ہجر ہے؟

کچھ اپنی کچھ پرانی

اپنے پہ کر رہا ہوں گماں ہل دھکا
سمجھا ہوں دلپذیر متاع مہنر کوہیں

گمشدگی تلاش

یہ اشتہار میں اپنے گمشدہ بھائی چنتا منی کے متعلق دے رہا ہوں موصوفہ ایک مرتبہ پہلے بھی گم ہو گئے تھے، لیکن اس وقت میں نے اشتہار نہیں دیا تھا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ موصوفہ خود وارا آدمی ہے۔ اس لئے اس نے عنبر درگمزمی میں چھپا لنگ۔ لگا دی ہوگی۔ لیکن چھپے دن وہ میل چکٹ پتلون کے ساتھ گھروٹ آیا اور نقیوں ہمارے چپکے آخر تر ہمارا ہی خون نقا کیوں نہ لوٹا خون نے جوش مارا ہو گا۔

ہمیشہ اجلی پتلون پہننے والا کب تک گھر سے باہر نہ سکتا تھا۔ خودی چاہے کتنی ہی بلند ہو جائے پتلون کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

مگر اس بار مجھے یقین ہے کہ موصوفہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ کیونکہ وہ گلو سے دو سو روپے اٹھا کرے گیا ہے۔ اس لئے اب اس کی رگوں میں ہمارا خون جو شش نہیں مارے گا۔ اشتہار دینے کی ایک اور وجہ والدہ محترمہ ہیں جو موصوفہ کو ابھی تک نادان لڑکا، اگر دان رہی ہیں، میں نے لاکھ کہا کہ مادرِ مہربان! چنتا منی اس سبب برس کا ہو چکا ہے نادان نہیں رہا۔ وہ چہرے ہرے سے بے گندھا دکھائی دینا ہے مگر اندر سے کافی کاسیاں ہو چکا ہے۔

مگر والدہ محترمہ جس نے اس گندھے کو جنم دیا اپنی تخلیق پر زیادہ مستند رائے رکھتی ہیں۔ اس نے مجھے طعنہ دیا۔

” دراصل تم چھوٹے مہربانی کی غیر حاضری میں ساری آبائی جائیداد کو تنہا ہڑپ کرنا چاہتے ہو۔“

ہمارا آبائی جائیداد دو مکروں والا ایک مکان ہے جو ہم نے گرائے پر لے رکھا ہے یا پھر والد محترم کے قبضہ میں ایک بھی کھاتا ہے جس میں درج ہے کہ ہمارے خاندان کے پاس ٹوڑھ سو ایکڑ زمین ہے جس پر آج کل ایک دریا بہہ رہا ہے، والد محترم غرضتہ گیارہ برس سے اس دریا کے سوکھنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

اگرچہ والدہ محترمہ کے طعن کی بنیادیں دریا بروٹھ چکی ہیں لیکن پھر بھی ایک فرمانبردار فرزند کے طور پر میں یہ اشتہار دینے پر مجبور ہوا ہوں۔

برادر عزیز چنتا منی کی تصویر مجھے نہیں مل سکی ورنہ اس اشتہار کے ساتھ ضرور چھپواتا۔ دراصل اس کے بھنے فوٹو تھے وہ اس نے اپنی ذاتاً فوٹو انٹیم کی مجبوباتوں میں بانٹ دیے تھے جو چھنے پر چنتا منی کی ہر محبوبہ نے حجاب دیا کہ اس کے پاس چنتا منی کی فوٹو تھی، وہ اس نے رسوائی کے خوف سے حجاب کر دی ہے، ایک محبوبہ تو اتنی صاف گو نکلی کہ اس نے تنک کر جواب دیا۔

” میں نے شادی ہونے ہی چنتا منی کی وہ فوٹو شادی منی اور آج کل بیٹوں میں اپنے خاندان کا فوٹو رکھتی ہوں۔“

چنانچہ فوٹو دستیاب نہ ہونے کے باعث مجبوراً میں اپنا ہی فوٹو اس اشتہار کے ساتھ شائع کر رہا ہوں، اس کے باوجود گم شدہ میرے مہربانی کو سمجھا جائے مجھے شبہ نہ

والد اور والدہ محترمہ دونوں کی متفقہ رائے ہے کہ چنتا منی کی ناک تم سے ملتی ہے، اس لئے پہچاننے میں آسانی رہے گی، ہمارے ناما مرحوم کی ناک بھی تم دونوں نواسوں سے ملتی تھی اور وہ بھی گھر سے بھاگ گئے تھے عجیب ناک ہے ناما کے وقت سے کٹ رہی ہے، یہ کہیں فوٹو میں میری ناک حاضری ہے، ناک کے علاوہ میرے چہرے اعضا ہیں وہ میرے ذاتی ہیں، برادر عزیز چنتا منی کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

برادر موصوف چنتا منی کے باقی خاک نقشہ کے متعلق پوزیشن یہ ہے کلاس کا رنگ بچپن میں دودھ کی طرح گورا تھا (ان دنوں وہ صرف ماں کا دودھ پیا کرتا تھا) لڑکپن میں وہ دودھ یا رنگ گندمی ہوتا گیا۔ کیونکہ اس نے گندم کھانا شروع کر دی تھی۔ جوان ہوتے ہی رنگ کا میلان سیاہی کی طرف ہو گیا۔ نہ جانے جوانی میں چوری چھپے اس نے کیا کھانا شروع کر دیا تھا۔ البتہ حب والد محترم اسے ہیبت تک قسم کی گالیاں اور بھکیاں دیا کرتے تو لمحہ بھر کے لئے اس کا رنگ ہلکا بھی پڑ جاتا تھا۔ گویا چنتا منی بڑا رنگا رنگ آدمی تھا (خدا اسے ہر رنگ میں خوش رکھے)

آنکھیں بڑی بڑی مگر گونگی قسم کی۔ جیسے کوئی حسینہ فیروز کے بیروہ ہو گئی ہو۔ کئی بار میں نے اسے مشورہ دیا۔

ارے بچکے! ان پر کال اسپتہ لگالے، بات سن جائے گی۔

مگر وہ نہیں مانتا۔ ایک بار میں نے اپنی بیوی کی آنکھ بچی کر اپنا چشمہ اسے دے بھی دیا۔ مگر وہ اس نے ایک دوست کو دے دیا۔ دوست نوازی میں تو دیکھ مثال تھا۔

والد محترم اسے دوست نوازی پر ہمیشہ جھڑی سے پٹیا کرتے تھے۔ اور اسے پٹائی کو وہ کمال صبر و شکر سے سہہ لیتا تھا۔ صبر و شکر میں بھی بے مثال تھا۔ والد محترم ہنریت فخر سے کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک ہی شریف اور صابر رٹا کا پیر کیا ہے اور وہ چنتا منی ہے۔ بزرگوں کے سامنے چوں تک نہیں کرتا۔ آہ اس کے بھاگنے کے بعد اب ان بزرگوں کی جھڑی کسی کام نہیں آ رہی

چنتا منی کی پٹائی ہر ایک دانہ ہے۔ ایک بار وہ جھپٹ کر کھڑا ایک لڑکی کو گھور رہا تھا۔ لڑکی مذکورہ نے جواباً ایک اینٹ دے دی۔ آخر چنتا منی نے اس شخصیت کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ مگر بعد میں اس کا مطالعہ نے اپنی سہیلیوں سے ذکر کر دیا تو بات پھیل گئی۔ اور اس ڈانڈے

علاج کا بل ایک دم یہ کہہ کر بڑھادیا کہ اسٹیٹ کا لازم زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

چنتا منی کے جسم کے باقی حصے صحیح سلامت ہیں۔ وہ ایک مضبوط الحشہ لہجہ ہے۔ غلک لہری اشاکر تین میل تک چل سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ اس وقت بھی کسی غلہ منڈی میں ہدیایا نکلے کا کام کر رہا ہو۔ اور منڈی کے بیوپاری اسے نہایت قلیل اجرت دے رہے ہوں۔ کیونکہ چنتا منی کو بھاؤ تاؤ کرنا نہیں آتا۔ اسے کچھ بھی نہیں آتا۔ سواکے خاموش رہنے کے۔ سواکے ستم سہنے کے۔ مگر میں بیوپاریوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ اس ستم بندی کا زیادہ استغصال نہ کریں ورنہ وہ ان کے ہاں سے بھی بھاگ جائے گا۔ کیونکہ بھاگنے کے لئے اس کے پاس پاؤں موجود ہیں چنتا منی کی زبان کام چیں کرتی پاؤں کام کرتے ہیں۔

چنتا منی جب گھر سے بھاگا تو اس کے تین پرصرت تین کپڑے تھے۔ ایک تیلون (جو میری بھتیجی) ایک دھاری دانتیں جس سے وہ بے حد نفرت کرتا تھا۔ مگر پھر بھی پہنے پھرتا تھا۔ اور ایک بنیان جو اس نے بڑے چاؤ سے خریدی تھی یہ بنیانی بھی ابھی والد صاحب بھی پہن لیا کرتے تھے چڑھیں فٹ نہیں آتی تھیں مگر وہ کہا کرتے تھے کہ اگر باپ اپنے بیٹے کا بنیان پہن لے تو دونوں کا محبت کا رشتہ استوار ہوتا ہے جس دن چنتا منی بھاگا، اس دن رشتہ استوار کرنے کی باری چنتا منی کی تھی اس لئے بنیان بھی ابھی اس کے بدن پر تھی (اور والد صاحب اس بنیان کے لئے زار و قطار روتے رہتے ہیں ابھی کہتے ہیں کاش: یہ بنیان میرے پاس ہوتی تو میں اسے آنکھوں سے لگا کر تکیں حاصل کر لیا۔

چنتا منی کیوں بھاگا؟ اس کے متعلق مورخین کی آراء میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ والد محترم یعنی ابوالچنتا منی کا خیال ہے کہ لڑکا شادی کا خواہش مند تھا مگر اسے دور و دراز تک شادی کے کوئی آثار نہ دکھائی نہیں دیتے تھے مگر عم الچنتا منی یعنی چچا جان اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ چنتا منی سے شادی سسٹم کے ہی خلاف تھا اور برہم چریہ میں یقین رکھتا تھا۔ اس کے

علاوہ وہ ایک دوسرا راہ بھی پر چکا مالک تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی دو بیٹیاں ابھی تک کمزاری میں ہیں۔ یعنی برہم چریہ کے لئے اس کے پاس ٹھوس وجہ موجود تھی۔ تیسرے مورخ اہم لچنتا مہی یعنی والدہ محترمہ کی رائے چچا جان کے کسی حلالک ملتی ہے صرف اس تسلیم کے ساتھ کہ بہو یعنی میری توجہ دے رہی ہے اسے یہاں سے فرار ہونے میں مدد دے گا ہے۔

خود بہو بھی اس قسم کی ایک الگ رائے رکھتی ہے۔ یعنی جو ساس کے اس کے الٹ۔

اشتہار دینے سے دو دن پہلے مورخین میں ایک خوفناک لفظ چنگ ہوئی تھی لے والد محترم پر الزام لگایا کہ آپ نے ہی چنتا مہی کو بگاڑ دیا تھا اور اسے ہمیشہ ہی کہا کرتے تھے کہ

”اسے محض ایک تک بڑے بھائی کے ٹکڑوں پر چنا ہے گا اپنے پاؤں پر کڑا ہوتا سیکھ“

اور اس طرح آپ نے وہ بھائیوں کے درمیان نفرت کی بیج عائلہ کر دی تھی۔ اس پر والدہ محترمہ میری مدد کو آئیں اور فرمیں۔

”اس بڑے کا شروع سے ہی یہی طریقہ رہا ہے۔ یہ جس بھی تھی کہ اس بڑے کے ساتھ تیس سال کا لڑکائی بڑھاپا تھا آئندہ بھی ایک ساتھ زندگی کاٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں، یہ سن کر ہماری بڑی بیٹی جو ایک اسکول کی اسٹیڈنٹ ہے اب اپنی حمایت پر تڑائی“

اور بول

چاچی بچا فرماتے ہیں کہ آج ڈیموکریسی کا زمانہ ہے ملک میں صنعتی ارتقاء ہو رہا ہے اس لئے پرانے طریقے مشترک خاندان کا ڈھانچہ قائم رکھنا درست ہے۔ ایک زوجہ ان کے کو مجبور کرنا کہ وہ مشترک کھیتے آج بڑے بیٹیوں میں رہے عاقبت نااندیشی ہے۔ چاچی ٹھیک کہتے ہیں۔ دلش کے ہر زوجہ ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہئے۔ اور میں تو کہتی ہوں چنتا مہی اس ملک کا پہلا بانی ہے جو قدامت کی زنجیر توڑنا شروع کیا گیا۔ ہپ ہپ ہرے۔

بڑی بہن ماڈرن ڈسین رکھتی ہے۔ وہ ماڈرن اور قدیم زمانے کے درمیان
 ٹنکی ہوئی اچھی تک کنواری بیٹی ہے۔ اور شاید وہ اسی طرح سائنٹفک بنیادوں
 پر پھر شادی نہ کرے۔ اگرچہ میں نے اس کا حکیہ کئی بار آنسوؤں سے بھیگا ہوا دیکھا
 ہے۔ مگر آنسوؤں کے باوجود وہ صنعتی ارتقا کا رامن نہیں چھوڑتی۔ اس نے کئی
 امیدواروں کے ساتھ منگنی کرنے سے اس نے انکار کر دیا کیونکہ وہ صنعتی ارتقا
 میں ادھر واقعین رکھتے تھے۔

بڑی بہن کی یہ بات سن کر والدہ مخمڑہ بھڑک اٹھیں اور دیوار کی طرف منہ
 کر کے بولیں۔

”یہ بہن ہے یا ڈائن! چار لفظ پڑھ گئی تو اپنے بھتیجا سے بیا کرنا چھوڑ بیٹھی۔“
 والدہ مخمڑہ نے یہ الفاظ اس احتیاط سے کہے تاکہ بڑی بہن کے کان میں
 نہ پڑیں کیونکہ بڑی بہن اپنی بیشتر تنخواہ کنبے پر خرچ کرتی ہیں۔ لیکن چھوٹی بہن شیطان
 ہے۔ اس نے یہ الفاظ بھی سن لئے۔ اور بول۔

”ماں! کیا بہن بھائی کی محبت کا شور مچائے جا رہی ہو۔ بہن کس سے محبت
 کرے؟ چٹا منی سے؟ جس نے فقوڑ کلاس میں میٹرک پاس کی تھی۔ میں کہتی ہوں
 یاد ہے وہ وقت جب چٹا منی کو کالج میں داخل کرنے کا سوال اٹھا تھا، تو اسی
 بڑی بہن نے ججاج بڑھ چڑھ کر اسے باغی ہیرو بنا رہی ہے اس کے کالج کا خرچہ
 اٹھانے کی شدید مخالفت کی تھی۔ اور تم نے بھی کہا تھا کہ اسے کریانہ
 کی دوکان کھول دو۔“

سہاری یہ بہن خود بھی میٹرک میں فیل ہو گئی تھی اور اب سلائی مشین کا کام سیکھ
 رہی ہے۔ مورخین کی اس جگہ کے بعد بیٹی بہن نے اعلان کر دیا کہ وہ چھوٹی بہن کے
 سلائی اسکول کی فیس ادا نہیں کرے گی۔ (لہذا اس کی فرور شادی کرادو)
 قارئین! مجھے امتحانی آنسوؤں سے کہ چٹا منی کی خاطر مجھے اپنے کنبہ کی اندر
 حالت ظاہر کرنا پڑی اور باعزت کنبے کے لئے یہ ڈوب مرث کا مقام ہے۔ لیکن

یہ رہا پس منظر دیئے بغیر خپنا منی کی تلاش ناممکن ہے، ہر کیفیت مردِ غلیب کے ان شدید اختلافات کی ترجمانیوں میں درون سے کہنا ناممکن ہے کہ خپنا منی کیوں بھاگتا؟ بیکاری، بیزاری، کنواریا، کندہ سنی، پٹائی، ڈیموکریسی، صنعتی ارتقاء، برہم چربی، قربانی، بے وقوفی۔ ان میں سے کوئی ایک وجہ بھی ہو سکتی ہے یا ساری وجہیں بھی ہو سکتی ہیں۔ شاید خپنا منی ان تمام وجہوں کو اپنے ذہن میں پالتا رہا۔ پالتا رہا اور اس دن یہ تمام وجہیں منزل مقصود کو پہنچ گئیں جب اچانک وہ دوسروں پہ اس کے ہاتھ لگ گئے۔

یہ دوسروں پہ میرے ایک دوست کی امانت تھی اور اب اس نے مجھ پر مفروضہ کر رکھا ہے۔

عزیز خپنا منی کی تلاش میں ہم نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، ریلوے اسٹیشنوں پر ڈھونڈا، جیل خانے چھلنے، جوئے خانوں میں گئے، فلم کمپنیوں سے پوچھا۔ میری ماں درختوں سے پوچھتی پھری، والد محرم نے مختلف ریل گاڑیوں پر سفر کیا۔ لیکن خپنا منی جیسے ایک خدا تھا کہ کہیں نہیں ملا۔

تھک ہار کر ہم نے حیو تشیوں اور نجومیوں کا رخ کیا، ایک نجومی نے بتایا کہ وہ مشرق کو گیا ہے دوسرے نے کہا، شمال کی طرف گیا ہے، ہم دونوں سمتوں میں گئے کیونکہ ہم نے دونوں کو نہیں ادا کی تھی، ایک اور حیو تشی نے بتایا کہ ایک کتابھی اس کے ساتھ ہے، ہم نے یہ بات بھی مان لی، کیونکہ ہمارے محل کا ایک کتابھی اسی دن سے غائب ہے، جس دن سے خپنا منی، نہ جلنے لگے کو کیا سوچتی کہ بھاگ گیا۔ حالانکہ اس محلے میں وہ بڑے تازہ و نفیم سے زندگی گزار رہا تھا، والد محرم کا خیال ہے کہ کتابھی وہاں جاؤ رہے۔ ضرور اس کے ساتھ گیا ہو گا، مگر چچا جان کا بیان ہے کہ کتے کو گھنٹی والے ذہر دیکر گھسیٹ لے گئے ہیں۔

ایک حیو تشی نے ہمیں ایک منتر پھونک کر دیا اور کہا کہ اسے آدھی رات کے بعد کسی قبرستان میں دفن کر آؤ، اس منتر کی طاقت سے خپنا منی گھنچا جا آئے گا

چنانچہ میں ایک ڈاکو کو ہرا کر قبرستان میں اس منتر کو دفن کر آیا اور بعض ڈاکو بڑے انسان دوست ہوتے ہیں، لیکن چنتا منی پر اس منتر کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بعد میں جبیر تیشی مذکور سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس منتر کے دو قسم کے اثر ہوتے ہیں۔

میرا ایک : بھگوان مضرط ہو کر گھر لوٹ آتا ہے۔

میرا دوسرا : بھگوان انگ آکر خود کشی کر لیتا ہے۔

شاید چنتا منی پر دوسرا اثر ہوا۔ مگر ہمارے چنتا منی ! تیار ہی ماں یہ مانتے پر تیار ہی نہیں ہوتی۔

ایک خدا میدہ پاگل عورت نے جس کے اندر کالی دیوی کا نوا اس ہے اور جو ہر منگھوار کو بال کھول کر کھینچتی ہے یہ بتایا کہ لڑکا زندہ ہے۔ مگر اس کے منی پر بوجھ ہے۔ اس بوجھ کا اتار کر دوا دہ کالی گتیا کو ہر روز کاے باجرہ کی روٹی اور سفید مکھن کی ٹکیہ کھلایا کرو۔ چنانچہ یہ حرام خور کتیا گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ہمارے بال گلہبرے اڑا رہی ہے۔ اور کھا کھا کے سارے محلہ پر بھونکتی رہتی ہے۔ مگر احتراماً کوئی زبان تک نہیں ہلاتا۔

استہار ختم کرنے سے پہلے ایک طوطے کا ذکر عالی ازدیجی نہیں رہے گا کہ ایک ماہر نجوم کی ہدایت پر ہم نے بازار سے ایک طوطا خریدا۔ آج کل گم شدہ گویوں کی داد دیتی زیادہ ہونے کے باعث طوطوں کا مبادی بے حد بڑھ گیا ہے۔ بلکہ اعلیٰ نسل کے طوطے قوت سے ہی نہیں بلکہ میں مل جاتے ہیں، اور صرف بچھڑا طوطے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ چنانچہ ہم نے پندرہ روپے میں ایک مجنوں قسم کا طوطا خریدا۔ اسے چھل اور میوے کھلا کھلا کر اڑانے کے قابل بنایا۔ اور پھر مندرجہ ذیل چھٹی پر اس ماہر نجوم نے پھر تک ماری اور طوطے کے گلے میں باندھ دی جیٹس یوں تھتی۔

اڈھا طوطے، کھا کر طوطے، دواہ رے تیرے بل بوتے

چنتا منی سے جا کر کہہ دے ارے سب ہیں روئے

تیرے سارے ہونے مواتے۔

ٹوٹے ہوئے خنجر میں سے جا کر فضا میں اڑا دیا اور مہمانی ہو کر گھر لوٹ آئے۔ گھر لوٹے تو
 ٹوٹا پھر گھر میں موجود ہم نے پوچھا: "میاں محمد! کیا ہوا؟"
 وہ بولا: "بپتہ کھاؤں، بپتہ کھاؤں۔"

ہم نے اس نابکار کو مزید بپتہ کھلانا مناسب نہ سمجھا اور تنگ آکر اس بے وقاف
 جانور کھامی ٹوٹا فرد درش کے ہاں آدھے دام پر واپس دے آئے۔

قارئین کرام، ہمارے یہ تمام کوششیں ظاہر کرتی ہیں کہ جتنا منی ہمیں کتنا عزیز ہے
 اس لئے ملک بھر کے تمام بہن بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اگر جتنا منی کو کہیں دیکھیں
 تو سیدھے ہمارے ہاں آئے آئیں، خدمت خلق کا تقاضہ تو یہ ہے کہ یہ کام مفت کیا
 جائے، لیکن زمانہ چونکہ صنعتی ارتقا کا ہے، اس لئے خدمت خلق کا تقاضا واجب
 معلوم نہیں ہوتا، لہذا ہم بطور مبالغہ کم قیمت دان ضرور پیش کریں گے، آئے جیتے
 کا کرایہ بھی دیں گے، بشرطیکہ سفر نفرد کلاس میں کیا جائے۔

اور جتنا منی خود اس اشتہار کو پڑھے تو گھر چلا آئے، میں یہ کہہ کر جتنا منی کو پریشان
 نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کی ماں بستر مرگ پر پڑی ہے، یا والد محترم نے کھانا پینا ترک کر کے کھا
 ہے۔ بہنیں یہاں سب خیریت ہے، سارے کنبہ کی حالت بدستور اچھی ہے، والد
 صاحب کو کھانا بدستور بختم ہو جاتا ہے، ماں بھی پڑوسنوں سے ہر روز ملتی ہے، اس
 لئے جتنا منی کو بے خوف ہو کر گھر آ جانا چاہئے تاکہ کم از کم ہم اس کا لائیتیا کو تو گھر سے
 باہر نکال سکیں۔ "جتنا منی جلدی آؤ بھیا! درتہ وہ اگر دو سو روپے سارے کے سارے
 خرچ ہو گئے تو تمہارے واپس آئے ہکا کوئی ٹاڈہ نہ رہے گا۔"

فکرتونسوی نے الیکشن لڑا

الیکشن ہار جانے کے بعد فکرتونسوی صاحب اچانک غائب ہو گئے ہیں۔ ان کی تم شنگ کے متعلق طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی ہیں، کوئی کہتا ہے دریا کے کنارے میں ڈوب کر مرے کسی نے کہا میں۔ :- انھیں بہالیہ کی طرف جگ ٹٹ بھاگتے ہوئے دیکھا تھا، ایک صاحب نے بتایا کہ وہ لاہور ٹرولر کے اسٹیشن پر بھیک مانگ رہے تھے اور زار و قطار روکھی رہے تھے۔

ایک قمر بن خواہ جب ان کا سامان قرن کرانے پہنچا تو تلاشی کے دوران ان کا ایک مضمون بھی ملا جو انھیں رسوا کرنے کے لئے ذیلی میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اچانک میرے بارے میں افواہ پھیل گئی کہ میں الیکشن لڑ رہا ہوں۔ یہ افواہ سن کر میرے سر پر میری بیوی کو مانتی نار بیجا، کافی ہادس میں میرے دو دوستوں نے ایک دوسرے کو زخمی کر دیا، ایک چور نے ٹیلیفون پر مجھ سے شکایت کی ہم تو تمہیں تلاشی سمجھ کر تھارے گھر فٹب نہیں لگاتے تھے۔ اب یہ الیکشن کے لئے روپیہ کہاں سے آگیا۔ میرے ایک محالعت امیدوار نے ایک ایرجینس ٹینک لائی کہ نکلے کے اس ماحول پہلے آدمی کو روکا جائے اور اگر نہ مائے تو اسے اغوا کر لیا جائے۔

در حقیقت ہمارے کہ جب ملک میں عام چناؤ کی جبر چاہی تو مجھے شرارت ہو چکی کہ مندر کے مہنت و تعمیر ڈاس کو چناؤ لڑنے پر اکسایا جائے کیونکہ ایک تو اس کے

پاس چڑھا دے کے ہزاروں روپے دا فریڈے تھے جنہیں ختم کرنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ٹوٹل مطالعہ ایک غمگینا رامائن اور بھجنوں کے سستے ایڈیشن والی کتاب سے آگے نہ بڑھا تھا۔ اسے کامیاب بنا کر میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مہاراجا پارمینٹری جمہوریت کس حد تک گر سکتی ہے۔ اس نے سیدے کہا: ”جنت جی ملک کی جمہوریت خطرے میں ہے، اسے بچانے کے لئے آپ چن ڈلیجئے!“

”جنت یولا“ یہی ہی ہے!“

”میں نے کہا“ یہی ہی کا کیا مطلب۔“

”مطلب یہ کہ آپ مجھے مشر مندہ کر رہے ہیں۔“

”مشر مندہ لڑو ڈر ہوں گے، آپ کھڑے تو ہو جائیے!“

”نہیں، آپ مجھ سے زیادہ قابل ہیں آپ کھڑے ہو جائیے!“

”مگر قابل آدمی کے پاس موٹر کار نہیں ہے۔“

”میری موٹر کار حاضر ہے۔“

”روپیہ بھی نہیں ہے!“

”بھگوان دے گا!“

”بھگوان کا انڈریس میرے پاس نہیں ہے۔“

”وہ تو میرے پاس ہے!“

”نہ آپ اور بھگوان مشورہ کر کے مجھے آگاہ کر دیجئے گا۔“

میں تو یوں مذاق میں ٹال کر چلا آیا لیکن دوسری شام کو سارے علاقے میں ایک خداداد پوسٹر چسپاں پایا گیا، کہ جنت رکھو ڈر اس اور اس کی دو ہزار چار سو بیس عقیقت مند تعلیمیتوں کی طرف سے مشری فکر تو نسوی کو امیکش میں کھڑا ہونے کی درجہ کی گئی جو انھوں نے منظور فرمائی ہے۔

کچھ لوگوں نے اسے مذاق سمجھا۔ میرے سسر نے میری بیوی کو مامتی تار بھیجا لیکن اس کے باوجود میری بیوی نے سارے محلے میں لڑو بانٹے۔ کیونکہ وہ بھی جنت رکھو ڈر

ماس کی چلی مٹی۔ جب اپنی بیوی اپنی ہفتوں کے مہس میں ہر توپ لٹیکل سوچے بوجھ بے معنی ہو جاتا ہے۔

جس دن کا غلامت نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ تھی مین صبح باغیچہ روم میں جا چھپا۔ لیکن میری بیوی اور احباب نے سہیل پر لیس سکونڈ کر بلا یا۔ اس کی بدد سے دروازہ توڑ کر مجھے باہر نکالا۔ باغیچہ روم کے باہر ایک دوست نے ایکشن خنڈ کے لئے اپیل جاری کر دی اور گیارہ روپے ملے دے دئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو ہزار روپے اکٹھے ہو گئے۔ جن میں پچانوے روپے نقد تھے اور باقی کے وعدے تھے۔ ان پچانوے روپوں میں تین ٹوٹ بچے ہوئے تھے۔

اس پر پراپیگنڈہ مشینری فوراً حرکت میں آ گئی اور دو ٹرڈوں میں کنوینٹیک کی گئی۔ ایک دوست نے کوئے میں لے جا کر کھلایا کہ کامیاب ہونے کے بعد مختار سے وزیر خیش کے چائس قاضی روشن ہیں۔ ایک جیونشی کو بلایا گیا۔ میں نے پانچ روپے لے کر زاکے بنایا کہ صنعت کے ستارے میں ایک کار اور کوٹھلی عداوت پیش ہوئی نظر آرہی ہے۔ ڈسیری اور زویونین کے پریڈیلرٹ سٹری نیت رام نے پانی ملا ہوا دودھ کا گلاس میرے منہ سے لگائے ہوئے کہا۔ ایکشن میں دودھ کا سارا خرچ میرے ذمے! ایک اور حصہ نے وعدہ کیا کہ ایکشن آفس کے لئے میری کوٹھلی حاضر ہے۔ یہ کہنے کے بعد وہ عداوت بھی نظر آئے۔

ان حوصلہ افزائیوں نے میرا ایمان مستزل کر دیا میرا خیال خنڈ کے ایکشن لڑنا مفرقہ کا کام نہیں۔ لیکن اب خیال آیا کہ صورت مفرقا ہی کو لڑنا چاہیے۔ ورنہ ڈیموکریسی خنڈ بگڑ دی کا شکار ہو جائے گی۔ اس لئے جوتی میں نے ہامی ابوری، عجیب، ایک عجیب سی احمد نڈا نڈا نیت بھر گئی، اور مشنڈے سے نوجوان نے جو رام ایلا میں راون کا پڑش ادا کیا کرتا تھا۔ مجھے پکڑ کر گندھے پر بٹھالیا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں رامائن کی سبنا ہوں اور ڈیموکریسی کا راون مجھے اغوا کر کے لے جا رہا ہے۔

دوسری رات کو احباب نے ایک امیر جنسی مٹینگ بلائی بچاس دوستوں
 نے وعدہ کیا تھا۔ لیکن صرت بچس شامل ہوئے، باقی بچس میں سے کوئی خود بھیجا
 گیا تھا۔ بس کی بیوی بھیگ گئی اور کسی کی بھینس! ایک لیڈی وکر جو ایک بار جو
 کے جرم میں گرفتار ہو چکی تھی اس مٹینگ میں شامل ہوئی۔ ایک لیڈی ڈاکٹر جو منلی
 پلاننگ اور اسقاط حمل دونوں کام ساتھ ساتھ کرتی تھی۔ میری مداح نکلی۔ الیکش
 کے ایک گھاگ ماہر شرعی بدلی چندھی نے اس مٹینگ کی رہنمائی کی۔ یہ صاحب
 چار بار الیکش لڑ چکے تھے۔ جن میں سے تین بار ہار گئے تھے۔ اور چوتھی بار ایک ٹکٹیکل
 غلطی کی وجہ سے کامیاب ہو گئے تھے۔ بدلی چندھی نے ہتھوپدیش سے لے کر
 دیوان چرکب تک کے حوالے دے کر بتایا کہ الیکش میں کس قسم کی حکمت
 عملیوں سے کام لینا چاہئے۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ ہر الیکشن پر میری جیب سے
 صرت بچس روپے خرچ ہوئے تھے باقی سبھی اخراجات دوشروں نے برداشت
 کئے تھے۔ اس انکشاف کا میری الیکشن مہم پر بہت برا اثر پڑا۔ کیونکہ کئی دوستوں
 نے اپنے وعدے کے روپے دینے سے انکار کر دیا کہ دوشروں برداشت کر سہ گے اور
 ایک دوست نے تو اپنے دیئے ہوئے پانچ روپوں کی دالسی کا مطالبہ بھی کر دیا۔
 اس ہائی پاور مٹینگ میں ایک الیکشن گیدی بنائی گئی۔ اس گیدی کو تمام اختیارات
 سونپ دیئے گئے کہ وہ جیسے چاہے الیکشن مہم چلائے۔ پوسٹر نکالے، نہ نکالے، جلسے
 کرے نہ نہ کرے، مخالفت کے جلسوں میں نگرہ بڑھلائے، جلوس نکالے، برائے پر
 مظاہرین حاصل کرے، اپنے امیدوار میں وہ خریاں تلاش کرے جو اس میں موجود
 نہ ہوں اور مخالفت امیدوار کے لئے وہ خریاں ایکاد کرے جو اس میں موجود نہ ہوں
 جعلی دوشروں کی الگ فہرست تیار کرے۔ جوے میں ستر یا فتنہ لیڈی وکر کو فنانس
 دوشروں کے محاذ کی انچارج بنا دیا گیا۔ میری ناکامی کی ایک اہم وجہ یہی جوئے باز
 عزت نفس۔ کیونکہ جس عورت کے پاس امی کنولیننگ کے لئے جاتی وہ منہ پھیر لیتی اور
 مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ عورتیں، عورتوں سے کتنی نفرت کرتی ہیں۔

جب میرے ایکشن کا پہلا پوسٹر نکلا تو کھلبلی مچ گئی کیونکہ وہ اشتہار نہیں تھا ایک ادب پارہ تھا۔ اس ادب پارے کو پانچ فی صدی لوگ سمجھے۔ بچاؤ کے فیصدی نہیں سمجھے۔ میری ضمانت ضبط ہونے کی ایک اور وجہ یہ پوسٹر بھی تھا۔ جس نے میرے دو ٹرڈوں کو پانچ اور پچاڑے میں بانٹ دیا اور دونوں نے مجھے دو سٹ نہیں دیا سمجھداروں نے اپنی سمجھ کے زعم میں اور نا سمجھوں نے "بے ادب" ہونے کے ناٹے! اور جن چند عورتوں نے مجھے دو سٹ دیا ان کی زبانی پتہ چلا کہ انہوں نے مجھ پر رحم کھا کر دو سٹ دیا۔ سچ مچ دنیا میں رحم دل انسان اب بھی موجود ہیں۔ میرا خاکہ اڑانے کے لئے نہیں بلکہ عاذاً مخالفت امیدوار نے بھی جوابی پوسٹر نکالا۔ جن میں مجھ پر کچھ الزامات لگائے۔ مثلاً۔

- ۱۔ سیا کورٹ پہنا ہوں۔
- ۲۔ میری بیانی ٹکڑو ہے
- ۳۔ میں نے محلے کے کتے کو زہر دیا اور دیا تھا۔
- ۴۔ میں نے مندر کی تعمیر کے لئے سواروپہ چننا نہیں دیا تھا۔
- ۵۔ میں دودھ میں ملاوٹ کا دھنس ہو کر بھی اپنے بچوں کو دودھ میں پانی ملا کر پلاتا تھا۔

جب یہ پوسٹر شائع ہوا تو سچاؤ کے فیصدی دو ٹرڈوں کی سمجھ میں آسانی سے آگیا اس پوسٹر نے ذہنی طور پر قریب قریب مجھے مغلوب کر دیا۔ غصے اور اضطراب سے نیند اڑ گئی۔ الزامات صحیح ضرور تھے۔ لیکن معیاری نہ تھے۔ احباب نے مجھے مجبور کیا کہ میں بھی مخالفت امیدوار پر جوابی الزامات لگاؤں۔ مثلاً یہ کہ اس نے مندر کے ہتھ خانے میں تاجائز شراب کی بھٹی چلا رکھی ہے۔ اس کے والد صاحب نالی تھے۔ اس کی موجودہ بیوی اعراضندہ ہے۔ اس کا دادا برٹش سرکار کا چیف تھا۔ میں سرکار کا چپراسی تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ الزامات میرے الزامات سے بھی گرے ہوئے تھے۔ میں نے دل ہی دل

میں فیصلہ کیا کہ الیکشن نہ رولوں گا اور ٹانگہ ٹانگہ چلاؤں گا۔ جب میں نے ہوجھا سے اس کا ذکر کیا تو وہ برلی : ”میں بھی تمہارے ساتھ ٹانگہ ٹانگہ چلوں گی“ میں نے ٹھنڈی آہ بہر کر کہا ۔

”تو محترمہ ! الیکشن لڑنا کیا برا ہے ؟“

نیسرے دن سہارا انتخابی جلسوں نکالا گیا۔ میرا انتخابی نشان مرغی تھا۔ ایک صاحب نے تجویز کیا کہ ایک سوا ایک مرغے خریدے جائیں۔ ہر مرغے کو بائیسکل کی گدی پر بٹھا کر ان کا جلسوں نکالا جائے۔ تجویز بہت اچھوتی تھی۔ لیکن کسی سنگم نے مرغان غائب کے مالکوں تک یہ اطلاع پہنچادی تو مارکیٹ میں مرغوں کا نرخ سات روپے سے دس روپے ہو گیا۔ بیوی نے پیش کش کی کہ میرے طلائی زیور بیچ کر مرغے خرید کر بیٹھے۔ میرا گلا بھرا آیا۔ قربانی کی یہ مثال صرف انقلاب قرائس میں ملتی ہے۔ انقلابی سپرٹ کے تحت ایک سوا ایک مرغوں کا جلسوں بڑے کمزور سے نکلا۔ ایک سوا ایک بائیسکلیں اور ان پر گدی نشین ایک سوا ایک مرغے اور انھیں سنبھالنے کے لئے ایک سوا ایک درکر۔ اس جلسوں پر مخالفوں نے تپتور اور حمایتیوں نے پھول برسائے جلسوں میں مرغ اور ان دونوں شامل ہوئے۔ جلسوں کے آگے آگے ٹکڑوں کوں کا ایک ٹیپ ریکارڈ براہ رنج رہا غفا اور عوام فقرے لگا رہے تھے۔

جیتے گا بھائی جیتے گا !

مرغے والا جیتے گا !!

جلسوں کے خاتمے پر معلوم ہوا کہ دس بائیسکلیں اور پندرہ مرغے غائب ہیں کچھ درکروں نے بتایا کہ چار پانچ مرغے تو مرغیوں کے چھپے بھاگ گئے۔ کچھ درکر جو بے ایمان تھے۔ جلسوں کے درمیان ہی سے کچھ بائیسکلیں بے کرکھک گیا۔

تین دن بعد مخالفت امیدوار نے بھی جلسوں نکالا۔ اس کا انتخابی نشان بھی تھا۔ انھوں نے بھی ایک سوا ایک بھینسوں کا جلسوں نکالا۔ عوام اس جلسوں میں بھی ہزاروں کی تعداد میں شامل ہوئے ان عوام کا کوئی اعتبار نہیں۔ مرغے اور بھینس دونوں سے

کیاں عقیدت رکھتے ہیں۔ عوام کے اس دو نظریے پر مبنی کتاب ہو گیا۔ صرف ایک بات اطمینان بخشنے کی کہ مخالفت کی آگہ بھینسیں غائب ہوئیں جن کی قیمت مرغوں سے سات سو گنا زیادہ تھی۔

اس کے بعد حلیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ امر تعجب خیز تھا کہ مرغوں کی طرح مغز رہیں بھی کرائے پر چل جاتے تھے۔ شاعر اور موسیقار ایک جیسے سے فارغ ہو کر دوسرے جیسے میں پہنچ جاتے۔ صرف امیدواروں کے نام بدل دیتے۔ مواد بھی رہنے دیتے۔ آرٹ اور آرٹسٹوں کی پے پیسہ پرستی "دیکھ کر گئی بار مجھے شرم آئی بولیں احباب" سمجھا یا کہ یہ صنعتی دود ہے۔ یہاں آرٹ بھی بازار کی جنس بن گیا ہے۔ ہدی، آلہ، ٹماٹر، انگر اور شکر۔ ان سب میں بھید بھاؤ مٹ گیا ہے۔

ہمارے حلقے میں چوبیس ہزار دو روٹ تھے۔ جن میں سے ڈھائی ہزار دو روٹ حلی تھے یعنی خدا کی طرح موجود تھے۔ لیکن نظر نہیں آتے تھے۔ ایک صاحب میرے پاس آئے اور بولے "ان ڈھائی ہزار دو روٹوں کا ٹھیکہ مجھے دے دیا جائے۔ ڈھائی ہزار روپے لے کر دوٹ بھگتاؤں گا، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایسا ہی ٹھیکہ مخالفت امیدوار سے بھی کر چکا ہے اور ڈھائی ہزار روپے لے چکا ہے۔ میں نے اسے یا کر شرمندہ کیا۔ لیکن وہ شرمندہ رہا اور کہنے لگا "شرمندگی کیسی؟ یہ تو بزنس ہے۔"

ایک ہزار دو روٹ رحلت فرما گئے تھے۔ جس سے مجھے بہت تسکین ہوئی کیونکہ دو روٹ جتنے بھی کم ہوں اتنی رحمت کم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر دو روٹ کے پاس جابا کر ہاتھ جوڑنا پڑتے ہیں۔ انیکشن کی اصطلاح میں اسے "ڈوٹڈ ڈور کنوینگ" یعنی درد کی خاک چھاننا کہتے ہیں۔ میں نے کئی ایسے دو روٹوں کے سامنے بھی ہاتھ جوڑے جو اندھے تھے۔ ایسے دو روٹوں کو اپنا مینی ٹیسٹو متا یا جبرہرے تھے۔ اس کنوینٹنگ میں محلے کے چھ معززین ہمارے ساتھ چلتے وہ مخالفت امیدوار کے ساتھ بھی چلا کرتے۔ ان میں سے ایک معزز نے مجھے کان میں بتایا کہ ہم صرف اخلاق اور تہذیب کی خاطر مخالفت امیدوار کے ساتھ جاتے ہیں۔ ورنہ ہم دوٹ آپ ہی کو دے دیں گے۔

اور ان میں سے اکثر معززین نے ہم دونوں میں سے کسی کو بھی دوش نہیں دیا۔ پرنسک کے دن یا تو وہ باہر چلے گئے یا ماش کھیلے رہے۔
 پرنسک سے دو دن پہلے سرگرمیاں کچھ زیادہ تیز ہو گئیں۔ مثلاً مخالفت امیدوار کے ایک خاص ایلچی نے رات کے دو بجے آرمیرا دروازہ کھٹکھٹایا۔
 میں نے پوچھا: ”کیا جانتے ہو؟“
 وہ بولا: ”آپ کا خیمہ!“
 میں نے کہا: ”ذرا وضاحت فرمائیے۔“

اور اس نے بطور وضاحت پانچ ہزار روپے کے نوٹ میری جیب میں ڈال دئے۔ میں نے کھلی کی طرح تبسم کیا اور کہا کہ نرخ بالا کن - وہ اداس ہو گیا بولا: ”مالک نے مجھے چھ ہزار روپے دئے ہیں - ایک ہزار میں نے بطور کمیشن رکھ لیا ہے۔“

میں نے زیریں کراپے کتے سے کہا: ”ان صاحب کو گھر چھوڑ آؤ۔“
 دوسرا انکشاف یہ ہوا کہ تمام سبزی خوردوں نے مندر میں جا کر قسم کھائی کہ مرغا ایک طرح کا ماش ہے۔ اس لئے کوئی سبزی خورد مرغے کو دوش نہ دے گا۔ لیکن مندر کے بیٹو بکاری نے بچاس روپے میں اپنا خیمہ بچتے ہوئے تباہ کیا کہ جب قسم کھائی تھی اس وقت بھگوان کی مورتی کو ٹھلایا نہیں گیا تھا اس لئے قسم کا قبول ہونا مشکوک ہے۔
 تیسرا انکشاف یہ ہوا کہ دوڑ کی کوئی ذاتی رائے نہیں ہوتی۔ بلکہ مختلف ذریعوں فرقوں، ذاتوں اور برادریوں کی رائے ہی اس کی رائے ہوتی ہے۔ نرکان برادری گوالا برادری جوڑے باز برادری، چٹھی مار برادری، بکوتر برادری، غوغن ان گنت برادریوں میں دوڑ حضرات کی تقسیم در تقسیم ہو چکی ہے۔ میں نے افراد کی بجائے برادریوں سے انتخاب کی کہ میں بھی آپ ہی کی برادری کا ممبر ہوں ممبر بنانے کے بعد انھوں نے وعدہ کیا کہ ہم آپ ہی کو دوش دیں گے۔ مخالفت امیدوار سے میں ایسا ہی برادرانہ وعدہ کیا گیا۔

اور سب سے آخری اور عظیم انکشافات یہ ہوا کہ جب پورنگ کے بعد دوڑوں کی
گنتی کی گئی تو میری بیوی کے سوا کسی کو یقینی نہ کیا کہ میری ضمانت حنبہ ہو گئی ہے۔ لیکن
مجھے برابر یہ شک رہا کہ میری بیوی نے بھی مجھے دودھ نہیں دیا۔ بد شہ سے نہیں
لا علی سے !!

وارنٹ گرفتاری

ایک دن میں رات کو گھروں کو راستہ میں ایک بیل گاڑی سے ٹکرا گیا۔ اور ایک
 کا فریم ٹوٹ گیا۔ جب یہ بتی کہ اس شام کو ایک ادنیٰ اجتماع میں وزیر ہندوئی امور
 نے مجھ سے کہا تھا کہ فکر صاحب! آپ سلطنت ادب کے کوہ نور ہیرے ہیں۔
 اور کوہ نور ہیرا فرط مسرت میں جب علیک کا فریم ٹوٹا تو بیل گاڑی سے ٹکرتے
 ہی کہا: ”آج آپ کے وارنٹ گرفتاری آئے تھے۔“
 منہ بچنے نے مارے خوف کے چٹختے ہوئے کہا: ”ڈیڑی کیا آپ اب جلی
 پٹے جاسیے گے؟“

سب سے چھوٹے بچے نے خوشی سے اعلان کیا: ”ڈیڑی، میں بھی آپ
 کے ساتھ چلوں گا۔“

پڑوسی رگھو رام میری آواز کی بوجھلے کر آگیا اور بولا: ”فکر صاحب!
 شاید سب سے پہلے کل بھی آئے گا۔ اس لئے گرفتاری سے بچنا چاہئے۔“

پڑوسی مادھو رام جس کی پڑوسی رگھو رام سے خاندانی دشمنی تھی۔ اس نے
 رگھو رام کی آواز کی بوجھلے کر بولا: ”فکر صاحب مشرعی آدمی ہیں۔ بچنے کی
 کوئی ضرورت نہیں۔ انہیں خود بخود کچھری میں حاضر ہو جانا چاہئے۔“

میں سر ہلچ کر سہیے گیا۔ یہ کان ہے کے وارنٹ گرفتاری تھے؛ کس جرم میں؟ میں

۱۲۔ اپنے غرضتہ چالیس سالہ جرائم پر نگاہ ڈالی تو صرف ایک جرم دکھائی دیا۔ جبکہ پندرہ برس کی عمر میں لائبریری سے میں نے ایک کتاب چرائی تھی (مگر آج کل تو میں اس لائبریری کی مشاوری کمیشن کا ممبر تھا)۔ میں نے بیوی سے پوچھا: "تم نے وارنٹ کی عبارت پڑھی تھی؟"

"ہاں" عدم ادائیگی قرضہ کے وارنٹ تھے۔

میری نے زندگی میں پہلی بار سچی بات کہی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ سچکڑوں بار کہہ چکی تھی کہ میں آپ سے سچی محبت کرتی ہوں۔ مگر مجھے اعتبار نہیں آتا تھا کیونکہ سچی محبت وہ صرف اپنی ماں سے کرتی تھی۔ میں نے سرکار سے سچ بچ ایک بار قرض لیا تھا اور واپس اس لئے نہیں کیا تھا، کیونکہ میرا خیال تھا کہ سرکار کے پاس مجھ سے زیادہ پیسہ ہے۔

لیکن سرکار نے سماجی انصاف کی خاطر میرے وارنٹ نکال دیئے۔ وارنٹ کا تصور ہمارے گھناؤنا ہونا ہے۔ گندی لگائی وارنٹ سے کم تو جین انگیز ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ غصہ مجھے پڑوسی دنگھورام پر آیا جسے یہ معلوم ہو گیا کہ سرکار مجھے ہتھکڑی لگانے آئی ہے۔ میں اسے دنگھورام کو اب اپنا ڈھنگہ پٹ استعمال کرنے کے لئے کبھی نہیں دوں گا)۔

دوسرا غصہ سرکار پر آیا۔ اس نے میرے وارنٹ کیوں نکال دیئے؟ کسی اور کے نکال دیتا کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ سرکار کے وزیر تہذیبی امور نے مجھے کوہ نور میرا کہا ہے۔ ایک طرف کوہ نور، دوسری طرف وارنٹ؟ ایک ہی آدمی کے بارے میں سرکار کی یہ ڈبل پالیسی کیوں ہے؟

اور پھر سرکار نے مجھے قرضہ ہی کیوں دیا تھا (صفیر نے کہا تم نے خود مانگا تھا) کیا سرکار کو معلوم نہیں تھا کہ میں لوٹا نہیں سکوں گا۔ اور پھر میں نے اکیلا نقد ڈے لیا تھا۔ ہزاروں مصیبت زدگان نے لیا تھا۔ سرکار کا فرض تھا کہ یہ قرضہ معاف کر دیتی، تاریخ میں تو یہ اکثر ہوتا آیا ہے کہ سلطنتوں کے اربوں روپے ڈوب جاتے

ہیں۔ بلکہ خود سلطنتیں ڈوب جاتی ہیں۔

رات بھر ڈر اور غصہ میں نیند نہ آئی اور میں سرکار، قانون، بیلیت، جی کہ گھر کے چھروں تک کو کوتاہی جو ہماری چینی کی پٹینیں توڑ جاتے ہیں، صبح کے قریب آئینہ لگی تو خواب میں والد صاحب نے درشن دے دیے اور کہا: "قرضہ چکا دو بیٹیا! کیوں باپ کا نام ڈوب رہے ہو۔"

جب آئینہ کھل تو سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ بیوی بچوں کے کمرہ دروازہ چلا جاؤں اور گھر کے دروازے پر پرچٹ چسپاں کر جاؤں۔

"نکر تو نسو! اپنے گناہوں کے پشچا تاپ کے لئے تیرے یا ترا پر گیا ہوا ہے۔"

لیکن - (۱) اگر سرکار نے فراری ملزم قرار دیا؟

(۲) اگر آج کمیونٹ بیلیت پھر آگیا؟

(۳) اگر کچھری میں خود بخود حاضر ہونے پر کلکٹر نے

جیل میں ڈال دیا؟

والد صاحب کی اس تجویز پر سخت افسوس ہوا کہ قرضہ چکا دو۔ آہ۔ آہ!

چنے گردی رکھ دوں؟ مگر نہیں۔ دنیا کی تو سے فی صد گھٹیاں گھنوں کو خاندان سے زیادہ

پیارا کرتی ہیں۔ بلکہ عین ممکن ہے، بیوی اسی پوائنٹ پر طلاق کی دھمکی دے ڈالے

— کیا کسی وکیل سے مشورہ کروں؟ مگر والد صاحب نے ایک بار نصیحت کی تھی

کہ بیٹیا! تو سے حکیم اور پورے وکیل کے پاس نہ جانا، دونوں لوگ بڑھا دیں گے۔

صرف ایک طریقہ باقی تھا کہ بغیر ناشنہ کئے گھر سے چلا جاؤں اور بیوی سے کہہ دوں

کہ بیلیت آئے تو اسے اطلاع دے دینا کہ ملزم سندھوستان چھوڑ کر ٹانگیا چلا گیا ہے

اور اس جہنم میں نہیں لوٹے گا۔

چنانچہ جلدی جلدی کپڑے بدلے، بیوی کو وصیت کی اور گھر سے باہر نکل گیا

راستہ میں جو آدمی بھی خاکی دروی پہنے گزرتا، میری طرف گھورتا، اور میں آنکھیں بند

کر کے اسے بل دیتا اور آگے بڑھ جاتا۔ اور اس سون سڑک پر نہ جانے کیوں؟ ہزاروں

بلیٹ وارنٹ لئے گھوم رہے تھے لیکن میں ان کے ہاتھ نہیں آیا۔ دن بھر کئی دوستوں
 وفتروں اور آشناؤں کے ہاں گیا (یہ سب میرے ٹانگہ نیکا تھے۔ اور آخر شام کو ایک
 ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا اور دوستوں سے گپ شپ لڑائے لگا۔

ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے بیٹھے یاد رکھتا ہوں کہ ایک پراسرار حشہیں
 ہماری میز کی طرف بڑھ رہا ہے۔ قریب آتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا: ”کیا آپ کا نام
 فکر تو نسوی ہے؟“

میں نے بڑے بہادرانہ لہجہ میں کہا (کبھی کبھی ڈر کی شدت میں انسان بہادر
 بھی بن جاتا ہے) ”نہیں صاحب! میرا نام رام گوپال ہے، البتہ فکر تو نسوی کو جانتا
 ضرور ہوں۔“

اب مجھے یقین آ گیا کہ یہ وہی کم بخت بلیٹ ہے جو ہمیں بدل کر آگیا ہے۔ سوچا
 اسے غلط ایڈریس بتا دوں، لیکن عذری میں کوئی غلط ایڈریس بھی نہیں سوچا اور کہہ دیا
 ”ٹانگہ نیکا چلے گئے ہیں؟“

شخص مذکور بالوس ہو کر چلا گیا، بعد میں ایک دوست نے بتایا کہ یہ ایڑیا کا رپورٹر
 میں ملازم تھا اور مختار امداد تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ ایک مداح خوا مخواہ میرے ہاتھوں
 بلیٹ بن گیا۔

شام کو چاندی کے قریب گھر لانا۔ اپنے پلان کی کامیابی پر نازاں، اپنی بزدلی
 پر شرمندہ، لیکن وارنٹ کے تصور سے بدستور ہراساں۔

جڑی گھر کی کنڈی کھانسی، بیوی نے اندر سے آواز دی کون ہے؟
 میں نے مذاق میں کہا: ”بلیٹ۔“

اندر ہی سے کڑخت لہجہ میں جواب آیا: ”مرا پھر آگیا۔“ اسی بلیٹ صاحب! تم
 سے تین بار کہہ چکی ہوں، فکر صاحب ٹانگہ نیکا گئے ہوئے ہیں؟

میں نے کہا: ”ڈارنگ! میں ٹانگہ نیکا سے واپس آگیا ہوں۔“

بیوی نے ڈارنگ کے لفظ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: ”ہاں ہاں ٹانگہ نیکا“

جو برا عظم افتراق میں ہے۔"

اس مرتبہ بیوی کی ہنرمندی بڑے حد پایا آگیا۔ میں پہلے سمجھا کرتا تھا فضول سی بیوی ہے، صورت نیچے پیدا کرنا جانتا ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ تو حفرانہ بھی جانتی ہے۔

میں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ کیونکہ ڈپلومٹیک بیوی سے مجھے ایک اور خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں میں دروازے پر ہی کھڑا رہ جاؤں اور وہ دروازہ ہی نہ کھولے اور حد سے زائد ہنرمندی میں مجھے پھپھانے سے ہی انکار کر دے۔ چنانچہ میں کھپلی طرف سے دیوار بچاند کر اندر آگئی میں داخل ہو گیا۔ "یہ کیا حرکت ہے؟"

عرصہ کیا۔ "جب فکر تو نسوی اور بلیٹ میں فرق مٹ جاتا ہے تو دیوار بچاند کر اندر آ جا پڑتا ہے۔ تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا؟"

"آپ نے کیوں کہا تھا کہ میں بلیٹ ہوں۔ وہ کم سببت آج تین مرتبہ آیا تھا مجھے خطرہ ہے کہ کہیں پھر نہ آ جائے۔"

نتیجہ پا گئی ہوئی ہے کیا؟ رولز کے مطابق اب میرے وارنٹ ڈانگنا نیکاسی جائیج بیوی بے اختیار سنیں پڑی، نیچے ہی سنیں پڑے۔ میں خود بھی کسی حد تک سنیں پڑا۔ لیکن دل کی پھلی تہوں میں کوئی بیٹھا کہہ رہا ہے۔

"اور اگر بلیٹ آگیا تو..."

اور دوسرے دن بلیٹ واقعی آگیا۔

میں برآمدے میں کرسی ڈالے اخبار پڑھ رہا تھا کہ اچانک کیا دیکھتا ہوں۔ بلیٹ میری کرسی کے عین پیچھے کھڑا تھا۔ دماغ نے کہا "اگر یہ بلیٹ ہے بھی، تو کبھی سمجھو کہ بلیٹ نہیں ہے۔ تم اخبار پڑھتے رہو۔"

بلیٹ نے کہا "جواب..."

میں نے اخلاقی کہا "کون ہو کیا چاہتے ہو؟"

”جناب! کیا فکر تو نسوی صاحب آپ کا اسم گرامی ہے؟“
 ”میرا خیال ہے، پہلے آپ بتائیے کہ آپ کا اسم گرامی کیا ہے؟“

”میں سرکاری سلیفٹ ہوں۔“

”تو پھر میں فکر تو نسوی نہیں ہوں۔“

سلیفٹ مسکرا دیا (کتنی خوفناک مسکراہٹ تھی ظالم کی) چند سکنڈز تک مجھے
 گھورتا رہا اور جب تک وہ گھورتا رہا میں دل ہی دل میں گائیٹری منسٹر کا جواب کرتا رہا
 آخر کار وہ بولا: ”جناب! آپ مذاق کر رہے ہیں، کیونکہ آپ مزاح لگا رہے ہیں نا؟“
 مگر عرض یہ ہے کہ میں نے آپ کا فوٹر ایک رسالہ میں دیکھا تھا۔ جس کے نیچے فکر
 تو نسوی لکھا تھا۔“

”وہ پرنٹنگ کی غلطی ہوگی۔“

”ایک بار ایک مشاعرہ میں آپ کو نظم پڑھتے بھی دیکھا تھا۔“

”وہ مشاعرہ والوں کی غلطی ہوگی۔“

”اور آپ کے بڑے بھائی رگھو رام نے بھی مجھے اکہل اکہلی بتایا ہے کہ وہ سامنے
 کرسی پر فکر تو نسوی صاحب ہی بیٹھے ہیں۔“

اب میں نے گائیٹری منسٹر ٹھکانہ کر دیا، اس زمانے میں گائیٹری منسٹر میں بھی
 جان نہیں رہی۔ چنانچہ گائیٹری منسٹر کی بجائے میں نے خاندانی مشافقت کا سہارا
 لیا اور لکھتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ، کہا: ”اچھا چلو، مذاق ختم، بتاؤ کیا چاہتے
 ہو؟“

آپ کو تحصیلدار صاحب نے عدالت میں بلایا ہے آپ کے وارنٹ
 گرفتاری میں؟“

آہ! یہی وہ غلیظ فقرہ تھا، جسے میں سننا نہیں چاہتا تھا، اخبار ایک طرف
 رکھ کر میں نے وارنٹ گرفتاری اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسے خواہ مخواہ پڑھنا
 شروع کیا۔ وارنٹ پر وہی روایتی توہین انگیز عبارت تھی جو

” ہر گاہ کہ مسمیٰ فکر تو نسوی ولد قات پیشہ
 سکتے۔ ویدہ دانستہ عدالت میں حاضر ہونے سے گریز کر رہا ہے، لہذا البتہ عدم
 ادائیگی قرضہ مجرم سرکار عالیہ ۹۵۰ء مسمیٰ مذکور کے وارنٹ گرفتاری جاری کئے جاتے
 ہیں کہ ملزم کو گرفتار کر کے یہ عدالت تختہ تسلیم دار صاحب مورخہ تک پیش
 کیا جائے.....“

دستخط

مہر عدالت“

میں نے محسوس کیا کہ میرے بڑی بچے کھڑکیوں میں کھڑے مجھے حجاب تک رہے
 ہیں۔ ادھر ادھر کی کھڑکیوں سے دوچار پڑوسیوں کے منہ سے چہرے بھی حجاب نکلتے
 دکھائی دے گئے۔

پہلے میں نے سوچا کہ بلیٹ سے کہوں، وارنٹ کی عبارت ٹھیک کر اگر
 لاؤ کیونکہ ادنیٰ اعتبار سے اس میں کمی مستقیم ہیں۔ لیکن بلیٹ نے مجھ سے پہلے
 کہہ دیا۔

”تو چلے جناب“

میں نے کہا: ”یغزو چلتا ہوں، نقوٹا سا سوچ لوں۔“

دنگھورام پڑوسی ہماری باتوں کا لطف اٹھانے کے لئے ہمارے پاس آ گیا
 ”کیسے!“۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ لیکن وہ اسے بہادروی جنانے کے بعد میں
 بولا: ”کیا بات ہے فکر صاحب!“

میں نے کہا: ”کچھ نہیں، ان صاحب کی ایک بھینس گم ہو گئی ہے۔ پوچھ رہے
 ہیں، ہمارے گھر تو نہیں آئی!“

دنگھورام بولا: ”معمولی بات ہے، مجھ پر تھوڑا دیکھئے۔ بھائی صاحب
 ذرا ادھر میری بات تو سنئے۔“

وہ بھائی صاحب کو ایک طرف کمرے میں لے گیا اور کھڑکے پر کمرے لگا۔ شاید

اسے بڑکارا تھا کہ تم فکر تو منوی کو ضرور گرفتار کر کے لے جاؤ۔ درجن ہتھارہا دھڑلہ مٹا کر دوں گا۔۔۔۔۔ مگر بلیٹ مسلسل انکار میں سر مل رہا تھا۔ اتنے میں رگھورام میرے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا: ”اجی دور رو پے دے دوسلے کو ٹل جائے گا۔“
 میں اصولی طور پر رشوت کے خلاف ہوں، لیکن سوچا کہ یہ کارآمد اصول کسی اور بہتر وقت کے لئے استعمال کروں گا۔ لہذا جھٹ دور رو پے نکال کر رگھورام کی سہیلی میں تنہا دیئے، رگھورام نے بلیٹ کے صبروں کے افلاس زدہ چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

بلیٹ نے حقارت سے زمین پر نفوس کر کہا۔ ”اجی! کیا آپ مجھے رشوت خور سمجھتے ہیں؟“

میں نے جو تیسرا رویہ دینے کے لئے جیب سے نکالا تھا، ڈر کے مارا واپس جیب میں ڈال لیا، (پتے اور ایماندار آدمی کے کبھی کبھی کتنا ڈراتا ہے؟)۔
 رگھورام نے بھی تکنیک بدل لی، بولا: ”بلیٹ! کیا تم جانتے ہو فکر صاحب بہت بڑے ادا سب ہیں؟“

میں نے بغیر سوچے سمجھے کہا، ”میں رگھورام سے اتفاق کرتا ہوں۔“
 بلیٹ نے جواب دیا: ”ہاں۔ میں ان کا مداح ہوں، لیکن سرکار کا نوکر بھی ہوں اور یہ میری نوکری کا سراں ہے۔“

بلیٹ کی مدلل صند نے بھی بے بس کر دیا۔ اب مجھے بلیٹ پر نہیں سرکار پر غصہ آ رہا تھا۔ یہ کہیں سرکار ہے جس کا بلیٹ اور کلچرل منشر وہ دونوں میرے مداح ہیں مگر مجھے گرفتاری سے نہیں بچا سکتے۔ ایسی سرکار کا کیا فائدہ؟ ایسی سرکار کو بدل دینا چاہئے ایسی سرکار مردہ باد!۔ انقلاب زندہ باد!!

نفوذی دہا ایک خوفناک خاموشی طاری رہی۔
 اور پھر میں بغیر سوچے ایک طرف چلنے لگا۔
 بلیٹ بھی میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

میرے رومال سے ناگ صاف کیا۔

بلیٹ نے بھی ایسا ناگ صاف کیا۔

بلیٹ میرا نقاب کیوں کر رہا ہے۔ بلیٹ مجھے چور سمجھتا ہے۔ یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ مجھے پیادوں کی طرح گرفتار ہو جانا چاہیے۔ میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ بلیٹ نے کہا۔ ”جناب! چلئے، اب کوئی مزید بہانہ صفت سوچئے۔“

”ہے : بہانہ کیا ہے؟“ میں اگر گلیا۔ ”میں تمہارے وارنٹ سارنٹ سے نہیں ڈرتا۔ اور ابھی کپڑے بدل کر تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

”سڑاب آپ کپڑے بھی نہیں بدل سکتے آپ جانتے ہیں کہ مجھے ہتھکڑی لگانے کے اختیار دست بھی ہیں۔“

جی چاہا، بلیٹ کے منہ پر طمانچہ خبر دوں لیکن مداح سمجھ کر رک گیا۔ تو وہی ہتھکڑی جیل انٹیلیڈار۔ سبھی بھرتوں کی طرح میرے ارد گرد ناچنے لگے اور جیسے کوئی انصاف خراب دیکھتے وقت آدمی بول نہیں سکتا، میری زبان بند ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ کٹھن کی میں جھانکنی ہوئی ممبری ہوئی نے ایک دردناک چیخ ماری ہے۔ شاید زمین پر گر کر بیہوش بھی ہو گئی ہو۔ (کبھی کبھی ان بیویوں کو خاندانوں پر بے ساختہ پیارا جاتا ہے)

آخری نوٹ : اس کے بعد کہانی ہنسایت معمولی ہے کہ مصنف عدالت میں چلا گیا اور فوراً ہی رہا کر دیا گیا۔ لیکن مصنف اس ڈسپچ کلرک کا ہمیشہ ممنون رہا جسکی ذرا سی غلطی سے اس کے وارنٹ جاری ہو گئے، کیونکہ اگر کلاک غلطی نہ کرتا تو مصنف اتنی خوبصورت کہانی نہیں لکھ سکتا تھا۔

بیویوں کی ٹریڈیونین

چند دن ہوئے میں رات کو جیب گھر بیٹھا۔ اور مردانہ وراثت کے مطابق دیر سے
روٹا تو کھا دیکھتا ہوں کہ میری پہلی اور آخری بیگم نے اپنے گورے گورے کندھے پر ایک
سیاہ بڈ لگا رکھا ہے۔

میں نے عرض کیا "یہ کیا ہے حضور؟"

وہ بولا "تھنڈا اور پخا ہے ہمارا"

میرا اتفاقاً تھا کہ آج وال میں کال ہے۔ چاند سا چہرہ جو کل تک رشک تھا
تھا، آج کسی اکھن خدام وطن کا پوسٹر معلوم دے رہا تھا جس پر تحریر تھا ہے
"اٹھو، مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کایخ امراء کے درو دیوار ہلا دو"

میں نے کچھ مسکرا کر اور کچھ ڈر کر کہا "اے انقلاب زندہ باد! کھاتے آؤ"

وہ اپنی سٹروں باہنوں کو کسی تھنڈے کی طرح ہرا کر بولی "آج کھانا نہیں ملے گا"

آج چولہا ڈکڑن اسٹرا میک ہے۔"

شب یقین میں بدلتے لگا کہ معاملہ گمبیر ہے اور اب بیگم کے ساتھ روٹا ٹک گفٹ کرنا
مغفول ہے۔ یہ کس قسم گرنے لگے پانقلابی تھا پامارا ہے کہ آج مؤثرہ کی آنکھوں میں کاہن
کی خمری کی بجائے مطالبات کا چارٹ دکھائی دیتا ہے۔ معاملے کی سبیدگی کو دیکھ کر میں نے

بھئی اچانک دل لہجہ بدل دیا اور مالکانہ وقار کے ساتھ کہا: ”بیگم تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم میری بیوی ہو۔“

ترشاق سے جواب آیا۔ ”اں مگر میں ایک وکر بھی ہوں اور آپ میرے مالک ہیں اور میری محنت کا استحصال کرتے ہیں۔“

”مگر ڈارلنگ!“ میں نے پھر اپنا لہجہ بدل لیا۔ ”مالک تو تم ہو، میرے دل و جان کی مالک، اس سلطنت کی تم ذاب و اجدعلیٰ شاہ ہو۔ تباہ ہو کہ نہیں؟“

ایک دن پہلے تک میرا یہی فقرہ طلسم ہوشربا کا کام کر جاتا تھا۔ اور سچم ٹرپ کر میرے بازوؤں میں اگر لٹی تھتی۔ لیکن آج آغوش میں آنے کی بجائے اس نے اپنی نرم دناڑک سمٹھی دکھائی اور میز پر راتے ہوئے بولی: ”سیٹھ جی! لیجئے دار لفظوں کے یہ جھلاوے اب نہیں چلیں گے۔ صدیوں سے ظلم کی چکی میں پسٹی ہوئی بیویاں اب بیدار ہو چکی ہیں۔ اور اب تم اپنے حقوق منوا کر دم لیں گی اور۔۔۔“

جو ہم سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا۔“

میں نے کہا: ”کیا آج ہمارے گھر میں کوئی لڑکی پسند شاعر آیا تھا؟“

وہ بولی: ”شاعر میرے اندر سویا ہوا تھا۔ آج جاگ اٹھا ہے۔ لہذا میرے

مطالبات لئے نہیں تو۔۔۔“

”کوئی سے مطالبات“

”سب سے پہلے بیگم نے حلق میں ٹھوک نکلتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں گھنگرول کی مائوس جھبکا رہیں تھیں۔ بلکہ طبل جنگ کی سی گھن گرج تھتی۔“ سب سے پہلے میرا مطالبہ یہ ہے کہ میرے کام کے اوقات گھٹائے جائیں، صبح پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرنی ہوں، انہیں کم کر کے نو گھنٹے کے ٹھہرائیں۔ ہر مذہب سماج میں یہی دستور ہے۔“

مگر ڈارلنگ یہ تو سہو و شافی سماج ہے۔“

وہ پھر کہی: ”اور بانی دی و سے جب تک مطالبات کی گفتگو جاری رہے

آپ مجھے ڈارلنگ کے لقب سے مخاطب نہ کریں۔ میں تو مہندوستانی سماج کو مذہب بنانے کے لئے تو گھنٹے کے اوقات آپ کو منظور ہیں ؟

میں نے کہا "دیکھو ڈارلنگ نہیں، اور کریسمس گھر میں اگر صرف نو گھنٹے کام ہوا تو اس سے پروڈکشن برابر افریڑے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کام کی دو شفٹیں کرنا پڑیں گی۔ دو شفٹیں اور دو میریاں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اس گھر میں دو سری میری لے آؤں ؟"

سوکن کا جیلا پا عورت کی نازک رگ ہے۔ میں نے اس رگ پر جان بوجھ کر انگلی رکھ دی کہ ٹرنڈیوین کے اندر منتشر پیدا ہوئے مگر بیگم کے اندر جیسے وہ قدیم حاسد عورت مڑ چکی تھی۔ وہ بولی۔ "یہ مالک کی اپنی پرائیم ہے۔ آپ چاہیں تو کوئی ملازمہ رکھ سکتے ہیں۔"

بیگم سوکن والے پہلو سے صاف بچ کر نکل گئی۔ اس کی یہ چترائی میرے لئے پریشان کن تھی۔ چنانچہ میں نے ایک اور سہیوار نکالا۔ "مگر اسے تنخواہ کہاں سے دیں گے؟ جلتی تنخواہ ملتی ہے۔ قہارے گورے گورے ہاتھوں پر لا کر رکھ دیتا ہوں۔ تم چاہو تو اس تنخواہ میں سے ملازمہ رکھ سکتی ہو۔"

"اس تنخواہ میں ملازمہ نہیں رکھی جاسکتی۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"میں نے کہا نا؟ یہ مالک کی اپنی پرائیم ہے اسے خرد سوچنا چاہیے؟"

"آل رائٹ۔" میں نے تنگ کر کہا۔ "مینجمنٹ اس پر بعد روانہ ہو کرے گا اب اگلا مطالبہ پیش کیا جائے۔"

"دوسرا مطالبہ جھپٹیوں کا ہے۔"

"مستقل جھپٹی کا؟ اس کی تو میں کسی بار پیش کر چکا ہوں۔ مگر ہر بار تم نے

اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔"

"دیکھیے آپ اسے مذاق میں مانتا لے، حالانکہ اللہ قسم! یہ مذاق بالکل

نہیں تھا، ہندوستان بھر کے سارے کامنگاروں کو انوار کی ہفتہ وار چھٹی ملتی ہے مگر مجھے انوار کو سب سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر انوار کتاب کے احباب کو دیکھتے ہیں۔ کوئی بچ کھلے اور کوئی ڈنڈا کوئی یوں ہی گھومتے گھومتے چلے جیسے آٹھنٹا ہے۔ دیوانی، دوسرہ، علید، بقرعید کوئی چھٹی بھی تو نہیں ملتی ہے۔ نہ منڈیکل چھٹی نہ زائیر حبشی چھٹی۔ کھیلانی کوئی زندگی ہے؟ یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں بھی رونا چاہتا تھا مگر منجھنٹ میں رونے کا رواج نہیں تھا۔ مطالبہ (عذا جھوٹ نہ بلوائے) بالکل جائز تھا۔ لیکن منجھنٹ کا رویہ بھی اس کے متعلق بڑا واضح تھا کہ کسی بھی مطالبے کو جائز قرار نہ دیا جائے۔ بلکہ اگر مطالبہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو اسے اس کی بجائے احسان کا درجہ دیا جائے۔ چنانچہ میں نے کہا: "دیکھو بیگم! عورت ذات کی تاریخ تو اسے کہ اسے موت سے پہلے چھٹی نہیں ملتی۔"

"لیکن میں تاریخ کا دھارا موڑنا چاہتی ہوں۔"

"میری پیری شہلر! اگر تم عقل کا تصور اس بھی استعمال کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ سماج کی تاریخ کا سارا ڈھانچہ عورت کے کندھے پر کھڑا ہے۔ جس دن بھی عورت نے چھٹی کی سماج میں ایک تعطل آجائے گا۔ بجائیں بجائیں کرتی ہوئی ایک ویرانی گھر پر منتقل ہو جائے گی۔ سارا کام اس روز جو مٹ ہو جائے گا، یوں لگے گا، فیکٹری پر جبری نالہ بندی کرا دی گئی ہے۔ بچے روئی گے، میں روؤں گا، گھر کی آبی اہلوظا اور جو ہر بھی روئیں گے۔ میں پوچھتا ہوں، متنازی چھٹی کے دوران کام کون کرے گا؟" "اب کیجئے گا۔" جذبات سے بالکل عاری ہر وہی تھی، ظالم!

اب میں نے ہنسیرا بدلا اور کہا: "اتھوا جلو میں تہاری سفٹے مار چھٹی منظور کرتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ اس چھٹی پر تم کر دو گی کیا؟"

"میں بھلی رہوں گی سوئی رہوں گی، ہسپیلوں کے ساتھ گھومتے جاؤں گی۔ فلم دیکھوں گی۔"

لب و مجب سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بیگم صرف میری نقل کرنا چاہتی ہے اور بحال بالکل نہیں ہے۔ ایک بار دل میں پیشانی خیال بھی آیا کہ اسے ایورٹائٹ کا لالچ دیدوں میں جھپٹی کے دن کام کرو تو دو گنی اجرت ملے گی۔ ایورٹائٹ کی رقم جمع کر کے، ایک ساڑھی خرید لینا لیکن بیوی کو ایورٹائٹ کی ترازو پر تو نا کچھ اچھا نہیں لگا۔ لہذا میں نے مردانہ فراخ دلی کی انتہائی بلندی پر کھڑے ہو کر "آواز دی" دیکھی جھپٹی منظر رکی جاتی ہے مگر ایک شرط پر کہ تم اس دن ہال بچوں کو ہمراہ لے کر میکے چلی جایا کرو۔

میکے کے رنج پر بیگم کچھ بوکھلا گئی۔ میکہ پر عورت کی کمزوری ہے۔ میکے کے سامنے سارا ٹیڈیوینی ازم منتشر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بیگم کی سمجھ میں یہ بات فوراً نہیں آئی کہ اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا ہے یا مطالبہ کی پیٹھ میں جھرا گھونپ دیا گیا ہے مطالبے کے ساتھ شرط کی رنج دکا کر میں نے ایک تیر سے دوڑ کا کر لئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس سے بیگم بھی خوش ہو جائے گی اور میں بھی بیگم کی غیر حاضری میں خاندان کو جو آزادی نصیب ہو جاتی ہے اس کا اندازہ صرف وہی شادی شدہ مرد لگا سکتے ہیں جو ایک مستقل سکینیت سے نالاں رہتے ہیں۔

بیگم نے زیر لب تبسم سے اس فیصلہ پر صا د کیا اور میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا کہ :-

سکر کی چاروں سے بازی لے گیا سہارپار

انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

بیگم کا تفسیر مطالبہ یہ تھا کہ گھر کے اخراجات کے لئے اسے جو رقم دی جاتی ہے اس میں اضافہ کیا جائے۔ کیونکہ اسٹیا کے پہلے خرچ قائم نہیں رہے۔ ہر خرچ پہلے کے مقابلے پر دو گنی ہونگی ہے مگر اخراجات کی رقم بدلتی رہی ہے۔

گو یا رہنمائی الامن کا مطالبہ تھا جو بیک وقت جائز اور ناجائز تھا۔ میں نے صحت کہا: "بیگم! مجھے تمہارے اس مطالبے سے ہمدردی ہے، بلکہ صرف ہمدردی

وہ تڑپ اٹھی : ”مگر سہروردی سے تو بنیائیں بھی نہیں آسکتی۔

”تو بنیائیں نہ خریدو۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ روکھی سوکھی روئی دکھا کے ٹھنڈا پانی پی۔“ تو اس کا کچھ مطلب تھا۔ کچھ فلاسفی تھی۔ اندر سے یہ ہے بیگم ! کہ تم ٹریڈ ریٹیں ازم کے جرس میں بزرگوں کی فلاسفی بھول گئیں۔“

اس کے جواب میں بیگم نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ بہت اذیت ناک تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ روکھے سوکھے گی فلاسفی پر یقین نہیں رکھتی وہ معیار زندگی کو گر کر مچلے میں اپنی ناک کڑا جاتا نہیں چاہتی۔ اس نے آنسوؤں کا ہتھیرا نکالی کہ مجھ پر بار بار حملے کئے اور دھمکی دی۔ گھر کے اخراجات کی ذمہ داری تم خود سنبھال لو خالی خولی سہروردی اور بزرگوں کی فلاسفی کے ساتھ تم ایک ہفتہ میں ہی دیوالیہ نہ بن گئے تو میں بیگم کہلاؤ چھوڑ دوں گی۔“

”تو پھر میں کیا کروں ڈارلنگ؟ جتنی آمدنی ہے اس سے زیادہ کہاں سے لاؤں گا۔“
”اپنی آمدنی بڑھاؤ۔“ انقلابی بیوی نے نعرہ لگایا۔
”کیسے؟“

رشتہ لہو، جیب کتری شروع کر دو، اسمگل کیا ہوا مال بیچ کر کوئی پرمٹ لائسنس لے لو۔ سادہ دنیا اس طرح ترقی کر رہی ہے۔“

اور صراحتاً یہ تھا کہ مجھے یہ نہیں ہو سکے گا۔ گزشتہ ایک سو برس سے جو خاندانی شرافت ہمارے سر پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ میں اسے چند کرسیوں، اتاج کے چند دائروں، بنیائوں اور لوگوں کی خاطر تباہ و برباد نہیں کر سکتا۔

مگر بیگم مصرعتی نہ بہرور میں اخلاق اور شرافت کی تدریس بدلتی رہتی ہیں۔ اخراجات میں کمی کر دینا بزدلی ہے۔ اور بزدل انسان کو کسی معزز بیوی کا خاوند بننے کا کوئی حق نہیں۔ اس لئے میرا یہ مطالبہ مایہ لوور نہ جنرل۔ اسٹرائیک کے لئے تیار ہو جاؤ۔

اس نے مجھ پر دل کہا۔ میرے مشہرے میں کو مشکوک قرار دیا۔ جبریل اسٹراٹیک کی دھمکی دے کر گھر کے مفاد پر ضرب لگانے کا اعلان کیا۔ یہ رویہ سیدھا طلاق کی منزل کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ مگر میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ بیوی کو طلاق دے دونگا خاندانی اخلاق کو نہیں دوں گا۔

چند منٹ کی بھڑائی خاموشی کے بعد بولی: "تو کیا ارادے ہیں؟"

"مطالبہ رو کیا جاتا ہے۔" میں نے تاریخ انسانیت کا عظیم ترمیمی اعلان کیا۔

"لیکن یہ میرا بنیادی مطالبہ ہے، اگر اسے رو کیا گیا تو میں اس پر غور کروں گی۔"

کہ پہلے دو مطالبے بھی منظور کروں یا نہ کروں؟

"مجھے یہ چیلنج منظور ہے۔"

اس مرحلے پر اگر سمجھوتے کی بات چیت لڑٹ گئی، مصلحت کے تحت بیگم یانگ بر جالسنی، خصلت کے مطابق میں یوں ہی کوئی یرا نا رسالہ اشعار ورتی گزرائی کرتے۔ لگا، گھڑی کی ٹنگ ٹنگ سہارے غم اور مسرت دونوں کو پیچھے چھوڑ کر وقت کی بے نیاز منزل میں طے کرتی رہی، میں نے کھانا نہیں کھایا، شاید بیگم نے بھی نہیں کھایا اور بیویوں لگا کہ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جا رہے ہیں، شاید ہم اندر ہی اندر روتے روتے سو گئے تھے، کھو گئے تھے۔

اور پھر جب بھوک کے گھڑیاں نے دوبجائے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک گرم گرم آئینہ میری پیشانی پر آگرا ہے اور ہر ملکی ملکی سسکیوں کی آواز اور نرم و نازک ہاتھوں کا لمس اور چوڑیوں کی منترنم جھنکار۔

"یہ کون تھا؟"

یہ کوئی ٹریڈ یونین لیڈر تو نہیں تھا۔

یہ کوئی، انقلابی بھی نہیں تھا۔

یہ میری اکلوتی پہلی اور آخری بیگم تھی! جو کہہ رہی تھی۔

"اٹھو، کھانا کھاؤ۔ مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔"

سوانا ایک بیمار

میں کئی برس سے بے حد شرمندہ تھا کہ مجھے کوئی سیریس بیماری لاحق نہیں ہوئی تھی۔ ہونے لگتی تو خیر لہذا کام میں بدل جاتی یا سرور دیا ہیٹ درو میں۔ احباب اور رشتے دار طعنہ دیتے کہ ان غیر ضروری بیماریوں پر آپ سے کوئی کیا ہمدردی کوئے میری بیوی تو کتنا شے اشارے سے کہی بار کہہ چکی تھی کہ میں آپ کی خاطر مر مٹنے کے لئے بھی تیار ہوں۔ لیکن مر مٹنے کی کوئی غلطی بنیادیں تو ہوں۔

اور سچائے کس کی دعا قبول ہوئی کہ ایک صبح شیدہ کے اٹھا تو اچانک غرض پائے سکارا۔ لہذا کہ چلا میں۔ میری بیوی جو اس نادار لٹھے کے انتظار میں ادھیڑ ہو گئی تھی ڈاکٹر کو بلا لائی جس نے کہا۔ "یہ بیماری سیریس ہے۔"

میری بے بساختہ کہا۔ "ہائے یہ بیماری مجھے لگ جائے۔"

ڈاکٹر بولا۔ "یہ منتنازعہ مسئلہ ہے۔ ہسپتال میں جا کر فیصلہ ہو گا۔"

چند منٹ بعد احباب اور رشتہ دار جمع ہو گئے اور اشر تقائے کا شکر ادا کیا کہ اب فکر تو نسوی راہ راست پر چل پڑا ہے۔ ان کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو بھر گئے۔ میری بیوی نے جذبات سے کاہنتے لفظوں میں اعلان کیا کہ وہ میرے غنل صحت پر پتھروں کو کھانا کھلائے گی۔ ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے بتایا۔ ممکن ہے بھائی صحت پر کئی سال لگ جائیں۔

کئی سال ۔ مجھے یتیموں کا مستقبل بے حد نازک نظر آیا ۔
 ہسپتال کے ہیڈ پر لیٹتے ہی میں غصہ سے پھولا نہیں
 سمایا ۔ کہ اب سیریس بیماری کی بدولت کئی لوگوں پر احسان
 کر سکوں گا ۔ اور مجھ سے سہمدردی کا فراخ دلانا استعمال
 کر سکیں گے انہیں ٹھنڈی آہیں بھرے اور آنسو بہاتے
 کا نادر موقع مل جائے گا ۔ اور وہ میری ایک جنبش لب پر گردنیں کھڑکتے پر بھی تیار
 ہو جائیں گے ۔ میری بیوی ہر پرسان حال کے ہوشوں پر انگلی رکھ کر کہہ سکے گی کہ
 سہلے میرے آہستہ بولو

ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

مجھے خوشی یہ تھی کہ زندگی میں کسی کے کام تو آیا ۔ ورنہ آج تک زندگی بالکل
 رنگینانہ بنی رہی ہوتی ۔ نہ آسودہ تبسم نہ خلوص ۔ نہ کسی کا امتحان نہ کوئی ہمتھی !

ایک دوست نے موقع سے فائدہ اٹھایا ۔ ہرلا ہسپتال کا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ
 میرے کالج کا ساتھی ہے ۔ مجھ سے سٹینکس کی گائیڈنگ مانگ کر لے جایا کرتا تھا ۔
 چنانچہ اسے ٹیلی فون کیا کہ ہمارے مریض کو فوراً میڈیا جائے ۔ ہسپتال میں ہیڈ میسٹر
 آئے کا مطلب ہے ۔ جیسے کسی بے درنگ گھوڑا پائینٹنٹ لیٹر مل جائے ۔ ایک پروفیسر دوست
 نے تبصرہ کیا ۔ ” اچی ہیڈ کیوں نہ ملے ! فکر صاحب کی دستانی تو منسٹروں تک ہے ۔“

اور مجھے منسٹروں کی پستی پر رحم آگیا ۔

ہیڈ کے بعد احباب اور رشتے دار بڑے سرگرم ہو گئے ۔ چاروں طرف مبالغے
 مبالغے پھرنے لگے ۔ ایک رشتے دار نے انکشاف کیا کہ بلڈ بینک کے انتہا رچ سے منے
 کہہ دیا ہے کہ شکر کیجئے ۔ ایک عظیم مریض آپ کے ہسپتال میں داخل ہوا ہے ۔ اور
 دوسرے صاحب نے اطلاع دی کہ اس وارڈ کا انتہا رچ ڈاکٹر میری خالہ کا چوتھا بیٹا
 ہے ۔ اس کی لومبرج سے پہلے کے سبھی لومبرج میں نے ہی ڈرافٹ کر کے دیئے تھے ۔ ایک
 دوست نے بیک وقت تین اخباروں میں میرا نوٹسٹالٹ کروا دیا ۔ تاکہ میری موت کے

بعد بطور یادگار کام آئیں۔ کافی ہاؤس میں چار پانچ دوستوں نے ریڑیو لیویشن پاس کر لیا کہ خدا نہ بخواتے اگر فکرِ تنہائی انتقال کر گیا تو سارا کافی ہاؤس نہ صرف شمشانِ بھومی تک جائے گا۔ بلکہ پسماندگان کے لئے چندہ بھی اکٹھا کرے گا۔

احتیاطاً چندے کی اپیل کا مضمون بھی ڈرافٹ کر لیا گیا۔

یہ سرگرمیاں دیکھ کر یوں لگا۔ جیسے سارا ہندوستان میری بیماری کی خاطر زندہ ہے۔ ہر روز کئی ڈاکٹر مجھے بیمار ٹری میں لے جاتے اور مجھ پر تجربے شروع کر دیتے۔ جیسے وہ ڈاکٹر نہ ہوں۔ طالب علم ہوں اور میں ایک کافی ہوں۔ جس پر وہ ہر دم درک کر رہے ہوں۔ میں نے ایک ڈاکٹر سے پوچھا۔ آپ مجھ پر میرے کیوں کر رہے ہیں۔

وہ بولے۔ تاکہ آپ کی وجہ سے نئی نوعِ انسان کو قائم پہنچائیں۔

میں نے کہا۔۔۔ اگر میں بیمار نہ ہوتا تو نئی نوعِ انسان کا کیا بننا؟

اس پر ڈاکٹر نے اسٹنٹ کو حکم دیا۔ کہ اسے ٹشک ٹو پارٹمنٹ میں لے جاؤ۔ دماغ میں کبھی غفل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میرے دماغ میں غفل نہیں ہے بلکہ مہارت ہے۔ کبیر تک میں نے سن رکھا تھا کہ ہسپتال کا ماحول بے حد رواندگ ہوتا ہے۔ کئی ادیبِ نو دیاں جا کر ناول تک لکھتے ہیں۔ اور اپنی بیماری سے ادبِ عالیہ میں اضافہ کرتے ہیں۔ بلکہ کئی تو نرسوں سے بھی پیار کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ تو کئی پرلٹ مارکران کے ناول کا ایک پیراگراف بن جاتی ہیں۔

چنانچہ ایک دن میں آنکھیں بند کئے بیڈ پر پڑا تھا کہ چیم سے ایک نرس آئی۔ رومانٹک نہیں تھی، حمیں بھی تھیں۔ اس نے میرے بیڈ کے سر پرانے میلے گتے پر ایک میڈیکل چارٹ لگا دیا۔ اور چلی گئی۔ اور مجھ یوں لگا۔ جیسے وہ میری قبر پر دیا جلا کر جا رہی ہے۔

اسی طرح جب مجھے بیڈ پر رہائش پذیر ہوتے ہوئے کئی چیمے گزر گئے تو مجھے شک ہونے لگا کہ ٹی کٹر حضرات کو خدمتِ خلق سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ ان کی حالت اس خدمت کی سما ہے۔ جو ہر روز مشہر کے لئے کھانا تیار

کرتی ہے۔ بیچ کو ملک ڈپو سے دو دو اور شام کو سبزی لاتی ہے اور اسے گرہ سستی پہ
 کہتی ہے۔ یوں لگا۔ کہ یہ ڈاکٹر بھی خدمت خلق سے اکتا چکے ہیں۔ اور جب بھی
 مریض کے مارٹ یا بیسیٹرے کی رپورٹ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو یوں محسوس کرتے
 ہیں جیسے آلو چھیل رہے ہوں۔ یا سبزی میں نمک اور مرچ عکبر رہے ہیں۔ ایک دن
 میں نے ایک ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”آپ کے اندر انسانیت کا جذبہ کیوں مر گیا؟“
 وہ دو دو فی چار کا پہاڑا پڑھتے ہوئے بولا۔ ”جنگائی اور کرپشن کی وجہ
 سے اب انسانیت تو ایک اچھوت بن کر رہ گئی ہے۔ ہم ڈاکڑی کے لئے خدمت
 کرتے ہیں۔ خدمت کے لئے ڈاکڑی نہیں کرتے۔“

یہ سن کر مجھے افسوس ہوا کہ مریض بننا بھی بیکار ہو گیا۔ مریض ہو یا صحت
 ہر جگہ اچھوتوں کی دنیا ہے۔ جو مریض سمجھتا ہے کہ وہ ڈاکٹر کو انسانیت پر مجبور کر دینا
 بہتر ہے کہ وہ صحت مند ہی رہے۔ کیونکہ ڈاکٹر بے چارے کے پاس تو اتنی فرصت بھی
 نہیں ہوتی کہ کسی لیڈی ڈاکٹر پر بیماری کی نظر ڈالنے سے پہلے پوچھ لے کہ تمہاری
 تنخواہ کتنی ہے۔

آہستہ آہستہ میرے پرسان عالی غائب ہوتا شروع ہو گئے۔ لبتہ بہتال
 سے باہر ہر راہ چلتے سے پوچھتے پھرتے۔ ”بھائی انگڑ صاحب کا بیڈ نمبر کونسا ہے؟“ اور
 پوچھنے کے بعد بیڈ نمبر یاد رکھتے، مجھے بھول جاتے۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ سبھی پرسان
 حال نظروں سے اوجھل گئے۔ اور میرے بیڈ کے پاس صرف چند شیشیاں۔ ایک
 میڈیکل چارٹ اور بیوی رہ گئی۔ شاید احباب بیماری کی طوالت سے بور ہو گئے
 اور سوچنے لگے کہ زندگی صرف بیماری کے گرد تو نہیں گھومتی کئی اہم کام اور بھی ہیں
 مثلاً تنہا اٹنا ہے۔ ٹوکیوں کو چھیننا ہے۔ پڑوسیوں سے ملنا ہے۔ اور یوں میں
 غیر دلچسپ ہوتا گیا۔ اور محسوس کیا کہ بیماری کو عادت نہیں بنا لینا چاہیے۔ اتنی بڑی
 کائنات میں ایک مریض تو مدغم سا نقطہ ہے۔ جس سے کوئی لفظ نہیں بنتا، کوئی
 کیر نہیں بنتی۔

میں سے ایک افسانہ نگار دوست نے خط لکھا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ دہلی میں بیمار پڑے ہو۔ جہاں پر سان حال مل جاتے ہیں، لیکن میری بد بختی کہ میں نے ہسپتال علاقہ پر چڑھا ہوں۔ جہاں پر سان حال اس لئے نہیں آتے، کیونکہ وہ میری بیماری سے زیادہ اہم کاموں میں مصروف ہیں۔ مثلاً مالک مکان سے نوٹوں میں کروڑے میں نوکل ٹرین کا تقاب کر رہے ہیں۔ بیوک مشین کے لئے کچھ وقت کیلوں کا رسٹ پر بچتے رہتے ہیں اور کچھ وقت ٹیٹری آپ بھرتے رہتے ہیں۔ چھ ماہ تک پر سان حال کا انتظار کرتا رہا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میں بڑا خوش ہوا کہ دنیا میں ابھی درد مند لوگ موجود ہیں۔ دروازہ کھولا گیا۔ تو نور اور اندر داخل ہوا۔ یہ میرا بڑا دسی تھا۔ بولا۔

"نہ سار کرتا ہوں۔ آپ کے یہاں ایک ضروری شیلیفون کرنا تھا۔ ۱۰ مارت ہر تو کروں۔"

میں نے اس خط پر مجھے آبدیدہ ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر اتنے میں تھکیر کے ایک پروڈیوسر صاحب تشریف لائے مجھے مشر مندہ کرتے ہوئے بولے۔ "فکر صاحب! آپ تو بیماری سے چھٹ ہی گئے ہیں۔ میں پوچھنا چاہوں کہ بوڈرامہ آپ ہمارے لئے لکھ رہے تھے۔ اس کے تین سبب ابھی باقی ہیں۔ ان کا کیسے گا؟ میں نے کہا۔ غسل صحت کے بعد ہی لکھوں گا۔"

بولے۔ "جلدی جلدی غسل کیجئے۔ بیمار بڑا نقصانی ہو رہا ہے۔ یہ آؤ بنگارا آپ کے لئے لایا ہوں۔ اسے کھائیے اور سوچئے کہ دوران مرض آپ وہ ڈرامہ مکمل نہیں کر سکتے۔"

ایک اور نزدیکی رشتہ دار آئے، میڈیکل چارٹ آنکھوں سے لگایا اور بولے۔ "آپ جلدی جلدی صحت یاب ہو جائیے۔"

میں نے عرض کیا۔ "آپ کو اتنی کیا جلدی ہے۔"

وہ روہانے ہو کر بولے۔ "دراصل آپ کی بھتیجی کے بیاہ کا مسئلہ بتاریخ

مقرر کر دیا ہے۔ کل یک ہے، کہیں لڑکے والے مگر نہ جانی۔ مگر آپ کی بیماری کی وجہ سے دے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا۔ ” غلط میری ہے کہ کل یک میں بیمار ہوا۔ آپ بیاہ کر دیجئے میری بیماری پر بھر درست کیجئے۔“

چند دن بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے بیاہ کر دیا ہے۔ اور میری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکل سکا۔ جسے شادی کے دعوتی کارڈ پر ہوا سکوں۔ البتہ اتنا ضرور کیا کہ ہسپتال کے قواعد توڑ کر گھر آگیا۔ پرسانِ حال کے بھروسے پر کوئی گت تک بیمار رہتا چلا جائے۔

گھر آ کر ایک رشتہ دار کا پیام ملا کہ میں ہسپتال میں اس لئے حاضر نہیں ہو سکا کیونکہ میرا بیٹا جوئے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ایک دوست نے چٹ بھجوائی کہ میں صرف خفگی صحت مند حالت میں دیکھ سکتا تھا۔ بیماری کے عالم میں نہیں۔ اس لئے پریشانی کو نہیں آیا۔ ایک اور دوست سے کافی سلاوس میں ملاقات ہوئی، ہنس کر بولے ” اتنا ضرور سنا تھا کہ تم بیمار ہو۔ لیکن میں سمجھا۔ مذاق کرنا بھاری عادت ہے بیماری سے بھی تم نے مذاق ہی کیا ہو گا۔“

اس کے بعد میں ہر رشتہ دار اور دوست کے گھر جا کر پیام دے آیا کہ میں ابھی تک بیمار ہوں۔ اس لئے مرق غنیمت ہے، اگر پوچھ جاؤ۔ ” ایک دوست آئے شکایت کرنے لگے۔ کہ میں ہسپتال میں ہڈیاں جوڑنے والے وارڈ میں حمیض صوفتہ پیرا، تم ملے ہی نہیں۔ کم از کم یہ تو بتا دیجئے کہ آپ کی ہڈی نہیں ٹوٹی۔ اعصابی نظام ٹوٹا ہے۔

میں نے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ موقع ملا تو ہڈی ہی تڑوا دینگا اور پھر یوں ہسپتال سے باہر آ کر میں نے محسوس کر دیا ویسی کی ویسی ہے کسی کو کسی کی خبر نہیں۔ بہر آدمی ایک دوسرے کے سامنے فہمے لگانے میں مصروف ہے۔ کون مر گیا۔ کس کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ کس کی آنکھ پھوٹ گئی، اس سے بے نیاز دنیا کا

ہر آدمی اپنی ہا چند ساتیں گھنٹے میں مصروف ہے۔ اور پھر محض لے مجھے اپنے
 آپ میں یوں کھپا لیا۔ جیسے میں بیمار نہیں ہوں، جیسے میں کبھی بیمار نہیں ہوا تھا۔ البتہ
 ایک دوست زیادہ مہربان نکلتے۔ مجھ اپنے گھر لے گئے اور بولے۔ ”تم آج تک
 غلط دوائیاں استعمال کرتے رہے۔ یہ روشنی اسے استعمال کرو تیر بہدوت ہے۔“
 ”آپ نے یہ ڈاکٹری کب سے سیکھی“ میں نے پوچھا۔
 ”اپنے نانا جی سے۔ وہ بھی اس بیماری میں استعمال کر گئے تھے۔“

ور کے لئے کینیا کی ضرورت

یہ اشتہار ہمیں آج سے دس سال پہلے دینا چاہئے تھا۔ لیکن ان دنوں ور یعنی برخوردار علی چندؔ دنیا کے عظیم میرؔ نامی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا اور کتنا تھا۔ ”جب تک لائبریری میں یہ کتاب موجود ہے میں شادی نہیں کراؤں گا“

ادب جیب کہ ہم یہ اشتہار دے رہے ہیں۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن جمع ہو چکے ہیں۔ بلکہ لائبریری میں اس کا نامزد ایڈیشن بھی آگیا ہے مگر اس کے باوجود برخوردار علی چند شادی پر آمادہ ہو گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اسے رات کو ڈراؤٹے خراب آئے لگے ہیں بلکہ کئی بار تو خواب میں آسمان پھاڑتے اڑتے بحر اوقیانوس میں جاگرا ہے۔

برخوردار علی چند کا فذ ٹھکانا ہے اس لئے وہ بلند خیالات کا مالک ہے۔ اونچے پائے کے انسانوں میں میٹھ کر رہتا ہے کہ ہمارے اندر کون کون سی خرابیاں ہیں۔ علی چند میں یہ بلند خیالی ان دنوں پیدا ہوئی، جہی دنوں فول گرافوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا تھا کہ فول کھنچواتے وقت مسکراتا ضرور چاہئے۔ دراصل وہ ہندوستان کی بیداری کا رونا تھا۔ ہر ہندوستانی کو شک گزرتا تھا۔ کہ ہندوستان بیدار ہو رہا ہے۔ لیکن شرم اور ڈر کے مارے کوئی کسی کو بتا نہیں تھا۔ مگر علی چند کسی نڈر تھا۔ وہ بلا جھجک ہندوستان

بیداری کا اظہار کر دیا کرتا بلکہ اس بیداری کے سسٹے میں یہاں تک کہ دیتا کہ میرا باپ نہایت رذیل اور لالچی بڑھلے ہے۔ جو میری شادی کروا کر ہندوستان کا مستقبل تباہ کرنا چاہتا ہے۔

غرض ان دنوں علی چند کے خیالات بے حد انقلابی تھے۔ اور اس کی باتیں سن کر وہی لطف آتا تھا جو شیو کرنے کے بعد رخصتوں پر ہاتھ پیرنے سے آتا ہے۔
 باجوہ کو تہہ تہائی کے علمی چند ایک با اصول انسان ہے۔ (جسے نہیں سمجھا)
 مثلاً اس کا فارمولہ تھا۔ کہ اگر شادی کے بغیر تخلیق آدم پر حرف آتا ہو تو پھر کیا ایسی یعنی پہلے جس کا قد، چھ سے ایک فٹ کم ہو۔ لیکن بعد کی تحقیق و تفتیش سے معلوم ہوا۔ کہ علی چند سے ایک نٹ چھوٹے قد کی کنیا دنیا میں نایاب ہے۔ دو چار ایسی کنیاؤں دستیاب ضرور ہوتی ہیں۔ لیکن بقول علی چند وہ "پرستلیٹی" سے محروم نہیں۔ حسن کے ان امور پر پوری نہیں اترتی ہیں، جس کا ذکر شاستروں اور دیگر مشنروں میں آیا ہے۔

مگر اب علی چند کا اصول ہے کہ اصول نسبتاً لچکلیے ہونے چاہئیں۔ جنی شاستروں اور دیگر مشنروں میں علی چند کے قد کا ذکر نہیں آیا۔ وہ ماڈرن سوشل سائنس کے تقاضوں پر پورے نہیں اترتے۔ اس لئے ماڈرن سوشل سائنس کی روشنی میں ہم ایسی کنیا بھی قبول کر لیں گے۔ جن کا قد علی چند کے قد کے برابر ہو۔ اس سے کم یا زیادہ نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ اصول کو اتنا زیادہ لچکیلا بھی نہیں بنایا جاسکتا۔

شادی کے متعلق برغوردار علی چند کے کچھ اور اصول بھی تھے، جو اُسے یوں مرغوب تھے جیسے اسے اپنی تصویر کا پتھرانا فریم اور جامع مسجد کے کباب مرغوب تھے، لیکن جب مارکیٹ میں جدید ٹریڈنگ کے خوبصورت فریم آ گئے اور جامع مسجد کے کباب ہلکے ہو گئے تو علی چند رو دیا۔ اور اُس کے آئینوں میں تمام اصول دھندلا گئے۔ اور آج صرف ان کی یاد باقی ہے۔ ان کا دھندلا جاتی ہے۔ ان کی نغماں باقی ہے۔ اور نغماں کا کوئی اصول نہیں ہوتا۔

استقرار دیتے وقت۔ علی چند جاپیس کے پیشے میں ہے۔ اُس کے کچھ بال سفید

ہو چکے ہیں اور کچھ بال اڑ چکے ہیں۔ جو نہی اس کی کوئی محبوبہ شادی کرتی۔ علی چند کے کچھ بال یا تو اڑ جاتے یا سفید ہو جاتے۔ اور اب اس کے اندر ایک ایسی فردگی آ چکی ہے، جیسے شادی کے دس سال بعد کسی خاندان میں آ جاتی ہے خاندان کی سنی فردگی پا کر اب وہ خاندان بھی بن جانا چاہتا ہے۔ اور یہ بھی چاہتا ہے کہ جس کنیا سے بیاہ کرے، وہ کم از کم اس کی حسرتوں کی داد ضرور دے، وہ کم از کم یہ ضرور محسوس کرے کہ اس قبر کے نیچے کتنا عظیم الشان مردہ دفن ہے۔

علی چند تسلیم یافتہ آدمی ہے۔ اور ایم۔ اے میں دو مرتبہ فیل ہو چکا ہے۔ ایک مرتبہ تو وہ اس لئے فیل ہو گیا تھا کیونکہ وہ اپنی ایک کلاس فیملی لڑکی سے رومانس کر رہا تھا۔ فیل ہونے کی وجہ بعد میں صحیح نہیں نکلی۔ کیونکہ وہ لڑکی ایم۔ اے میں پاس ہو گئی تھی۔ یہ نہیں ہوتا کہ امتحان ایک کوفیل کر دے اور دوسرے کو پاس نہجتی تھی ہو تو اس کے اثرات یکساں ہوتے ہیں۔ لیکن علی چند کا بیان ہے کہ وہ لڑکی چونکہ یوہ تھی، اس لئے وہ اندیشہ تھی۔ اور وہ بیک وقت محبت بھی کرتی تھی اور پڑھائی بھی۔ — بہر کیف کچھ بھی تھا علی چند اور اس لڑکی میں بالآخر صرف دو فکروں کا تبادلہ ہوا اور محبت ٹوٹ گئی۔

”ڈیر شو سبھا! کچھ دنوں سے تمہارا رویہ عجیبانہ نہیں رہا۔“

”ڈیر علی! محبوبیت ہم دونوں میں شاید بچتی ہی نہیں۔“

اور بر خوردار علی چند دوسری مرتبہ اس لئے فیل ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس بار بہت سے اور بھی لڑکے فیل ہو گئے تھے۔ مگر کنبہ نے اس کے دوسری بار فیل ہونے کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بلکہ صرف اتنا کہا کہ اب علی چند کو شادی اور ایم۔ اے کے امتحان، دونوں میں سے ایک چیز کا فوری انتخاب کر لینا چاہیے۔

برخودار علی چند ہنسا پر کھلنے پتے گھرنے کا ہنسنے لگا۔ (مگر میں دوپڑا غ اور بھی ہیں) اس کے والد صاحب جناب ناضل چند تھے، جن سے بر خوردار

علیٰ چند کو شدید نفرت ہے ، سوسائٹی کے معزز فرد ہیں ۔ اُن کی بیوی اُن کے سامنے بچوں کی طرح کانپتی ہے ۔ کانپنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ فاضل چند جی کے پاس پچاس ہزار روپے کی جائیداد ہے اور جائیداد کے تلخ ز سے نہ بیٹا محروم رہنا چاہتا ہے نہ ماں ۔ اس لئے دونوں فاضل چند جی کے ستم سہنے میں اود دیک کر رہتے ہیں ۔ — ایک مرتبہ ساذ کر ہے کہ علیٰ چند نے ایک صاحب کو اپنے والد کے ہاں بھیجا ۔ تاکہ اُن سے ایک لڑکی (محبوبہ) کے رشتے کی باستحیت چلائے مگر فاضل چند جی نے ان صاحب کو جھڑک کر کہا تھا : ” علیٰ چند نام کا کوئی لڑکا میرے گھر میں نہیں رہتا ۔ بھاگ جائے ۔۔۔۔۔۔“

چنانچہ علیٰ چند کے کیر کیز کی تعمیر و تخریب میں باپ کی سخت گیری اور ماں کی مظلوم نرمی دونوں کا ہاتھ ہے ۔ فاضل چند جی باپ کو گھالیاں دیتے ہیں اور ماں روپے دیتی ہے ۔ اگر سوسائٹی میں فاضل چند جی کی عزت نہ ہوتی تو وہ ماں بیٹا دونوں کو خانہ بدر کر دیتے ۔ مگر سوسائٹی کسی عزت دار آدمی کو ایسا نہیں کرنے دیتی ۔ لہذا فاضل چند جی مجبور ہیں ۔ کہ وہ علیٰ چند کی نفرت کے باوجود اُسے ہی جائیداد کا وارث بنائیں ۔ فاضل چند جی اتنے بیوقوف نہیں ہیں کہ صرف بیٹے سے نفرت کی خاطر ہی جائیداد کسی دھارمک سنسٹھا کو دان میں دے دیں ۔

لہذا جس کنیا سے علیٰ چند کا بیاہ ہو گا وہ ایک صاحب جائیداد خاوند کی بیوی کہلائے گی کیونکہ علیٰ چند اب اپنے انقلابی خیالات کی اُس منزل پر پہنچ چکا ہے ، کہ وہ اپنے باپ کی پچاس ہزار روپے کی جائیداد کو ٹھکرائے ۴۴ نہیں بلکہ یوں قبول کرے گا جیسے رام بن باس کے وقت بھرت نے ابو دھیا کی گدہی قبول کر لی تھی ۔

اس جائیداد کے علاوہ ۔ اگر کنیا چاہے تو گھر سے چیز لا کر اس میں خانا بھی کر سکتی ہے ۔ اگرچہ علیٰ چند جیہیز کا قائل نہیں ہے ۔ لیکن اگر کنیا کی شکل و صورت اچھی نہ ہو تو وہ جہیز لانے میں بھی بُرائی نہیں سمجھتا ۔ البتہ

اس کے والد فاضل چند جی کا خیال ہے کہ جہیز کا تعلق حُسن سے نہیں، عزت سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حسین بہو کو بھی جہیز لانا چاہیے۔ کیونکہ بہو کے ہونٹ چاہے کتنے ہی گلابی کیوں نہ ہوں۔ اگر جہیز نہیں لائے گی تو ان ہونٹوں پر کوئی بوسہ محبت ثبت نہیں ہو سکے گا۔

بہر کیف ہمیں ایک ایسی کنیا کی ضرورت ہے جو فاضل چند جی اور علمی چند دونوں کے خیالات کا پنجوڑ ہو۔ اور اگر کوئی ایسی کنیا مادرِ علمیت نے پیدا نہیں کی تو کوئی ایسی کنیا ملی قبول کر لی جائے گی جو علمی چند کی طرح یادِ محبوب میں اچھا تک کنواری مٹی ہو۔

برخوردار علمی چند کا میا حُسن کیا ہے۔ ۹۔ اس کے تعلق خود علمی چند اپنے آپ سے اختلاف رائے رکھتا ہے۔ مثلاً وہ بڑی بڑی غلافی آنکھوں کو پسند کرتا ہے۔ لیکن غلافی آنکھوں والی لڑکی کی کمر موٹی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ پتی کمر پر علمی چند کو کئی شعر بہت زیادہ پسند ہیں، لیکن فطرت کس کی شادی کے حساب سے تو کمر نہیں بناتی۔ فطرت تو ڈکٹریٹر ہے، سوشل ریفارمر نہیں ہے۔ کہ غلافی آنکھوں اور کمر میں ترمیم و تصحیح کر کے سماجی برائیاں دور کرتی رہے۔ — لہذا علمی چند فطرت اور موٹی کمر دونوں سے تالاں ہے۔

دوسری طرف — علمی چند چاہتا ہے کہ لڑکی شریلی ہو۔ اور جب بات کرے۔ تو اس کے خوبصورت ہونٹ فرط حیا سے ہنر خزانے گئیں۔ لیکن فرط حیا والے کئی ہونٹ علمی چند نے دیکھے ہیں۔ کہ فلسفہ اور دنیاویات پر بحث نہیں کر سکتے۔ لڑکی ایک فقرہ بولتی ہے تو ہزار بار ساڑھی کا پتو چبا کی ہے۔ ایک بار علمی چند نے اپنی ایک محبوبہ سے کہا تھا "نبی! فلسفی سپائی نوزا کی اخلاقیات سے مجھے بہت چڑ ہے۔ اس شخص کی بناوٹ میں سے ایک بچے کی بڑا آتی ہے۔ تبار کیا خیال ہے؟" اور نیلم نے فرط حیا سے ہونٹ ہنر خزانہ کہا تھا۔ مجھے خود بچے پسند نہیں ہیں۔ شادی کا مطلب بچے بائیں نہیں ہیں دیر! "

مگر علی چند اعلیٰ ملک ہندوستان کے مقرر ہوتے ہوئے ہونٹوں سے بڑی طرح مایوس نہیں ہوا۔ اس کا خیال ہے کہ فطرت ایک نہ ایک دن سیائی لودا اور مقرر ہوتے ہوئے ہونٹوں کو ضرور یکجا کر دے گی۔ لیکن فی الحال وہ کسی بھی ایسی لڑکی سے بیاہ کرے گا۔ جس کے مرت ہونٹ ہی مقرر ہوتے ہوں۔ سیائی نوز اسکا پارٹ وہ خود ادا کرے گا۔

لڑکی تعلیم یافتہ ہونی چاہیے یا نہیں۔ اگر ہونی چاہیے تو کس حد تک؟ اس کے متعلق چارہ کوئی آزادانہ رائے نہیں ہے، سماج کی رائے ہی سہاڑی رائے ہے۔ یہ سماج کی کیا رائے ہے، اس پر سماج میں بھی اختلاف رائے ہے۔ علی چند کہتا ہے کہ جو لڑکی غالب اکثر صحیح صحیح پڑھ سکے مگر کچھ نہ سکے وہ بے لبتہ ہے، مگر علی چند کی مانگ کتنی ہے کہ جو بہو خاوند کی قمیص کے بن ٹانگ کے بڑی سوشل کتیا ہے۔ اور اگر غالب کے اشعار میں بن ٹانگنے کی تعلیم دی گئی ہے تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔ مگر محرم ناضل چند بھی کا خیال ہے کہ کتیا کو اتنی تعلیم ہرگز نہ دلائی جائے کہ کسی بھی دفت دفتر میں نوکری کر لینے کی دھمکی دینے لگے۔

بہر کیف اس بات پر سارا سماج متفق ہے کہ کتیا اپنے در سے کم تعلیم یافتہ ہو تاکہ گھر میں امن قائم رہے۔ حد سے زیادہ تعلیم ملے۔ اور ایسے مہالے میں پیدا کرتی ہے جن کا بعد میں علاج ممکن نہیں۔ اس لئے کم تعلیم ہی بہتر ہے، علاج سے بہتر ہے۔

البتہ اگر کتیا خوبصورت ہو، سٹول ہو اور پڈنگ بھی اچھا بنا سکتی ہو، تو یہ ضروری نہیں کہ وہ غالب کے اشعار بھی پڑھ سکے۔ ایسی صورت میں غالب والی شرط اڑائی جاسکتی ہے، کیونکہ غالب تو دراصل پڈنگ کا نعم البدل ہے۔

اس کے علاوہ ہم کتیا کے لئے چند عام فہم شرطیں بھی عرض کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی شرطیں جن کے بغیر کوئی چوری، جوی نہیں کہلاتی۔ خاوند لگتی ہے۔ مثلاً سنگٹہر ہو یعنی ٹوٹا پیٹا ہو، اپنی معرکہ جگہ پر نہ کیا جواس جائے، نہ کہ جو ہوں کے بن سے برآمد کرنا پڑے۔ دنا شمار ہو یعنی

اگر خاوند کے سر میں درد ہو تو جوڑی کا سیدہ خراب ہو جائے، پڑدمنوں سے ڈیڑھ چمک تعلقات رکھے کیونکہ ان سے کئی بار آٹا اور کدو کا عادیٹا لینا پڑتا ہے، کفایت شمار ہو، اگر خاوند کا خرابی پر اعتراض نہ کرے، کیونکہ خاوند لوگ بڑے فکی المحس ہوتے ہیں، اور شدت جذبات میں گھرا نا ہی بخیر دیتے ہیں۔ اور بر خورد اور غمی چند تو اتنا حساس ہے، کہ شاید ترک وطن ہی کر جائے۔

کھانا نہایت نفیس پکا سکتی ہو۔ اگرچہ گھر میں عام طور پر دال بھاجی ہی کپکے گی منل شہنشاہی کے بار چنی دال میں مٹی کمال کر دکھاتے تھے، کپڑے دھو سکتی ہو، کچی کچی گنگناہی سکتی ہو، سپیلیوں میں میچ کر علی چند کی مقبولیت کی ہوا باندھ سکتی ہو، ظلم دیکھ علی چند سے مدافس کر سکے، جیسے سنگترے کی بھانگیں نہیں کر نہ میں دینا اور اس کے سر کے سفید بال نہایت چمکتے نکالنا اور محبوبانہ عشوہ سے کہنا: جاؤ مٹی! میں یہ بال اچھے نہیں لگتے۔

اشتہار ختم کرنے سے پہلے ہم ایک آخری استدعا کرنا چاہتے ہیں۔ کہ متذکرہ بالا تمام تشریحات اور شرائط صرف علی چند کے پس منظر کے طور پر دی گئی ہیں۔ اس لئے کہ کیا کے والدین انہیں نظر انداز نہ مٹی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ اشتہار خلوص نیت سے دیا گیا ہے یعنی ہم واقعی علی چند کی کہیں نہ کہیں شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ علی چند کی اب یہ حالت ہو گئی ہے، جیسے کوئی آدمی دن بھر کرے میں بیٹھے بیٹھے آؤب گیا ہو، علی چند کے پاس جو کچھ اپنا تھا وہ اس کا صرف پس منظر تھا۔ اور اب اس کے پاس اپنا کچھ نہیں رہا۔ جو کچھ باقی ہے، سماج کا ہے۔ علی چند کے تمام خیالات اپنے ٹرینس پر بیچ چکے ہیں۔ اور اب وہ بالکل شانت ہے۔ یہ خیالات اس کے دشمن تھے۔ اور اب یوں لگتا ہے جیسے کوئی اپنے دشمن کو قتل کر کے اس کی لاش پر بیٹھا سسکیاں بھرتے بھرتے سو گیا ہو۔

اس لئے موجودہ صورت حالات میں ہمیں ایک ایسی کینیا چاہئے جو صرف کینیا ہو، کینیا ہونا ہی کافی ہے۔ باقی تمام باتیں غفشار ہیں۔ — لڑکی جب گھڑائے گی تو بالکل اسی طرح مگر میں ڈھل جائے گی، جیسے آج تک سندھوستان کی ہر لڑکی ڈھل گئی ہے۔ اور اگر اشتہار میں کسی کو ہماری مردانہ نفوذ کی تو آئے تو اسے صرف اشتہار کی ڈراماٹک، نقص سمجھنا چاہئے اور کچھ نہیں۔ — ۵۔

میں مالک مکان بنا

اور آخر بیوی کے اصرار پر میں نے وہ ڈیڑھ کمرہ کرائے پر اٹھا دیا۔ اس سے اگرچہ خاندان کی روایت ٹوٹ گئی۔ لیکن بیوی نے نئی روایت قائم کر دی۔ شادی کے بعد خاندان کی حیثیت بیوی کے مقابلے پر سیکندری ہو جاتی ہے۔

یہ ڈیڑھ کمرہ میری مناسب ضروریات سے زیادہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا مصروف یہ تھا کہ میرا بڑا لڑکا کبھی کبھی اس میں گھس جاتا اور اپنی محبوبہ کے نوٹر بڑھا کر ناٹھا یا اس کے ایک نازک گوشے میں کچھ خستہ قسم کی خاندانی دستاویزات پڑی رہتی تھیں جن کا میں خواہ مخواہ احترام کیے جا رہا تھا۔

میری ٹریڈی یہ تھی کہ میں انسانیت کو کرائے داروں اور مالک مکانوں میں تقسیم کرنا نہیں چاہتا۔ میرا اصول ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے متعلق میری معلومات کافی ناقص تھیں۔ لیکن میرا خیال ہے اصول کا معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

میرے کرایہ دار کا نام گجاند تھا۔ جو اگرچہ نام مقول نام تھا۔ لیکن چونکہ وہ منسٹر سفارشی خدا لایا تھا۔ اس لیے مجبوراً میں نے کہا: ”گجاندھی! منسٹر تو سفارشی خدا لکھ کر اپنا سوشلزم کا گڑ ارا کر لیتے ہیں، مگر آپ کرایہ دار بن کر کیوں کرنا چاہتے ہیں؟“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ جو بے حد مانوس تھی اور بولا: ”جواب! مجھے جیوتشی نے بتایا ہے کہ اس جنم میں تم مالک مکان نہیں بن سکتے۔ صرف اگلے جنم میں چانس ہے۔“

جواب میں مصوبیت تھی۔ — جو مجھے پسند آئی۔ مصیبت یہ ہے کہ معصوم انسانیت کے راستے میں جیوتشی حاضر ہیں۔ گجاند کے لمحے میں جو سادگی اور پاکیزگی

تھی اس کی بنا پر میں نے پوچھا۔

”بھائی جان ! آپ اتنے شریف اور مہذب کیوں ہیں ؟“
وہ عجیب بول اٹھا : ”یہ خاندانی ورثہ ہے ، اس میں سیر انکوئی دوش نہیں

جناب !“

عجیب بات ہے . کئی ماں باپ ورثے میں مکان چھوڑ جاتے ہیں . اور کئی
مرث شرافت اور مہذب — میں نے اُسے کھایا۔

”گجپانند جی ! دراصل کمرہ تو ایک ہی ہے . مگر میری بیوی نے ایک حق لگا کر
اُسے ڈیڑھ کمرہ بنا رکھا ہے تاکہ ڈیوڑھا کرایہ وصول کر سکے اور شرفار کے لئے مرث
ایک کمرے میں رہنا غیر موزوں ہے۔“

اور جواب میں اُس نے جیسے میری ساری خلافتی کو توہین کر دی اور کہا۔

”آدل تو مجھے شرفار میں شمار نہ کیجئے اور اگر آپ شمار کرتے ہیں تو اُس کا
انکشاف دوسروں پر نہ کریں۔“ اس کے علاوہ گجپانند نے میری بیوی کا ذکر اپنے
ورثے سے بھی زیادہ احترام کے ساتھ کر دیا کہ وہ بے حد معقول خاتون ہیں۔

اور میں بیوی کی معقولیت سے گھبرا گیا اور وہ ڈیڑھ کمرہ گجپانند کے حوالے کر دیا۔

تین مہینے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے گجپانند اُس ڈیڑھ کمرہ کو
جنت سمجھ کر رہ رہا ہے . وہ اتنا مرئیانہ برج نکلا کہ محلے کے پانچ سات چوہے تک
نقل مکانی کر کے جنت میں گھس گئے . شرفار کی بی بی بیجڈی ہوتی ہے کہ وہ چوہے
اور انسان میں کوئی امتیاز نہیں برت سکتے۔

ایک دن محلے کے تین چار معزز لوگ میرے پاس تشریف لے آئے ، میرا مطلب
ہے لباس سے وہ معزز سلوک جوتے تھے . ایک نے کہا۔

”سہارک ہو نیکر صاحب ! آپ اب ہلک مکان بن گئے ہیں !“

دوسرے نے وضاحت کا : ”جب تک کرایہ دار نہیں آیا تھا آپ ہلک مکان

کہلانے کے سوتی نہیں ہوئے تھے۔

تیسرے نے کہا :- ”یعنی اب آپ میں ایک مغنوم پیدا ہو گیا ہے ؟“
جوتھے نے ایک غارم میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ۔

”اود اب آپ ہماری متحدہ رنگ پورہ مالک مکان ایسوسی ایشن کے سوز ممبر بن جائیے !“

میں نے اپنے علم میں اضافہ کرنے کی غرض سے پوچھا ۔

”اس ایسوسی ایشن کے جسم کا کوئی معقول یا نامعقول مقصد ؟“

وہ بولے :- ”بات یہ ہے جی ! کہ یہ کرایہ دار لوگ بڑے بد معاشر ہوتے ہیں“
”یعنی میرا کرایہ دار بھی بد معاشر ہے ؟“

”نہیں ہے تو ہر جائے مکان ۔ اسی لئے ہم مالک مکان آپس میں بھائی چارہ پیدا

کرنا چاہتے ہیں اور آج سے آپ ہمارے بھائی ہیں ؟“

میرا جی چاہا ، اُنھیں کہہ دوں کسی منشر کی سفارش لائے ، جب آپ صاحبی
بڑوں کا ۔ لیکن یہ شرط بھینڈی معلوم ہوئی کیونکہ اسے سوز میں آسانی سے پوری کر سکتے تھے
آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیئے ۔ اگرچہ دستخط کے بعد اپنی حرکت پر بہت تعجب ہوا ۔ چند
دن پہلے میں نے گجاستند کو بھی اپنا بھائی کہا تھا ۔ اب مکان مالکوں کا بھی بھائی بن گیا
ہوں ۔ یہ دو متصادم قسم کے بھائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ لیکن پھر سوچا ۔ اس دنیا کے کبھی
انسان بھائی بھائی ہوتے ہیں ۔

اسی شام گجاستند سے اطلاع عرض کر دیا کہ آج سے آپ بھائی صاحب نہیں
ہیں ۔ بلکہ کرایہ دار ہیں ۔

اور گجاستند نے کہا :- ”چھوڑیے جی ! آپ تو مذاق کرتے ہیں ؟“

لیکن میں مذاق نہیں کر رہا تھا ۔ بہت سیریس تھا ۔ ایسوسی ایشن کا (سوز)
ممبر بن جانے سے میری ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں ، اس لئے میں دن رات اس ٹوہ
ہے دیکھ کہ گجاستند کے کمرے سے کوئی آواز نہ اٹھے ، اور میں چھت بھانڈوں

فرش پر پتنگ کھکانے کی آواز، رات کو دیر سے آنے کی آواز، چوہوں کے گھلاسن، توڑنے کی آواز، منگائی کے خلاف گالیوں کی آواز، یہاں تک کہ اس کے بچوں کے رونے کی آواز بھی آئے تو میں لٹکا کر کہوں۔

”گجبانہ! اپنے بچوں سے کہہ دو رونا بند کرویں! کیونکہ اس سے میرے بچوں کو معلوم ہو جائے گا کہ انسان روتے بھی ہیں۔ اور یوں میرے بچوں کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔“

لیکن ایسی کوئی آواز شاید گجبانہ کے نصیب میں نہیں لکھی تھی، ایسی ایشن کے معزز عہدیدار وقتاً فوقتاً میرے یہاں وزرٹ کرتے رہے اور مجھ بتاتے رہے کہ گجبانہ سے کون کون سی بد معاشیوں کے امکانات، روشن ہیں اور ان امکانات کا سہا باب کرنے کے لئے تھانے کب جانا چاہیے۔ گالیاں کب دینی چاہییں۔ پالتو کتا کب چھوڑنا چاہیے۔ اور غنڈے بٹاکر اُغلیں شراب کب اور کیوں پلانی چاہیے۔ بلکہ ایک معزز عہدیدار کو تو اس بات پر بہت حیرت ہوئی کہ کرایہ دار کی وجہ سے ابھی تک آپ کی آتما کی شانتی میں خلل نہیں پڑا؟

میں نے اعتراف کیا کہ میری آتما میں کوئی نقص ہے۔

ایک دن ایسی ایشن کے پریذیڈنٹ جن کی شکل بھونڈی اور لباس حسین لکھتا آٹرائٹ لائے اور جیسے ٹھہرے۔ راز دارانہ لہجے میں ہمدردی کرنے لگے: ”فکر صاحب! ایسی ایشن کے معززین میں آپ کی قدر منزلت کچھ کم ہو رہی ہے۔ بلکہ کوئی ایک تو (سند کیجئے) آپ کی نیت پر شبہ کرنے لگے ہیں کہ آپ کی وجہ سے آپ کے کرایہ دار کے حوصلے بلند ہو گئے ہیں۔ جن کا اثر ان کے اپنے کرایہ داروں پر پڑ رہا ہے۔ میں نے عرض کیا: ”مگر پریذیڈنٹ صاحب! اسے میری ٹریڈ بکڈی سمجھئے کہ گجبانہ شریف اور مہذب انسان ہے۔“

”وہ بولے۔۔۔“ یہ کبھی جوہی نہیں سکتا۔ کرایہ دار مہذب ہوتے ہی نہیں! مگر وہ کوئی غیر مہذبانہ حرکت نہیں کرتا۔“

”کیسے نہیں کرتا۔“ اچھا بتائیے، غسل خانے میں جا کر ٹنگنا تا ہے کہ نہیں؟

”اوں ہوں۔“

”بڑا ڈل کرایہ دار ہے۔ آپ کرایہ دار بدل دیجئے!“

”ورنہ؟“

”ورنہ معز دین آپ کا سوشل بائیکاٹ کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ یہ مریخیا دھمکی مٹی مگر خاندانی ورثے کے باوٹ میں اس دھمکی کو چیلنج دینے کے اہل نہیں رہ سکتا۔ اس لئے سوچ سوچ کر میں نے گجبانند کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کر لیا اور بازاد سے گلابوں کی ایک کتاب لے آیا اور ساری رات اس کی سٹڈی کرتا رہا۔“

اور دوسری صبح کو اپنے نچھٹے بھٹلا کر گجبانند کے پاس پہنچ گیا اور کہا۔

”تم انسان نہیں ہو۔ آؤ ہو!“

دو حیران ہوا۔ جس سے مجھے خوشی ہوئی۔

”اور میں اس آؤ سے پوچھتا ہوں۔ یہ کھڑکی کا شیشہ کس آؤ کے پتھڑے

نے توڑا؟“

”آپ کے چھوٹے صاحب زادے نے بہو آ ایک ڈھیلہ عرصہ کر دیا۔“

”تو تلافی! تم نے اس کے باپ کو فحش گالیاں کیں نہیں دیں؟“

”اجی، میں نے سوچا۔ بچے سب کے برابر ہوتے ہیں۔ اگر میرا بچہ ڈھیلہ

مار دیتا تو.....“

مجھے بہت طیش آیا۔ گویا اب یہ بچوں کی دلیریت کو کنفیوژ کر رہا ہے۔

بچے سب کے بچے ہوتے ہیں۔ سبھی انسان صحابی صحابی ہوتے ہیں، تنہا انسان نہیں یہ کیسی دنیا ہے؟ کیسی اس کی فلاسفی ہے۔ میں ٹوٹے ہوئے شیشے اور ٹکڑوں کی درگت پر بڑبڑاتا ہوا لوٹ آیا۔ گلابوں کی کتاب آدھے دام پر فروخت کر دی۔ مجھے

گنجانند معوز نہیں بنے دیتا۔ میرے الزامات کو احمقوں کی بڑکھٹا ہے۔ ہتھ! پھوں!

میں دو تین دنوں تک مشاہدہ کرتا رہا کہ شاید وہ راجہ راست پر آجائے۔ تیسرے دن وہ آٹا مجھے راجہ راست پر لے آیا اور مکینک کو بلا کر اپنے بیوں سے نیا شیشہ منٹ کر دیا اور میرے تلوؤں میں آگ لگ گئی۔ جی چاہا اپنے جھوٹے صاحب نادرے کو سوار پیہ رشتہ دے کر کہوں کہ اس نئے شیشے کو بھی ڈھیلہ مار کر چکنا چور کر دو۔ لیکن وہ ناخلف نکلا۔ کہنے لگا: گنجانند مجھے انگریزی کے سبق اتنی خوب مرئی اور پیار سے پڑھاتا ہے کہ میں ناخلف بننا زیادہ پسند کروں گا۔

گویا یہ ایک سازش تھی۔۔۔ وہ میرے بچے اور بچے کے باپ میں بھڑک کا بیج ڈال رہا تھا۔ ایسے آدمی کو کرایہ دار رکھنا، اپنے پاؤں بلکے اپنے خانقاہ کے پاؤں پر گھبڑی مارنا تھا! سوچ سوچ کر میں نے اس سازش کا کوڑا تلاش کر لیا۔ دل ہی دل میں اس کی گلاں پکڑ لی۔ اور زبان بھا زبان سے کہا: اگلے مہینے میرے بڑے لڑکے کی شادی ہے، اس لئے میرا کمرہ خالی کر دو۔

حالانکہ میرے بڑے لڑکے کو اس کے ساتھی ہر لڑکی مشرور کر چکی تھی اور وہ تنگ اگر سماج کی فیش کام بیوا کا پر وگرام بن رہا تھا۔ لیکن شادی کی خبر سننے ہی گنجانند نے کہا۔

”میں انگریزی رویتندر کی شادی کی خوشی میں ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔“

عجیب مولق انسان ہے۔ اسے مکان خالی کرنے کا غم نہ تھا۔ بلکہ میرے بیٹے کے بیاہ کی خوشی تھی۔ یعنی اب میں اس کا سامان بھی زبردستی نکال کر نہیں بھیج سکتا تھا۔ غصے میں اگر میں شام کو باگونی پر کھڑا ہو گیا اور ساری دنیا اور اس دنیا کو بنانے والے خدا تک کو ستانے کے لئے جند آواز میں کہنے لگا۔

”سنئے حضرات ! یہ کیا بد معاشی ہے، میرا کرایہ دار مجھے زخمی کرنے کے لئے کل دات غنڈے لے آیا۔ اُنھیں شراہیں پلائیں۔ لیکن میں اس غنڈہ گردی سے نہیں ڈرتا۔ میں اُس کی ہڈیاں چبا جاؤں گا ! کیونکہ سپرنٹنڈنٹ پولیس میری سالی کا بہنوئی ہے اور ڈپٹی کمشنر مجھ سے طالب علمی کے زمانے میں ریاضی کے سوال حل کروانا رہا ہے۔ ہتھو ! میں اپنے لڑکے کی شادی پر اس سے کمرہ خالی کروا کے رہوں گا۔ یہ سچ کر آسمان سے پھولوں کی بارش نہیں ہوئی۔ البتہ ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ نے میرے اعزاز میں کاک شیل پارٹی کا اعلان کر دیا اور یہ اعلان اُس وقت دو آتشہ ہر گپ جب میری جرات رندانہ دلچھ کر تھے کے چند مشنڈے کرایہ دار میری بالگونی پر چڑھ آئے اور گر جئے گئے۔

”کون مائی کالال ہے جو گھجائند سے کمرہ خالی کر دالے ! آپ کسی بھی کرایہ قانون کے تحت یہ غنڈہ گردی نہیں کر سکتے ! ہم ڈپٹی کمشنر کے کمرے یا مئی کے سوالوں کو غلط قرار دیں گے۔ جو ہم سے ٹکرائے گا، پاش پاش ہو جائے گا۔“ مجھے اُن مشنڈوں کی جرات پر خوشی ہوئی گویا اب تنازعہ بڑھے گا اور دو آتشہ لطف آئے گا۔ لیکن گھجائند نے میرے کئے پر پانی پھیر دیا اور اپنا سامان پیک کرنے لگا۔ یہ میری دافخ شکست تھی۔ میں بھاگا بھاگا اُس کے پاس آیا اور اُس کا کندھا زور زور سے جھنجھوڑ کر بولا۔

”اے سٹور کے تنم ! مت جاؤ۔ اس کمرے کا کرایہ دُگنا کرو اور جھک جاؤ کہ پتے رہو !“

وہ چپ رہا۔۔۔ معجزوں کے دل میں میرا احترام زیادہ تھا۔ میں نے اُس کے بال وحشیانہ انداز میں کہنے لگے۔

”اے شیطان کی اولاد ! مجھے انگوٹھا دکھا دو اور کہو کہ میں ایک بچہ دام نہ بڑھاؤں گا !“

وہ اُسی طرح سامان باندھنے میں مصروف رہا۔

اب میرے ضبط کا پیمانہ بھریز ہو گیا اور پیمانے سے اچانک ایک قطرہ

نکلا !
 " میں نے دگنا کرواتے مانگ کر تم سے جھوٹ بولا ہے "

" آپ جھوٹ بول ہی نہیں سکتے ! "

اور دوسرے لمحے وہ میرے ہر جھوٹ کو پاؤں سے شکر اکر چلا گیا اور میں
 بے قرار ہو کر سیدھا اُس کمرے میں داخل ہوا اور اپنی خاندانی دستاویز استیصال کر
 کھڑکی سے باہر پھینک دیں !!

ماسٹر جی کو جانا ہوں کہ سورج کو میں نے ہمیشہ مشرق سے اُگتے دیکھا ہے، تو ماسٹر جی خوش ہو کر کہتے ہیں۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ میں نے خود سورج کو ہمیشہ مشرق سے اُگتے دیکھا ہے۔
 یہی وجہ ہے کہ ہمارے تعلقات خوشگوار چلے آ رہے ہیں۔ میں سرجنا ہوں کہ اگر اس دنیا میں کیلا اور سورج نہ ہوتا تو انسانی تعلقات کافی دگرگوں ہو گئے ہوتے۔

لیکن ایک دن اچانک ہمارے تعلقات میں یہی وہ اڑ بڑ لگئی، کیونکہ قانون قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے کو اُن جانے میں بے وقوف بناتے رہیں۔
 ہوا یہ کہ ایک دن ماسٹر جی ٹ لال نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے کہا: ”کلو جی!“
 میں مشہور ہونا چاہتا ہوں۔“

میں نے عرض کیا: ”آپ کو عزت و شہر ہونا چاہیے۔ وہ نہ آپ ہمیشہ کیلا بنے رہیں گے۔ اور اپنے آپ کو قبض نہیں ہونے دیں گے۔“

وہ بے تحاشہ ہنس دیتے۔ لیکن فوراً لہجہ جیسے انہیں خیال آیا کہ وہ اپنی ہی سنجیدہ بات پر ہنس رہے ہیں، چنانچہ ایک دم آداس یعنی سنجیدہ ہو کر بولے۔
 ”آپ مجھ پر طنز کر رہے ہیں۔“

”میں نے کہا: ”نہیں، یہ میری عادت ہے، نیت نہیں۔ آپ فرمائیے کہ مشہور ہونے کے لئے آپ نے کون سا طریقہ سراپا ہے؟“ مثلاً گذشتہ دنوں ہمارے محلے کے ایک صاحب نے مشہور ہونے کی خاطر اپنی گلی کے سرے پر اپنے نام کی تختی پر لکھ کر لگا دیا۔ پرکاش چند اسٹریٹ۔ لیکن ان کی شہرت اس وقت خطرے میں پڑ گئی جب اسی گلی میں ایک کرایہ دار اُکر رہے لگا۔ اس کا نام بھی پرکاش چند تھا۔ چنانچہ انہوں نے وہ تختی اتار دی چیتڑ سے نئی تختی پر لکھ دیا۔ پرکاش چند مہو ترہ اسٹریٹ۔“ _____ اس لئے میرا مطلب یہ ہے کہ آپ مشہور ہونے سے پہلے یہ تحقیق ضرور کروالیں کہ اس شہر میں کسی اور آدمی کا نام تو ماسٹر جی ٹ لال نہیں ہے اور وہ آپ کی طرح مہو ترہ تو نہیں ہے۔

انہوں نے اپنے ہاتھ پر اپنی استخوانی انگلیاں دوچار ہر تہہ ماریں اور جیسے سارے شہر کا جبر لگا کر ڈیڑھ منٹ میں لوٹ آئے پھر بولے۔

صرف ایک اسٹریٹ لال ضرور ہے مگر وہ اسٹیشن ماسٹر ہے اور میں
اسکول ماسٹر ہوں، اور پھر وہ صرف اس لئے مشہور ہے کہ اس کی سات لڑکیاں
ہیں اور لا کا ایک بھی نہیں ہے۔

میں نے ان کی پیٹی پر اطمینان دلانے والی تعجب کی دلی "خیر، ان کی مشہوری
کی لائن انگ ہے، مگر آپ کی لائن کیا ہے؟"

"میں ایک فلم بنانا چاہتا ہوں۔" وہ واقعی مطمئن ہو کر بولے۔

"ضرور بنائیے۔ اور اس فلم کا نام اسکول ماسٹر رکھئے۔"

انہیں پھر شک ہوا کہ میں طنز کر رہا ہوں، بڑے فکر صاحب! آپ پھر مذاق
اڑا رہے ہیں۔ لیکن بچپن سے یہ میری تمنا ہے کہ میں زندگی میں ایک فلم ضرور بناؤں گا
اور مجھے یقین ہے کہ میرے اس خواب کی تعبیر ضرور نکلتے گی۔"

"ہائے بچپن کے سہانے خواب!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ مگر انہوں
نے میری بات شاید نہیں سنی اور بتاتے چلے گئے کہ میں نے فلم کے لئے ایک کہانی نہیں
کہہ ڈالی ہے اور اس کا نام بھی رکھ لیا ہے۔" دوبارے ایک گلاب۔"

اب میں سنجیدہ ہو گیا اور کہا: "ماسٹر جی، اس نام سے طبعی حلقی ایک دو فلمیں
پہلے ہی بن چکی ہیں۔ بلکہ ایک پروڈیوسر نے اسی قسم کے نام سے ایک مزاحیہ فلم بھی بنا رکھی
ہے۔" ایک سینچ در کباب۔" اس بڑے بہتر نام ہے کہ آپ کوئی چیز کا دینے والا نام
رکھئے۔"

"نہ آپ ہی کوئی نام تجویز فرمائیے، انہیں مجھ پر جاہلانہ حد تک اعتقاد تھا۔ مجھے
مجوز کے ٹیلے کے مبارک اس امر پر اعتقاد تھا کہ اس ٹیلے کے بچے واقعی مجوز کو
دھنایا گیا۔"

میں نے کہا: پہلے آپ اپنی کہانی سنائیے، تب ہی اس کا کوئی معقول یا
ناممقول نام تجویز کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ آجکل کی دنیا بڑے فلم سے دور نہیں ہے
کہ کہانی کی تعلیم اور فلم کے نام میں کوئی تعلق ہو۔ لیکن چونکہ

ہیں اور غضب یہ کہ اس کی بدولت مشہور بھی ہونا چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ کی کہانی کی روح فلم کے نام میں پوری طرح اجاگر ہونی چاہئے۔“

انہوں نے شاید مجھے پروڈیوسر یا فنانشر یا دونوں سمجھ کر کہانی سنانا شروع کی اور بڑے مبہری کہانی ایک باغیچے سے شروع ہوئی ہے، جہاں پر ایک مالی کا لڑکا اور ایک سیٹھ کا لڑکا آپس میں گیند بلا لگتے رہے ہیں، اور...

مجھ سے رہا نہ گیا، بے ساختہ میرے منہ سے نکلا: ”میں سمجھ گیا چڑت لال“۔
 جی، آپ کی فلم میں ہی یہ دونوں لڑکے بڑے ہو کر جوان ہو جائیں گے، اور دونوں ایک ہی لڑکی سے عشق کرنے لگیں گے... .. اور پھر دونوں اس لڑکی کی خاطر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ ان میں سے ایک لڑکا کسی حادثے میں مر جائے گا اور دوسرے لڑکے سے وہ لڑکی شادی کرے گی کہانی ختم، فلم ختم، اور پھر آپ کو نیشنل ایوارڈ... ..

ماسٹر چڑت لال ایک دم اداس ہو گیا، اور جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آنے والا مسافر تھکان سے چور چور آواز میں بولتا ہے: ”میں نے یہ کہانی لکھنے پر لپڑے کیا رہ جیتے عرق ریزی کی مگر آپ نے ڈیڑھ منٹ میں ہی ساری کہانی سنا دی... .. مگر معاف کیجئے، مبہری کہانی میں ایک نہیں دو لڑکیاں ہیں۔“

میں اچھل پڑا: ”پھر تو کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔“ ماسٹر چڑت لال جی ہندوستان بھر کی لڑکیاں آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ آپ چاہیں تو دو کی بجائے چار یا پانچ لڑکیاں بھی لاسکتے ہیں، لیکن سیر دکن تو بہر کیف ایک ہی لڑکی ہوگی۔“

”نہیں میری فلم میں دو سیر دکنیں ہونگی، ایک امیر گھرانے کی لڑکی... ..“
 ”جروالی کے لڑکے سے عشق کرے گی تاکہ ملک میں سوشلزم آسکے... ..“
 ”اور دوسری ایک غریب طوائف کی لڑکی، جس کے لئے سیٹھ کا لڑکا اپنے والدین کی جائیداد پر لات مار دے گا... ..“

”بس، بس!“ میں نے ماسٹر چڑت لال کا منہ چوم لیا: ”آپ سچ سچ ایک

عظیم آدرش پر قلم بنایا ہے ہیں کہ امیروں کو غریبوں سے عشق کرنا چاہیے اور غریبوں کو امیروں سے دانا کہ ملک میں حقیقی سرسبز شرم آسکے۔ میرا مطلب ہے کم از کم قلموں میں تو سرسبز شرم آہی جانا چاہیے۔۔۔۔۔ آپ اس کہانی کو فراموش سے پیشتر قلم اڑائیے میری طرف سے اجازت ہے۔“

یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کیونکہ یہ ایک غیر مشرقی افکار نقل ہوتا۔ اگر ماسٹر حُریت لال کی کہانی میں ترمیم و تفسیح کے مشورے دیتا اور حُریت میں دیکھی ہوتا اور ماسٹر حُریت کے تازک جیسے پریمی چہرہ تھا جلاتا۔ اللہ جاتے جاتے میں نے ماسٹر حُریت سے یہ ضرور کہہ دیا کہ ان میں ایک لڑکے یا ایک لڑکی کو کسی حادثے یا جھگڑے میں مداخلت ڈالنے بلکہ ان دونوں جوڑوں کی خرابی اور شادی کو روکا جائے کیونکہ ملک کو اس وقت خرابی شادی شدہ جوڑوں کی اشد ضرورت ہے۔

ماسٹر حُریت نے کچھ بچہ بچے سے وعدہ کر لیا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔ حالانکہ اگر وہ اپنی قلم میں سٹیج کے لڑکے کو عمر قید دلا دیتے اور اس کی مجبورہ کو جو گن بنا کر بندھ دیا چل پہاڑ کی طرف بھیج دیتے تو بھی مجھے کوئی خاص اعتراض نہ ہوتا۔ کیونکہ قلموں میں ایک فارمولہ استعمال کیا جائے یا دوسرا فارمولہ۔ انجام ہر قلم کا یہی ہوتا ہے کہ قلم سسر کرنا فاضل مل جاتا ہے اور قلم شارگو رنٹ کا انکم ٹیکس دیا لیتے ہیں اور نیشنل اپوارڈ پکارتے اہل ہو جاتے ہیں۔

آٹھ دس دن بعد ماسٹر حُریت لال اچانک پہر نمودار ہو گئے میں نے پوچھا ”سنائیے ماسٹر جی! آپ کی قلم کس منزل میں ہے؟“

اس دن ان کے انوسٹاک قسم کے چہرے پر ایک عجیب سی رونق چھائی ہوئی تھی۔ ان کے ہاتھ میں ۵۵۵ کے سگریٹس کا ٹینی تھا، اور سوٹ بھی نیا ڈرائی کا مین کیا ہوا تھا۔ احمقوں کی طرح جیسے ڈانس کرتے ہوئے ہوئے، ٹکر صواب! مبارک ہو ایک نیا سسر مل گیا ہے۔ جو اس قلم پر چار لاکھ روپے صرف کرنے پر

آباد ہو گیا ہے۔۔۔ کہاں اسے پتہ لگتا ہے۔“

میں نے پوچھا: ”مبارک باد کے بعد عرض ہے کہ ناسرکون ہے اور وہ بھی کوئی احمق ہی ہو گا کیا کام کرتا ہے۔“

وہ سرگوشی میں بولے: ”کسی کو بتائیے گا نہیں۔ وہ بلیک مارکیٹیا ہے۔ اس کے پاس دس بارہ لاکھ روپے کا کالا دھن ہے۔ اور وہ بھی بطور قلم پروڈیوسر مشہور ہونا چاہتا ہے۔“ میں نے خورجی چھینے ایک ٹنڈی آہ بھری اور بظاہر خوش ہو کر کہا: ”ما سٹر جی! آپ نے پروڈکشن کے لئے نہایت مناسب آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ ہمارے ملک کی یہی دگر کل رسیٹ چلی آئی ہے کہ اسٹ اور لٹریچر کی خدمت اور سرپرستی صرف بلیک مارکیٹری کرتی ہے۔ ظہور کے ذریعے سوشلزم لانے کا سہرا صرف کالے دھن والوں ہی کے سر بندھے گا۔ تو آپ کتنا جادو جادو! کیونکہ قلم سازی کا مرکز تو یہی ہے۔“

وہ بولے: ”اوہ! مگر بھی بوا دھوئے سے پہلے میں آپ سے یہ مشورہ کر لے آیا ہوں کہ قلم کے لئے میری کس کو لیا جائے؟“

”کسی کو بھی لے لیجئے۔“ میں نے بے پروائی سے جواب دیا: ”دوسرے ہاتھ میں ہوتو آپ کسی بھی ظلم ساز کی روح یا جسم خرید سکتے ہیں۔ راجندر کمار، راج کمار، پریم کمار، انوپ کمار کوئی بھی کمار آپ کی قلم میں سرورج سکتا ہے لیکن آپ کی قلم میں تو دو میرو تھے نا؟ ایک مال کا لڑکا، ایک سینہ کا لڑکا اس طرح تو خرچ دگنا ہو جائے گا۔ آپ یوں لیجئے کہانی میں ترمیم کر لیجئے اور ایک ہیرو کو قلم کے پہلے ہی میں کسی نہ کسی طرح مروا ڈالئے۔“

”نہیں، ناسرک کا کہنا ہے کہ وہ اس قلم پر چار لاکھ کی بجائے آٹھ لاکھ روپے خرچ کر دے گا۔“

”ہب ہب ہرے!“ میں نے داد کی مرلی بجاتی: ”اور اگر وہ آٹھ لاکھ کی بجائے بارہ لاکھ روپے خرچ کر ڈالے تو قلم میں تین ہیرو رکھ لیجئے۔“

”ہرچ بھی کیا ہے، کالا دھن جتنی زیادہ سے زیادہ تعداد میں باہر نکل کر عوام میں تقسیم ہو گا اتنی ہی جلدی ملک میں سوشلزم آئے گا۔ اور خواب! ذرا اندازہ لگائیے کہ جب آپ کی قلم میں انہیں تین مشہور ہیرو ہوں گے اور تین تین ہیرو نہیں تو غلبہ کنگ

آمن پڑوٹ پڑے گی بارہ لاکھ کے چوبیس لاکھ بن جائیں گے اور آپ کی شہرت تین گنی بڑھ جائے گی۔“

ایک ہفتے بعد ماسٹر چرٹ لال پھر میرے پاس یہ خوش خبری لے کر آئے کہ میرا خانا سربارہ لاکھ روپے کی بجائے چودہ لاکھ روپے خرچ کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ چونکہ بغیر سوچے سمجھے جو قلمیں بنائی جاتی ہیں وہی کامیاب ہوتی ہیں، کہ گہرائی کی کوئی ضرورت نہیں، آپ اس قلم میں ایک دہلیں کو شامل کر دیجئے کیونکہ دہلیں بھی مرتبہ ہی ہر سو سے کم نہیں ہوتا۔“

مگر ماسٹر جی سوچ میں پڑ گئے۔ چند سکند تک اپنی پیشانی پر انگلیاں بجاتے رہے۔ جیسے سوشلزم اور ملک کا مستقبل ان کی پیشانی کے اندر پھنس گیا ہو۔ اور پھر غمگین ہجے میں بولے۔ مگر فکر صاحب! میں نے تو یہ سوچا تھا کہ سمیٹ کے لڑکے کو دہلیں کے روپ میں پیش کیا جائے۔ یعنی دہلیں تو قلم میں پہلے سے موجود ہے۔“

میں نے دست ابنہ عرض کیا۔ ”ایک کی بجائے دو دہلیں بنا دیجئے آپ کا کیا بگڑتا ہے۔“

”لیکن دو دہلیوں کو قلم میں مروانا بڑے گا۔“
 ”مت مروائیے، آپ تو خدا ہیں۔ جلاتا اور مارتا آپ کے اختیار میں ہے عام قلموں کے راستے سے ذرا ہٹ کر قلم بنائیے اور آخر میں دو ذوں دہلیوں کی شادی کر دیجئے۔“

”مگر فکر صاحب! وہ پریشان ہو گئے۔“ دہلیں کیسے شادی کر سکتے ہیں شادی تو آخر میں سہرہ رکن کی ہوتی چاہئے۔“

”افو! آپ سمجھے نہیں۔ قلم کے پہلے حصے میں دہلیں کو بہ طور دہلیں پیش کیجئے دوسرے حصے میں دہلیں اپنے گناہوں کا اعتراف کر لے اور سہرہ رکن جائے آپ شاید نہیں جانتے کہ سرور دے لیڈر تو بامعاذے جی نے تالیف قلم کے سلسلے

میں ایک تحریک چلائی، سختی اور مدھیس پر روش کے ڈاکٹروں کے دل تبدیل کروا دیئے تھے، تو کیا آپ کے دلیں بٹھپا تا پ نہیں کر سکتے؟“
 ”کر سکتے ہیں۔“ وہ ایک مجبور اور محسوس خجھی کی طرح بولے۔
 ”تو بس اب جاییے اور کہانی میں یہی مزیم کیجئے۔ میری دعائیں اور خناسر کا دھن
 آپ کے ساتھ ہے۔“

اس کے بعد ماسٹر چریت لال جی گئی بارمبہ سے ملنے رہے کیونکہ انھیں اپنی فلم کہانی
 میں گئی بارمز میں کرنا پڑی تھی بارمیرے کہنے پر تریمیم کی ایک بار خناسر کے کہنے پر، ایک
 بار خناسر کے سارے کے کہنے پر کیونکہ وہ سال اس فلم میں بطور سائنڈ میکر کام کرنا چاہتا
 تھا۔ ایک مرتبہ سالے کی پہنچ سالہ خفی بیٹی کے کہنے پر کیونکہ اس نے مندر کی سختی کہ انکی ٹھیکے
 اپنی فلم میں رول دیں دیکھتے چنانچہ خفی بچی کو ”اکاموڈ میٹ“ کرنے کے لئے نصیحت کہانی دوبارہ
 لکھنا پڑی۔ ایک ڈسٹری بیوٹر کے کہنے پر جو خناسر کے سالے کا بہنوئی تھا اور اس نے
 فلم میں دو لاکھ روپے لگائے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ ————— مالی کے غریب لڑکے
 کا عشق ایک ڈائسر سے کروانا پڑا کیونکہ اس کے بہنوئی کی بیوی ڈائسر تھی۔ غرض
 تریمیم کے اید حبب آخری شکل میں کہانی مجھے ملانی گئی تو، ماسٹر چریت لال
 کی حقیقی کہانی کی قبر کے اوپر گئی قبر میں جکی نفیس اور اصلی قبر کو پہچاننا مشکل ہو گیا
 تھا۔

ہر کیف ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ وہ عظیم فلم کہانی کا ماسٹر چریت لال
 اپنے بیوی بچوں سے یہ کہہ کر خجھی کی طرف روانہ ہو گیا ہے کہ میں جلد ہی بطور مشہور
 پروڈیوسر خفیس بیٹی بلالوں گا۔

اس کے بعد دو مہینے تک ماسٹر چریت لال کی کوئی اطلاع نہیں ملی اور میں بھی
 سوچ کر خاموش ہو گیا کہ ماسٹر چریت لال نے مندر ساگر میں خودکشی کر لی ہوگی۔ اس
 خودکشی پر مجھے صرف اتنا اندوس ضرور ہوا تھا کہ فلموں کے ذریعے سوشلزم آنے

تذکرہ تاخیر مر جائے گی۔

مگر دو مہینے بعد چونکہ ایک دن کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا تو ایک مرجھایا ہوا چہرہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے کہا، ”فرمائیے“

وہ بولا، ”آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں ماسٹر حرپت لال ہوں۔“

میں نے بڑھ کر اس کو سینے سے لگا لیا اور کہا، ”پہچانتا کیسے ماسٹر جی! آپ کے چہرے پر تو سنو شلزم چھا گیا ہے۔ یہ سیاہی، جھریاں، یہ جھانکتی ہوئی ٹہنیں آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“

وہ بولا، ”مجھ سے سخت دھوکا کیا گیا فکر صاحب! میری وہ کہانی کسی دوسرے پر ڈھلوس رہی چرالی۔“

”کیسے؟ وہ کہانی تو پہلے ہی کئی فلموں سے چرائی ہوئی تھی، چرائی ہوئی کہانی کو کس نے چرا لیا؟ یہ بھی کئی فلم ساز تو بڑے احمق ہیں!“

ماسٹر حرپت لال کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور دھیمی فریادیوں کی طرح اپنی دردناک داستان سناتے رہے۔ بات دراصل یوں ہوئی کہ جب سارے معاملات طے پا گئے تو ہم نے فلم کی شوٹنگ شروع کر دی، اسٹوڈیو، فلم شارڈ لال اور کئی دوسرے پیشہ ور لوگ مل جل کر ہمارا دولاکھ روپیہ کھا گئے۔ اور جب دو ریلیں بنی گئیں تو چونکہ ایک دن اسٹوڈیو کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا، معلوم ہوا کہ ہمارے فنکار صاحب کے خلاف سرکار نے اسمگلنگ کا کیس بنایا ہے۔ اور اس سلسلے میں اسے گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ کیونکہ یہ سارا کالا دھن اس سے لے کر کاننگ کے ذریعے کمایا تھا۔ چنانچہ فکر صاحب! حیب ہمارا فنکار گرفتار ہو گیا تو فلم کی شوٹنگ رک گئی، اور میں

”.. .. آپ کی کہانی تو گرفتار نہیں ہو گئی، آپ اسے کس اور پر ڈھلوس کر دے دیتے!

ماٹر چڑت لال نے پانچ کلو میٹر ایسی گاہ بھری اور کہا : یہی تو دکھ ہے فکر چھٹا :
 کہ اس فٹائٹر کے سلسلے نے میری وہ کہانی اٹھا کر ایک اور پروڈیوسر کو سنائی
 تو معلوم ہوا کہ بالکل ایسی ہی کہانی وہی پروڈیوسر پہلے بھی خرید چکا ہے ۔ اور اس کی
 بنیاد پر ایک فلم تیار کر رہا ہے ۔ حیرت ہوئی ہے کہ میری یہ کہانی کس بے ایمان نے
 چیرا کر اس پروڈیوسر کے ہاتھ پہنچ دی ؟

بیوی کے ہجر میں

اچانک میری بیوی کے اعلان کیا کہ وہ ایک ہفتے کے لئے میکے جا رہی ہے حالانکہ وہ اس سے پہلے کبھی بارگاہِ تنہا تھی مگر اب میں سسرال کو میکے بھی سمجھتی ہوں اور ادھر میں کئی برس سے احمد آرکھ رہا تھا کہ میں بتا رہے ہجرت لذت اٹھاتا چاہتا ہوں۔ اس لئے ہم کہیں دفع ہو جاؤ۔ لیکن وہ کبھی تنہا کر بھر صرف ایک شاعرانہ تکلف ہے۔ اس سے میرا گھر اجڑ جائے گا میری غیرت منہ می کچن کا ایک چھپے ہو گیا جو لقیۂ گم ہو جائے گا تو تار و پھ میں میرا نام سیاہ حرفوں میں لکھا جائے گا۔

مگر یاد رہے کہ ایک دمچے سے زیادہ وقعت نہیں دیتی تھی۔

ساتھ سال کے تلخ تجربے کے بعد میں مایوس ہو گیا کہ میری بیوی سے کوئی مفصلندی سرزد نہیں ہو سکتی۔ خداوندِ کریم سے یہی جتنی رقت امیگز دعا میں مانگیں بسبھی راہگاہ گیتی دراصل میری پرالم قدرے آرٹسٹک تھی کہ وہ نہ کا نا لفظ بدلنے کے لئے ماحول میں کبھی کبھی کوئی تبدیلی ضرور آتی چاہئے۔ میری کیا بوجھیں؟ ایک طرح کی تبدیلی تھی۔ حسب اس کا نا لفظ بہت لذتہ ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ میری پختہ دوست خری میری تھی۔ بلکہ اس کا حشر مانہ کرنے کے لئے میں اسے اکلوتی بیوی مسمی کہہ دیتا تھا۔ لیکن یہ بات بھی نامناسب تھی کہ جب بھی خام کو گھر لڑنا تو گھر میں کہا پرانی جانی بھئی نا میری ملتی تھی صرف بیوی ہی نہیں۔ کچن میں کیتکی بھی وہی ملتی تھی۔ چچہ وہ جہیز میں لانی تھی۔ ایک دن بدمعاش

میں نے بیوی کا بدلہ کتلی سے لینا چاہا اور کہا: "اب اسے ریشاٹر کر دو اور زخمی ہوگئی ہے۔" وہ بولی نہیں، میں اسے جیتے جی الٹ نہ کروں گی۔ کیونکہ اسے دیکھ کر ہی مجھے لا کی مشیریں یاد آ جاتی ہے۔"

میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو پر جا لیا کہ وہ یا تو کتلی سے محبت کرتی ہے یا نا سے۔ مجھے سے محبت نہیں کرتی، مجھے تو صرف ٹھہر کر نیم پیٹ سمجھتی ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار اس نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ یہ گھونیم پیٹ کے بغیر بھی مکمل ہے۔ اس دن میں باپ کے ایک سیکنڈ ہینڈ سوئیٹر خریدا لایا، اسے دیکھتے ہی محترمہ کا پارہ گرم ہو گیا کہ میرے مشورے کے بغیر یہ میری منظور سی سوئیٹر کیوں نہ آئے؟ بولیں، میں پچھتی ہوں، کیا یہ سوئیٹر سے؟ گھٹنا گھٹیا اور کھٹا جھگڑا؟

میں نے سچ کر کہا: "ہاں ہاں، میں جو لایا ہوں۔"

بولیں، تو کیا آپ اس ٹکڑے میں کبھی کوئی بھی کام کی چیز لائے ہیں؟

میں نے کہا: "ایک تو تمہیں لایا ہوں۔ اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" اگر وہ وسیع الفلب ہوتی تو اس بچے پر مسکراتی، لیکن الٹا نیٹ گھٹا نیٹ کے لپٹ پر جا بیٹھی اور کہنے لگی۔ یہ میرے والد صاحب کی غلطی تھی، میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

رہ جائے کیوں اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ گھڑا کیت بیاباں ہے جس میں وہ ایک پھول کی طرح کھل جاتی ہے۔ اگر یہ پھول ایک دن کے لئے بھی آوٹ آوٹ اسٹیش ہو گیا تو یہ گھر بھر بیاباں ہو جائے گا۔ اجڑ جائے گا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ ہر روز پھول کی خوشبو اور رنگ سے بھی انسان بڑا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کسی دن گھر کی بیابانی سے بھی نطفہ اٹھایا جائے۔ بلکہ بھر کا نو ذہا شاکر ایک غزل بھی لکھ لی جا کے لیکن آہ میں یہ دیکھ کر قریب قریب مایوس ہو گیا کہ غزلوں کا مستقبل بے حد تاریک ہے۔

لیکن اس دن پر اعوان سنکر مجھے حیرت ہوئی اور ستر تھیں کہ وہ ایک ہفتہ کے لئے میک بارہی ہے۔ یعنی میرے سارے اندازے غلط تھے، چنانچہ میری بیوی اتنی

نالائق نہیں۔ ذرا تم ہر تویر مٹی بہت زرخیز ہے ساقی
اور کہ اس مٹی سے تو غزلوں کے کئی دیوان آگ سکتے ہیں !

حجر کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اس نے ایک نئے تہہ ہدایت نامہ خواہندہ لکھ کر
لٹکا دیا اور کہا کہ ہر روز صبح اٹھ کر اس کا پانچہ کیا کرو۔ خلا ان میں سے ایک دو ہر تین
پنچیس۔ ہر روز چہے دان میں پیاز کا ایک ٹکڑا لٹکا دیا کرو۔ ایک پیاز سے کم از کم تین
چوبیس کا شمار لازمی ہے۔ پیاز کے اس اسٹینڈرڈ کو قائم رکھا جائے اور میری واپس
پہر اعداد و شمار کے ساتھ رہبر مٹی کی جائے۔ بڑی سس سس کا تین سلائی نہ کیا جائے
مہارے گھر میں اس کی عینی کی ایک پلیٹ موجود ہے۔ لیکن میری عدم موجودگی میں اس
کے ساتھ کوئی نہیں دین نہ کیا جائے۔ اور قیسری اور بڑی سیرسی ہدایت یہ تین کہ اول
تو اپنے کسی دوست کو گھر میں مدعو نہ کیا جائے اور اگر کوئی اپنی بیوی سے نالایا ہو کر جہاز
گھر میں بنا ہا لینے کے لئے آ بھی جائے تو اسے ڈرامنگ روم میں بیٹھ کر سگریٹ پینے سے
منع کر دیا جائے۔ کیونکہ وہ سگریٹ کی راکھ سے قالین کا بیڑہ غرق کر دے گا اور اپنے ملازم
کے کان میں چپکے سے کہہ گئی کہ ایسے ہر دوست کا نام، حلیہ اور ایڈریس نوٹ کر لیا کرو
میں ان سے قالین کا کلیم وصول کروں گی۔ رمل چھوٹنے سے تین سینڈ پہلے دھکی
دے گئیں کہ اگر کوئی ہدایت مجھے میکے میں دے گی تو ٹیلیگرام کے ذریعے بھیج دوں گی۔

بیوی کے جانے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا دیر لڑنے بے حد رونا ٹٹکا ہوتا ہے
اس کے فرشتوں نے میری چھت پر ٹٹکا پھیلا دیئے اور کہا "مبارک ہو!" "خس خاسے
گھا تو بے اختیار جی جا رہا۔ زور زور سے گانا شروع کروں۔ سٹے سے گزرا تو ہر عورت
حسین اور دلکش نظر آئی گھر کی آبی نے اگر مودبانہ سلام کیا اور اس بچے میں میاؤں کی
جیسے کہہ دیں ہو۔" مالک دودھ کہاں رکھا ہے؟ ناچ کر کھڑک لگی ہے۔ اجازت دیجئے
تا کہ بیویوں میں جانتی ہوں کہ دستا چلانا آپ کے شایان شان نہیں، دھول نے اگر
گھنٹی بجائی اور جب میں نے اسے بتایا کہ بی بی جی میکے گئی ہیں تو وہ گتاخ بولا۔ "مبارک
ہے تو کوئی بات نہ کرنا فضول ہے۔" میں نے کہا "کوئی حساب کتاب کی بات ہو تو سنا سنا جاوے۔"

لیکن وہ بولا : آپ کی سمجھ میں نہ آئے گی ۔

دھوئی کے اس نقطہ نگاہ سے مجھے شغل ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے اس کی گنت حتیٰ کو فراخ دلی سے نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ میں سماع سے تندر تازہ آزاد ہوا تھا اور آزاد انسان بہت فراخ دل ہوتا ہے۔ میں آزادی کی صفنا میں کھل کر سانس لیتا چاہتا تھا۔ کسی سے تنازعہ کر کے اپنے موڈ کو کند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے نوکر سے کہہ دیا کہ اب میرا پنچ اور ڈومڑا ہر ہی رہے گا۔ لیکن اس کے باوجود ہماری تنخواہ میں کمی نہ ہوگی کیونکہ میں بی بی جی طرح باجی ذہنیت نہیں رکھتا۔ کچا برس بعد پہلی بار ہٹل کے کھانے میں وہی لطف آیا جو کھانا رہنے میں آیا کرتا تھا۔ آہ میں کھانا رہنے سے کتنا محروم ہو گیا تھا ! احباب کو بے تکلف دعوت دی کہ آؤ ماش کھیلو، سگریٹیں پھونکو۔ بستروں پر شکنیں ڈالو، بلکہ ایک آدھ پانگ کا پائیر بھی توڑ سکتے ہو ! چائے کے کپ پر کپ لٹھاؤ، کسی رولز اینڈ ریگولیشنز کے بغیر بے جہاد، ناکام سرورس کی جائے گی رات کو بہت لمبے آنے میں ایک سرورس کرنے لگا۔ چیونٹوں نے گھر کے واسے دن کے چرسل حملے شروع کر دیے۔ لیکن انھیں ڈسٹرپ نہیں گیا۔ چڑیاں میرے گھر کو اپنا آبائی دلش سمجھ کر گھسولنے پر تھوڑے نیسے بنے۔ لگیں اور سارے کدوں میں جنس و خاں شاک بکھیر دئے۔ لیکن میں نے ان کے ذاتی معاملہ میں مداخلت کرنا ضروری نہ سمجھا۔ یہاں تک کہ ایک چڑیا بار بار چڑے بدل بدل کر لاتی رہی۔ لیکن پھر وہی ذاتی معاملہ۔ جو بے تک میری فراخ دلی سے شیر ہو گئے۔ وہ چرے دان کو اپنا دان منت دیکھا کہ میں گزر جانے جیسے کہہ رہے ہوں۔ استیاں مجھے کو ڈال، اب ڈر کا ہے کا ! اب تک فرق ضرور تھا کہ بیوی کے چلے جانے کی خبر سن کر کوڑوں نے آنا بند کر دیا۔ کیونکہ ان کا راشن ڈپو بھی ٹیکے میں بند گیا تھا۔

تین چار دن اس آزادی بلکہ آزادہ روی میں مہنی خوشی، چٹک چھپکتے گزر گئے تو پانچویں دن اچانک خیال آیا کہ بھری لذت تو ثمال نہیں۔ ہجر تو اللوں نلدوں میں گزر گیا اور محسوس ہوا کہ لوٹ بھی آئیگی ماما کے پاس پر چھپیں گی۔ کہاں کہیں سب وہ غزل و اورنگی میں ہے یا ایک قیمتی مہنتہ منافع کر دیا ؟ لیکن شادی کے بعد میں نے رشتہ عری کو

جلاد مل کر دیا تھا۔ اس لئے بیوی کے نام ایک ہجیر خط لکھنا ہی مناسب سمجھا اور خط لکھنے لگا۔

”اے جان بہار و خزاں !

جب سے تم گئی ہو، کوئی نے تمہارے فراق میں کالمیں کالمیں کرنا چھوڑ دیے۔ بادل صرف گرج گرج کر رہ جاتے ہیں، برستے نہیں۔ نہ جانے انہیں کیا غم ہے۔ چاند لڑکی جھپٹکتی ہے تو دعاؤں میں مارنے کو جی چاہتا ہے۔ کل تان پور کے تاروں کو چھیڑا تو وہ جیسے کر لاکر لاکھنے لگے۔ ”لوٹ کے آ، لوٹ کے آ جا میرے میت ! اور پیاری ! سبکے بڑا ظلم تو یہ ہوا ہے کہ جنگیں جیتے ہو گئے۔ راشن ڈپو پر گھنٹیا آٹا ملنے لگا۔ غرض تمہارے ہجیر کوئی چیز اپنے ٹوکے پر نہیں رہی۔ یہاں تک کہ کل الماری میں تمہارا گہنوں کا ڈبہ دیکھا تو وہ بھی غائب تھا ! چور لے گئے یا تم اپنے ساتھ لے گئیں۔ جب تک تم لوٹ کر نہیں آتیں، میں تمہارے میں گہنوں کی ہٹ نہیں لکھا سکتا۔ اس لئے آجاؤ آجاؤ۔ میری خاطر نہ سہی گہنوں کے ڈبے کی خاطر ہی آجاؤ۔

یہ ہجیر خط لکھ کر لفافے میں بند کیا اور بیوی کا ایڈریس لکھا کہ دھڑک سے دروازہ کھلا اور بیوی اندر داخل ہوئی۔ بولی۔ کیا لکھ رہے ہو؟ میں نے کہا کچھ نہیں ایک بے معنی سا خط ہے۔ لیکن تمہاری جلدی کیوں رہی؟ بولی۔ کل رات میں نے سپنا دیکھا کہ آپ کو چھپر کاٹ رہے ہیں۔ دو ہینڈ مار کر کہا۔ ”ہاتھ! میں بھی کتنی مالالتی بیوی ہوں۔ چھپر والی تو سٹور میں بند کر کے رکھ آئی ہوں۔ سو جا چلوں انہیں چھپر والی تو نکال کر دے آؤں۔“

ہجیر کا ایٹھی کلاؤ مکس۔

بھور بیوی کے اس غیر ضروری وصال پر سارا راسخ ہی پلٹ گیا اور محض مہینے ایک ہی دن میں اپنا اقتدار بحال کر دیا۔ ہجیر کی ساری سرگرمیاں پس منظر میں چلی گئیں۔ میں ”سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے!“ ہی کر رہ گیا کہ اچانک وہ سری

صبح کو پوسٹ میں عروت نامہ میرے مجھے ایک ڈلیٹر لاکر دیا۔ یہ خط میری آنے والی میکے سے شام کو پوسٹ کیا تھا اور اسی راستہ کو میجر دانی کا خواب دیکھ کر صبح گھڑی پر سوار ہو کر گھر واپس آ گیا۔
 نقیب یعنی جنوں محبت میں کیفیت کچھ ایسی ہو گئی کہ خط بعد میں پہنچا، محبہ پہلے پہنچ گئی! میرے منہ سے بے اختیار (بیوی کی حمایت میں) غالب کا یہ شعر نکل گیا۔

خدا کے واسطے دادا اس جنوں شوق کی بنا کہ اس کے در پر پہنچے ہیں نامہ رس ہم آگے
 یہ خط نہیں تھا، ہجر کا ایکٹی کلا ٹکس تھا۔
 اور اس میں لکھا تھا۔

بڑے پوپ، چھوٹے پوپ، من مبرا ایک اور من مبرا کے آیا جی!

میں یہاں بچوں سمیت خوش ہوں، امید ہے آپ بغیر بچوں کے خوش ہوں گے بچے ہر روز آپ کو یاد کرتے ہیں بچے ہیں نا، کچھ بوجھ نہیں ہے، انھیں لاکھ سمجھائی ہیں کہ اگر تمہارے آبا کو تمہاری یاد تازے کی تو بھائے آئیں گے۔ لیکن وہ پہلے ہی میری کوئی بات نہیں مانتے تھے۔ اب کیا مانتی گے۔ دراصل آپ ہی بچوں کو بگاڑ دیا ہے۔ جب میں انھیں لے کر گھر لوٹوں گی تو ان حذری بچوں کی تپائی کھڑو کیجئے گا تا کہ انھیں سبق مل جائے۔

باقی یہاں پر خیریت ہے۔ آپ کی خیریت کی چنتا رہتی ہے کہ نہ جیلے آپ نے میرے بیڑ گھر کا کیا حال بنا رکھا ہے۔ پانی کا نل کبھی کھلمت چھوڑے گا۔ بستر مگر ریٹ کی راکھ جیاد ہے پر ہنر کیجئے گا۔ میں پلنگ کے ساتھ والی تپائی پر امیش ٹرے رکھا آئی تھی۔ کپڑے میلے ہو رہے ہیں۔ لڑکیاں فرسٹ پر اور کوڑوں کھڑوں میں مت بھینک دیجئے گا کیونکہ اس طرح جوہوں کو کزنز کا گولڈن مائنس مل جاتا ہے۔ مجھے رہ رہ کر شک ہوتا ہے کہ وہ ایسی ناک والی ڈرو سٹا میری عدم موجودگی سے شر پا کر اپنے چہرے ہمارے گھر کی طرف ہانک دے گی آپ کو اپنے گھر کے اور چڑو سٹا کے چہروں کی پہچان رکھنی چاہیئے۔

اور اپنی باتوں کے حذر سے میکے میں راجی نہیں لگتا۔ ہر لمحہ حجاب خانہ پر دگا کر اڑتا رہا اور آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ یہاں شپال سے سگ لگنے کی سازشیں آئی ہوئی ہیں۔ سستی بھی ہیں اور خرابیوں سے بھی۔ میں نے ایک ساڑھی خرید لی ہے۔ اب تو نامہ

بیعہ دیجئے اور ہاں آپ کے لئے سسکلنگ کا ایک ادنیٰ سوٹ خرید لیا ہے۔ خامی کی سالگرہ برا آپ کو پیش کر دوں گی۔ لیکن سلواؤں کی مینجہ اینڈ کمپنی سے۔ آپ کے پرانے ٹیلر ماسٹر مقرر مجھے اینڈ کمپنی سے نہیں۔ وہ تو لیسٹریے ہیں۔

اور کیا لکھوں؟ آپ گھر کے حالات تکبیس تو میں بھی ان کی روشنی میں آپ کو کچھ مزید لکھ سکوں۔ چھوٹی مٹی کے خنٹے منہ انگوٹھے کا عکس اس خط پر بھیج رہا ہوں اسے چوم لینے۔ میں نے چوم لیا ہے۔ ٹکرتہ کریں۔

آپ کی

بڑے بچہ، چھوٹے بچہ، مٹی نمبر ایک اور
 مٹی نمبر دو کی ماں“
 (دو خط اصلی ہیں)

شوخی و گفتار

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا

اور سائیں بابائے کہا

منہ مانگی موت

ایک بخت و نزار بوڑھا بھنگی چار پائی پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔
 ”آہ! نہ جانے موت کب آئے گی؟“
 اتنے میں موت آگئی اور بولی۔

”بابا میں آگئی ہوں!“

بوڑھا تاراض ہو کر بولا

”بڑی بے وقوف ہو۔ میں نے تو اپنے رٹکے کو بلایا تھا۔ کہ وہ آکر میری خبر
 گیری کرے۔“

موت نے کہا۔

”بابا! میں تمہارا رٹکا ہوں“

دو دوست، دو دشمن

جنگل میں جاتے جاتے سائیں بابائے تو سمجھا کہ ایک کڑیا لاسانپ مرا پڑا ہے
 چند قدم کے فاصلے پر ایک نیولا بھی مرا پڑا تھا۔

سائیں بابا نے نیولے کو اٹھایا اور سانپ کے پاس لاکر رکھ دیا۔ سان دوڑی

کی باتیں ایک دوسرے کی گردن میں ڈال دیں۔ بالکل دو دوستوں کی طرح وہ ایک دوسرے کی گردن میں باتیں ڈالے پڑے رہے۔

چند منٹ تک سائیں بابا انھیں دیکھتا رہا۔ اچانک ان دونوں میں ایک حرکت سی پیدا ہوئی۔ دونوں میں زندگی کی ہر فوٹ لگئی۔ دونوں نے آنکھیں کھول کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

اور پھر دونوں آگ بگولا ہو کر ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔

کامیاب یتیم خانہ

یتیم خانے کے انچارج نے مجھے بتایا۔

ان سب بچوں کے ماں باپ مر چکے ہیں۔

افسوس!

”افسوس کی کوئی بات نہیں بہم انھیں پالیں پوسیں گے۔ انھیں کام سکھائیں گے۔ انھیں باروزگار سکھائیں گے ان کی شادیاں کر دیں گے۔ ان کے بچے پیدا ہوں گے۔“

”اور پھر ان میں سے کیسوں کے بچے یتیم ہو جائیں گے۔“ افسوس!

افسوس کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ ہم انھیں پھر یتیم خانے میں داخل کر دیں گے۔ آپ شاید نہیں جانتے کہ ہمارا یتیم خانہ گزشتہ ایک سو سال سے قائم ہے اور بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔

حسن کی قیمت

ایک مشہور و معروف مصور نے ایک حسینہ کی تصویر بنائی۔ اس حسینہ کے خد و خال میں اتنی نزاکتیں اور جسم میں اتنی قوسیں تھیں کہ تصویر دیکھتے ہی ہر شخص اسے خرید لیتا اور اپنے سینے سے لگا لیتا۔ اور حبيب تصویر ایک بین الاقوامی نمائش میں پیش کی گئی تو اسے اعلیٰ درجہ کا حسن قرار دیا گیا۔ اور وہ تصویر ایک بھکاری

کی مٹی جو آج بھی سڑکوں پر ایک ایک پیسے کی بھیک مانگتا پھرتا ہے!

حسین کون ؟

”تیس لے چکڑے پوچھا۔ دنیا میں سب سے زیادہ حسین کون ہے؟“
 اس نے کہا چاند۔ ”میں نے ایک سیٹھ سے پوچھا: ”سب سے زیادہ حسین کون ہے؟“ وہ بولا
 ”تدبیر“ میں نے ایک طوائف سے پوچھا: ”سب سے زیادہ حسین کون ہے؟“ وہ بولی
 ”گلاب“ میں نے ایک تنھے سے بچے سے پوچھا: ”سب سے زیادہ حسین کون ہے؟“
 ”کہا“ ”وہ وہ!“

اور پھر میں نے ایک باگل سے پوچھا: ”تبا کو تمہارے خیال میں سب سے زیادہ
 حسین کون ہے؟“ اس نے ہنس کر کہا۔ خود میں۔

حسینہ کی نگاہیں

حسینہ نے درخت کی طرف دیکھا تو درخت پر پھول کھس اٹھے حسینہ نے ایک
 کار کی طرف دیکھا تو اکریش میں کاروں کا رخ دوگنا ہو گیا۔ حسینہ نے ایک پتھر کی طرف دیکھا
 تو وہ سنگ مرمر میں گر محل میں جا لگا۔ اور حسینہ نے شراب کی بوتل کی طرف دیکھا تو اس
 کی پرستش شروع کر دی گئی۔

لیکن حسینہ نے جب ایک انسان کی طرف دیکھا۔ تو اس انسان کو اس نے
 لے پھا نسی پر لٹکا دیا۔

بیاد و عاشق

ایک میاں بیوی ایک عاشقانہ فلم دیکھ کر آئے اور گھر آکر دونوں فلم کے
 ہیرو ہیروئن کی طرح عاشقانہ مکالمے بولنے لگے۔

”اے“ ”پیارے!“ یہ چاند اور تارے گرا رہے ہیں کہ میں تمہاری خاطر

اپنی جان تک دیدوں گا۔“

بیوی نے کہا: ”پیارے! میں تمہاری خاطر سارے سماج کو ٹھکرا دوں گی اور تمہارے پاس آجائوں گی۔“
اور پھر دونوں نے بیک آواز کہا: ”یہ کالمے تو شادی سے پہلے کے ہیں۔“

قحط کا مقابلہ

شہر میں غذائی قلت پڑ گیا۔ معززین شہر نے بڑی تیزی سے غلے کے اشاک سرے لوگوں میں بٹا کر رکھ گئی۔ اناج کا دانہ دانہ بلیک مارکیٹ میں ملنے لگا۔ فٹ پاتھوں پر چلتے چلتے قاتر کش اچانک گر پڑتے۔ اور دم توڑ دیتے۔ ہاتھ دعاگوں کو اٹھتے مگر نقصان سے ٹک کر رہ جاتے۔

اور پھر شہر کے بڑے حاکم نے صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک طبیع کیٹی بنائی۔ اور اس کیٹی میں جتنے ممبر لگے گئے وہ سب غلے کے بلیک مارکیٹ تھے۔

بے روح فقرے

ایک معزز آدمی نے اپنے گھر کے اندر ایک ہنایت خوبصورت فریم میں مندرجہ ذیل ماٹو لکھ کر ٹکا دکھا تھا۔

”بے ایمان آدمی جہنم میں جاتا ہے۔“

”امانت میں خیانت کرنا گناہ ہے۔“

”کسی کا حق چھیننا بزدلی ہے۔“

اور جس آرٹسٹ نے یہ ماٹو لکھا تھا، وہ اپنی اجرت حاصل کرنے کے لئے عمر

بھر بتا رہا۔

شہر کے کتے

شہر کے دو معززین کلاب میں بیٹھے نوشی میں مصروف تھے۔ ایک معزز

بشرنے اُترنے ہوئے کہا۔

”اے اگر میں جا ہوں تو شہر کے تمام کتے تم پر چھڑ سکتا ہوں۔“

دوسرا معزز بولا۔

”مگر کتے لاؤ گے کہاں سے؟“

”میں شہر کے تمام کتے خرید لوں گا۔“

”وہ تو پہلے ہی خرید چکا ہوں۔“

”کس لئے؟“

”تم پر چھوڑنے کے لئے۔“

الو کھا مریض

شہر کے مشہور و معروف ڈاکٹر چرویدری کے مطب میں ایک بٹاکا مریض، قح

ہوا اور ڈاکٹر کے قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

”ڈاکٹر صاحب! میں آپ بات کی ہر بیماری کا علاج کرتے ہیں۔“

”آپ نے ٹھیک بتا ہے۔“

مریض بولا: ”ڈاکٹر صاحب! مجھے ایک ہناسیت خوشاک اور کہنہ مرض ہے۔ آپ

میرا علاج کر دیجئے۔“

ڈاکٹر نے: ”فرمائیے، کیا مرض ہے آپ کو؟“

مریض نے کہا: ”میں نے ڈاکٹر کے منہ پر ایک گھونٹہ بھایا، میرے پرچہ اور ڈاکٹر

کا ہیٹ اٹھایا اور پھینٹے ہوئے ہاتھ چلا گیا۔“

سائنس دان

سائنس دان اچھلتا کودتا ہوا اپنی لیبارٹری نے اچانک یاہرنکل آیا اور جوش

مست میں اپنے ہاتھ سے بچہ کے دونوں کندھوں کو پکڑ کر بولا: ”نٹھے! نٹھے! تم بچے کو

خوش ہو گئے میں نے آخر وہ حیرت انگیز چیز ایجاد کر لی ہے۔

بچہ بولا: کیا چیز؟

سائنس دان نے کہا: ایک ایسی چیز جس سے میں دنیا کے ہر آدمی کو ایک سینکڑ
میں مار سکتا ہوں۔

بچہ خوش ہو کر بولا: تو ڈیڑھی! پہلے مجھے مار کر دکھاؤ اس چیز سے۔

پتھر۔

ایک پتھر ہر روز گدھے پر سوار ہو کر مدرسے جایا کرتا تھا۔ ایک دن حب معمول
حب وہ گدھے پر سوار ہو کر جا رہا تھا۔ گدھے نے کہا —

”کیوں جی، آپ ہر روز مدرسے میں کیا کرنے جاتے ہیں۔“

پتھر بولا: ”میں لوگوں کو علم سکھانے جاتا ہوں۔“

گدھا بولا: ”علم سیکھنے سے کیا ناکدہ ہوتا ہے؟“

پتھر نے کہا: ”علم سیکھنے سے عقل آجاتی ہے۔“

گدھا کہنے لگا: ”تو پھر ماسٹر جی! مجھے بھی عقل سکھا دو۔“

پتھر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا: ”نہیں، اگر میں نے محض عقل سکھا تو پھر کوئی
کس پر کروں گا؟“

لیڈر

اسبج کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے لیڈر نے نہایت جذبات انگیز بھیج میں کہا: ”پیارے
حاضرین! میری زندگی کا واحد مقصد عوام کی خدمت کرتا ہے۔ میرا ہر قدم عوام کے مفاد
بہا کے لئے اٹھتا ہے! میں نے جتنی قربانیاں کیں وہ صرف آپ لوگوں کے لئے کیں اور مجھے
فخر ہے کہ میں عوام کی تباہی کا عکس بن گیا ہوں۔ کیا آپ میں سے کسی کو بھی میرے اس
خلوص پر شک ہے؟“

حاضر میں سے ایک شخص اٹھا اور بولا "ہاں مجھے شک ہے۔"
یہ سن کر لیڈر نے اس شخص کو اسٹیج پر بلا لیا اور اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھا دیا۔

کلرک

کلرک کی بیوی نے ساتویں بچے کو جنم دیتے وقت درد سے کراہنے ہوئے کہا۔
"آہ بچے بڑھتے جا رہے ہیں مگر ہمارا تختہ انہیں بڑھ رہی ہے۔"
کلرک نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا: "ہاں مگر بچے بھگوان دیتا ہے اور
تختہ اونتر دیتا ہے۔"

وکیل

عدالت میں ایک وکیل بطور ملزم پیش کیا گیا۔ جج نے اس سے کہا: "مناسبت
افسوس کی بات ہے کہ آپ نے قانون واں ہو کر بھی قانون توڑا ہے۔"
ایک وکیل نے سنجیدگی سے جواب دیا: "مائی لارڈ، قانون توڑنے سے
پہلے میں نے قانون کی کتاب اچھی طرح پڑھ لی تھی اور یہ تسلی کر لی تھی کہ اس قانون
شکنی کے توڑ کے لئے کونسا قانون موجود ہے۔"

گداگر

ایک پڑھا لکھا گداگر گنگوڑوں کا لیڈر بن گیا۔ چونکہ اس کا زیادہ تر وقت
گداگروں کی تنظیم امدان کے حقوق کی حفاظت پر صرف ہونے لگا، اس لئے گداگروں
کی طرف سے اس کا ماحول مزید خلیفہ مقرر کر دیا گیا۔ ہر گداگر اس وظیفہ کے پہلے میں ہر چہینے
ایک روپیہ ادا کیا کرتا

ایک مرتبہ گداگروں کے لیڈر سے کسی نے پوچھا "اتو دایہ اچھا ہوا کہ تم سے گداگری
چھوٹ گئی۔ ادا بتم ایک معزز شہری بن گئے ہو۔"

وہ زہر پلے تنہم کے ساتھ بولا، گداگری کہاں چھوٹی ہے؟ میں ابھی تک بھیک مانگتا ہوں پہلے راہگیروں سے مانگا کرتا تھا، اب گداگروں سے مانگتا ہوں۔“

بڑھئی

اختیار کے ایڈیٹر سے اس کے ایک دوست نے پوچھا،
 ”کیا یہ صحیح ہے کہ تمہاری معلومات بے حد وسیع ہیں؟“
 ایڈیٹر خنرے بولا: ”ہاں“

دوست نے پھر پوچھا، ”اور کیا یہ بھی صحیح ہے کہ تمہیں دنیا کی خبروں کا علم رہتا ہے۔“

”ہاں“

”معاذ کرتا تمہیں دنیا بھر کی خبروں کا علم ہے۔ مگر اپنے بارے میں ایک چھوٹی سی خبر کا بھی علم نہیں؟“
 وہ کہہ: ”

”وہ یہ کہ تمہارے سر کے بال اڑ گئے ہیں۔“

بڑھئی

بڑھئی نے ایک کرسی بنائی اور بازار میں جا کر بیچ دی۔ وہ روپے لے کر بازار میں آئے گئے۔ اتنے وقت دوکاندار نے ڈبلی ماری جس پر بڑھئی کوٹاؤ لگایا، اس نے دوکاندار کو برا بھلا کہا، دوکاندار نے اسے گالی دی، بڑھئی نے نمک مار کر دوکاندار کا دانت توڑ دیا۔ بڑھئی کو گرفتار کر لیا گیا، کچھ جھینے اس پر مقدمہ چلایا اور آخر عدالت نے اسے سبھ ماہ کی سزا دے دی۔

جس نے بڑھئی کو سزا کا حکم سنایا وہ اسی بڑھئی کی بنائی ہو کر سبھ
 برہمچیا تھا۔

چوہدر

ایک چور رات کو کسی کے گھر میں داخل ہوا، جس کمرہ میں داخل ہوا وہاں اندھیرا تھا۔ مگر لعل کے کمرہ میں روشنی ہو رہی تھی۔ اور اندر سے میاں بیوی کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میاں کہہ رہا تھا: "پیارے آج تو ہر گھر میں روشنی ہو رہی ہے سارا شہر جاگ رہا ہے۔ اس لئے آج کہیں نقب نہیں لگا سکا۔"
بیوی بولی: "اس کا مطلب ہے، آج تم خالی ہاتھ لوٹ آئے، کوئی بھی چیز چہرہ کر نہیں لائے؟"

میاں بولا: "نہیں نہیں۔ ایک گھر میں تھوڑا سا مرقہ ملا۔ تو ایک گھر میں میرے ہاتھ لگ گئے۔" جو ساتھ والے کمرہ میں میز کی دراز میں رکھ آیا ہوں۔"
میاں بیوی کی یہ گفتگو سن کر پہلے چور نے میز کی دراز کھولی۔ اور گھڑی اٹھا کر مسکراتا ہوا یاہر نکل گیا۔

شاعر

شاعر کو خدا کے حضور میں پیش کیا گیا۔ خدائے پوچھا: "شاعر! تم چونکہ ہمارے خاص آزاد منش بندے ہو اس لئے تم خود ہی بتاؤ کہ تم جنت میں رہنا پسند کرو گے یا دوزخ میں؟"

شاعر بولا: "جہاں سامعین کی تعداد زیادہ ہو
چاہے خیر خدا لے اسے دوزخ میں بھیج دیا"

تربیت گاہ

نیت کی اس غصے کے آبا سے سے چھپ کر رہی تھی۔
"نیت گاہ میں بچے کا عادی ہو گیا ہے۔ وہ تم سے اس پرچہ لٹا، کو کھلی چھٹی دے"

دیکھی ہے۔

منجھ کے آبلے کہا۔ ”بھوک اس کرنی ہو تم۔ تم ہی اسے آلو کا بٹھا بنا رہی ہو۔“ منجھ کی ماں نے کہا۔ ”اولاد منتھاری ہے۔ لفظ کی اولاد بھی لفظ کی بنے گی۔ اور کیا بنے گی؟“ منجھ کے آبلے کہا۔ ”اور تم کو نئے شریعت تھاندراں سے آئی ہو۔ تمھارا باپ بھی تو چور اچکا ہی تھا!“

اور دونوں کا منھا ایک کونے میں بیٹھا ہوا یہی گالیاں سن رہا تھا اور وہ بھی یہ ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔

آئینوں کا فرق

اپنی بیوی کو خدا آدم آئینے کے سامنے کھڑے دیکھ کر شوہر نے بڑے متنازعہ ہنسنے میں کہا۔ ”پیاری! آج تو تم راجہ اندر کے نکھارے کی پری معلوم ہو رہی ہو۔“ بیوی نے طعنے دیتے ہوئے کہا۔ ”کل تو تم کہہ رہے تھے کہ تم چڑیل ہو۔ ڈاؤن ہو۔“ کل تم میرے سامنے کھڑی تھیں۔ مگر آج آئینے کے سامنے کھڑی ہو۔“

بے نیاز جوڑا

سرکار کی طرف سے منادی کرائی گئی: ”ملک کی آبادی خطرناک حد تک بڑھ رہی ہے۔ اس لئے سرکار ملک کے ہر میاں بیوی سے اپیل کرتی ہے کہ وہ کم سے کم بچے پیدا کیا کریں۔“

ایک جوڑے نے بازار میں چلتے چلتے یہ منادی ایک کان سے سنی اور دوسرے سے اڑادی۔ کہہ نہ ان کے ہاں گزشتہ تین سال سے ایک بھی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

بیوی کا سبھاگیا

بیوی آئندوں، چمکیوں اور سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی: ”میں کہتی ہوں

اس گھر میں اگر تو میرے بھاگ ہی پھوٹ گئے۔ آخر یہاں آکر مجھے کیا ملا؟“
 نیچے سرک پر سے ایک خراپچے والے کی آواز آئی۔ ”پاڑ کر اس!“

بھگوان کا فیصلہ

مندر میں بھگوان کرشن کی مورتی کے سامنے ایک عورت آنکھیں بند کئے پر رقص
 کر رہی تھی۔ اسے مری منوہرا! میرے خداوند کو بدھلی عطا کر تاکہ وہ دوسروں کے بد بکواسے
 میں نہ آیا کرے۔“

بھگوان کی مورتی جیسے بول اٹھی۔ ”ابھی دس منٹ پہلے ہی تیرا خداوند بھی
 پیسے ہی کہہ گیا۔“
 تعلیم کا مقصد

ایک خدا ترس اور نیک و کمال صاحب ہر روز ایک طوائف کے ہاں بیٹے اور
 رات گئے لوٹ آتے۔ میں نے ایک دن ان سے پوچھا ”آپ ہر روز طوائف کے پاس
 کیوں جاتے ہیں؟ ایک ہندو آدمی کے لئے یہ بات نہایت نامناسب ہے!“
 وہ گردن اگڑا کر بولے! ”میں اس سے تنہیب سیکھتا جا رہا ہوں۔“

بیٹے کے باپ

طوائف کے گھر سے مخصوص بچے نے ایک دن ماں سے پوچھا ”ماں یہ ہر روز
 ہمارے گھر میں اتنے آدمی کیوں آجاتے ہیں؟“
 طوائف نے ایک سرواہ بھر کر کہا۔

”بٹیا! میں خود ان آدمیوں کو یہاں بلاتی ہوں۔ تاکہ تم پہچان سکو کہ ان میں
 سے تمہارا باپ کون ہے؟“

رنگین مقولے

جو لوگ طوائف سے نفرت کرتے ہیں طوائف ان سے بھی نفرت نہیں کرتی۔

جس سماج میں محبت کرنا جرم ہو وہاں تجبرانے کھون کوئی جرم نہیں۔
 عواموں کے لائسنسوں سے جو رقم وصول کی جاتی ہے وہ اخلاق سدھارنے
 والی سبھاؤں پر خرچ کی جاتی ہے۔

ترکام

ایک مرتبہ ایک بڑے آدمی کو ترکام ہوا۔ سات دن تک رات و علی ڈاکٹر اس
 کا علاج کرتے رہے، احتیاط، پیرہیز اور علاج پر سات سو روپے خرچ ہو گئے جب
 اسے ترکام سے افادہ ہوا تو اس نے اپنی صحت یابی کی خوشی میں ایک بہت بڑی
 دعوت دی۔ شہر کے بہت سے معززین دعوت میں شریک ہو گئے۔ دعوت آ کر کھڑا
 اور بیوقوفوں کو خیرات پر ایک ہزار روپیہ اٹھ گیا۔

قسمت کا دھنی

ایک دن بڑے آدمی نے ایک جیونشی کو بلا کر پوچھا
 ”کیا تم تنہا سکتے ہو کہ کل ہمارے ساتھ کیا ہوگا؟“
 جیونشی نے تاروں کا حساب لگا کر بتایا۔
 ”ہاں جناب! کل آپ کو دس ہزار روپے اچانک مل جائی گے۔“
 اور دوسرے دن بڑے آدمی کا کنا مر گیا۔ جو دس ہزار روپے میں بیمہ شدہ تھا۔

بتلی کا تماشہ

چھوٹے آدمی سے کسی نے کہا۔

”غیر وہ!“

وہ غبر گیا، اس کے بعد چھوٹے آدمی سے کہا گیا

”جلو۔!“

وہ چلنے لگا۔ پھر کیا گی

”نوٹ آؤ۔“

وہ واپس آگیا

اُس سے پوچھا گیا: ”تم نے میرے ہر حکم کی تعمیل کیوں کی؟“

چھوٹے آدمی نے کہا۔

”اگر میں یہ جانتا ہوتا کہ میں نے آپ کے ہر حکم کی تعمیل کیوں کی؟ تو آپ کے حکم کی تعمیل ہی کیوں کرتا؟“

گالیوں کا نرخ

چھوٹا آدمی ہل پٹا کا پتلا ایک سیٹھ صاحب کے پاس آیا اور گھبراتے

ہو کرے بولا۔

”آپ نے مجھے پانچ روپے دیئے تھے تاکہ میں جا کر گئے کو ایک گالی دے دوں“

”ہاں دیئے تھے!“

”تو میں اسے کالی دے آیا ہوں۔ اور اس نے جواب میں مجھے دو گالیاں دی ہیں!“

”ہاں! میں نے اسے دس روپے دیئے تھے، تمہیں کالی دینے کے لئے۔“

اپڈیشن کا اثر

جلے میں ایک بہت بڑا دووان برہمن اپڈیشن دے رہا تھا۔

وہ آدمی بہت بڑا ہے جو صدق دل سے اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہا ہے۔

چھوٹے آدمی نے یہ اپڈیشن سنا اور قہری تھلنے میں جا کر اپنے تمام سابقہ گناہوں کی

رپورٹ دے دی۔ اور تھا نذر دار نے اسے پکڑ کر جیل میں بٹھوٹس دیا۔

کیوں؟

چھوٹے آدمی کو سرکار کی طرف سے عظیم فداکارہ کا خطاب دے دیا گیا۔
 چھوٹے آدمی کو امیروں کے کلب کا اعزازی ممبر بنا دیا گیا۔
 چھوٹے آدمی کی تعریف میں بڑے بڑے اخباروں نے معنائیں شائع کئے۔
 چھوٹے آدمی کا شہرہ سارے ملک میں ہو گیا۔
 کیوں؟ کیونکہ وہ اب چھوٹے آدمیوں سے نفرت کرنے لگا تھا۔

چور

ایک چھوٹے آدمی نے دوسرے چھوٹے آدمی کی قمیص چرائی۔ دوسرے نے
 پہلے کی بگڑی چرائی۔ پہلے نے دوسرے کا جوتا چرایا۔ دوسرے نے پہلے کی دھوئی
 چرائی۔ پہلے نے دوسرے کا تہبند چرایا۔ دوسرے نے پہلے کی
 مہفتہ بعد دونوں ایک دوسرے کا لباس پہنے پھر رہے تھے۔

دعا قبول

ملک میں زبردست قحط ہو گیا تو چھوٹے آدمی نے صدق دل سے دعا مانگی
 ”بھگوان! بارش بھیج دے تاکہ ہم موت سے بچ جائیں!“
 بھگوان نے دعا قبول کی اور موسلا دھار بارش بھیج دی۔
 اور بارش میں چھوٹے آدمی کا مکان گر گیا اور چھوٹا آدمی اس کے نیچے دب کر
 مر گیا۔

بیکھو ملا

رات کو چھوٹے آدمی کے گھر ایک چور گھس آیا۔ چھوٹے آدمی کی آنکھ کھل گئی

گئی اور اس نے چور سے کہا ۔ ”کیوں بھیا کچھ ملا ؟“
 چور نے کہا ۔ ”کچھ بھی نہیں ملا ۔ مگر ہاں ایک بہن ضرور ملا ۔“
 ”کیا ۔“
 ”یہی کہ تم مال و دولت سے محروم ہوا دوں میں عقل سے !“

ایک ماتمی خط

ایک تجارتی خرم کے مالک کو صبح ڈاک سے ایک خط ملا ۔

میسرز ڈنگامل کو نگامل جی ! میں نہایت افسوس کے ساتھ آپ کو یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے پرانے اور گہرے دوست مشر سرجیت کل رات انتقال کر گئے ۔ ان پر اچانک نوشیہ کا حملہ ہوا اور وہ یا وجود فوری طبی امداد کے عابسر ہو سکے ۔

آپ کا

شام ناتھ برا در حقیقی سرجیت

فرم کے مالک نے خط پڑھ کر میز کے نیچے پھینک دیا ۔ اور اپنے خزانچی کو آواز دیکر کہا ۔
 ”منیم جی ! ذرا دیکھنا مشر سرجیت کے نام ہمارے کتے رو پے نکلے ہیں ۔

رزق دینے والی

ایک طوائف خدا کی بہت زیادہ قائل تھی ۔ برابر اس کی عبادت کیا کرتی تھی
 ایک دن میں نے پوچھا ۔

”اوی تو طوائف ہو کر خدا کی عبادت کرتی ہے سچے کیا پڑی ہے خدا کی ؟“

وہ بولی ۔

”سائیں بابا ! میں نے جس وقت بھی خدا سے دعا مانگی ہے ، اسی وقت اس نے
 کوئی ذکر کوئی حکم پہنچ دیا ۔ اس لئے رزق دینے والے کی عبادت کرنی ہی چاہیے

مادرِ نیتویدیش

ہر بچہ نوجوان کا تھا نیدار

ہر بچہ نوجوان کی ہنگامی میٹنگ میں ہر بچہ لیڈر غصے کے مارے حبیب اُڑاتے ہوئے بول دلتا تھا "میں... میں... اس بڑے بڑے نیدار کا خون پی جاؤں گا جس نے ہمارے ہر بچہ نوجوان کی توہین کی ہے۔ تم مجھے آگیا دیدو تو میں اس کا سر کاٹ کر اس ہر بچہ نوجوان کے چہرے پر لٹکا دوں گا۔ بھائیو! ہم اور تم غریب ضرور ہیں، لیکن ہم اپنی غیرت اور خودی کو فروخت نہیں کر سکتے۔ میں اس نیدار کو عدالت کے کھڑے ہیں یا کرکٹر کروں گا۔ تم سب "مقدمہ نمٹ" کے لئے ایک ایک روپیہ نکال دو۔ میں کل ہی اس کے خلاف دعویٰ دائر کروں گا۔"

مقدمہ نمٹ میں پچاس روپے اکٹھے ہو گئے لیڈر کو سو منہ دیئے گئے ہر بچہ لیڈر میٹنگ سے اٹھ کر سیدھا "وائس شاپ" پہنچا اور ان روپوں سے وہیلی اور اس کے لوازمات خرید لئے۔

رات کو ہر بچہ لیڈر اور نیدار دونوں مل کر ایک دوسرے کی غصت کے

جام پی رہے تھے۔

مصرعہ پر گہرہ۔

کافی ہاؤس میں دو شاعر آئیں، انھیں پڑنے لگا، کافی دیر تک محبت مباحثہ کرنے کے

بعد ایک شاعر کو اشتعال آگیا اور اس نے دوسرے شاعر کے منہ پر تھپڑ لگا کر کہا: ”یہ میرا مصرع طرح ہے۔“
 دوسرے شاعر کے غرور اوجواں تھپڑ لگاتے ہوئے کہا: ”اور یہ میں نے گڑھ لگے ہے۔“

شیر اور بکری

ایک بار کا ذکر ہے کہ ایک کلرک اور اس کا افسر دونوں دوست بن گئے۔ دونوں اکثر اکٹھے دیکھے جاتے کہیں کلرک اپنے افسر کی ٹوکھی پر ڈنکھانے چلا جاتا اور کبھی افسر اپنے کلرک کے کواٹر پر پہنچ کر ڈنکھاتا۔ دونوں ایک ساتھ وہل پیا کرتے تھے۔ کافی بادشموں میں سفیادوں میں، کلبوں میں، تھیٹروں میں جی کہ کبھی کبھی شکار کے لئے بھی اکٹھے ہی جنگل میں جانا کرتے کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اس کلرک میں بھی شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی کیسے پی رہے ہیں۔
 بڑی دیر کے بعد کھلا کہ کلرک کی بیوی انتہائی حسین تھی۔

سمبر شاپاری رپورٹ

صوبائی اسمبلی میں ایک وزیر نے اعداد و شمار کی ایک رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا: ”گزشتہ سال صوبے میں اینٹی کرپشن مہم بڑے زور شور سے چلائی گئی۔ اس مہم کے نتیجے میں آٹھ چپراسی برخواست کئے گئے، پندرہ کلرک معطل کئے گئے۔ تین جو تیرافروں پر جرمانے کئے گئے اور دو بڑے افسروں کو عارضی تنگ دی گئی۔“

اسمبلی کے ممبر نے باغ و بانہ کہا: ”اور آپ کو کیوں گرفتار نہیں کیا گیا۔ جبکہ آپ بہت بڑے بھر شاپاری ہیں۔“

وزیر نے فوراً کہا: ”کیونکہ مجھے اسمبلی میں رپورٹ پیش کرنی تھی۔“

ایک عاشقانہ تحفہ

ایک صاحب ایک محرم پر عاشق ہو گئے، عشق اپنے ہرے شباب پر پہنچ گیا

جب تک کہ وہ زمانہ ایک دو سو سے مل رہا تھا، میں نے پتھر اور عجب پر اپنے عاشق کو سرور
کسی ہر کسی جگہ پر پہنچنے کا وقت دے دیا۔ کبھی انڈر ٹیٹ، کبھی پائے لگا چوک، کبھی
بدھا گارڈن، کبھی یو سٹ سہرائے اور کبھی کسی ستیا ہال میں اور عاشق اپنے دل کے
ہاں غصہ مجبور ہو کر کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ جاتا۔ ہر روز مختلف بیس بدل بدل کر بیوں
کے انتظار میں تھک ہار کر بیوں کے اندر دھک پیل کرتا ہوا بالآخر مقام مجرب تک
پہنچ جاتا۔

ایک مرتبہ جب وہ اسی طرح تھکا ہارا مجبور کہہ پا جس پہنچا تو مجبور بڑا۔۔۔
رومانٹک موڈ میں تھی۔ جذبہ عشق سے چور چور ہو کر بولی "پیارے میرا تیرا چاہتا ہے
آج تمہیں کوئی تحفہ لے دوں۔ تباؤ کیا لے دوں؟"
عاشق بولا ایک پائیکل لے دو۔

جیوتیشی

ایک آدمی نے جیوتیشی کو اپنا ہاتھ دکھا دیا۔ جیوتیشی نے بڑے غور و خوض سے اس
کے ہاتھ کی لکیروں کا موازنہ کیا اور پھر بولا "تمہارے ہاتھ میں عجیب تضاد دکھائی دیتا
ہے۔ ایک طرف تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ تم قاری موت عنقریب واقع ہوئے والی ہے
لیکن دوسری لکیر کہتا ہے کہ تم موت سے بچ سکتی ہو۔
شخص مذکور برابر بٹھا ہوا اور بولا "ذرا غور سے دیکھو۔ قسمت میرے ساتھ بدل
روں گیوں کر رہے کیا کوئی ایسا پائے نہیں ہے کہ میری موت ٹل جائے؟"
جیوتیشی نے کہا "ایک ہی پائے ہے کہ آپ کسی شخص کو قتل کر دیں تو مزید کئی
سال تک زندہ رہ سکتے ہیں۔"

شخص مذکور نے عجیب سے جہا تو نکالا اور جیوتیشی کو قتل کر دیا۔

مورنی کا بھر شٹا چار۔

ایک بہت بڑا سرکاری افسر رشوت لینے کا بری طرح عادی تھا۔ لیکن اس کے

ساتھ ہی وہ خود غذا کا بیڑا تامل تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی کوٹھی کے ایک حصے میں اپنے لئے ایک چھوٹا سا مندر بھی بنوا رکھا تھا۔ جہاں وہ اداس کا پرہیزار روزانہ پوجا کیا کرتے تھے۔ ایک چھوٹی سی پتیل کی مورتی ان کی پوجا کا مرکز تھا۔

ایک مرتبہ کسی شخص کا کہیں اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ شخص بھی بھگوان کا بڑا بھگت تھا۔ اس نے اپنے کہیں کے سسلے میں افسر مذکور سے کہا: ”آپ جو کچھ فرمائیں گے میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔“ میرا کہیں ٹھیک کر دیجئے۔“

”افسر نے پوچھا: کیا دو گئے؟“

”جو مانگو گئے۔“

”اچھا، تو میرے گھر کے مندر کے لئے چھ فٹ لمبی اور ایک منہ بھاری بھگو ان

کی مورتی بنوا کر دیدیجئے۔“

چند دن بعد ہی مورتی۔ اس کے مندر میں سٹھا پت ہو چکی تھی۔

لاکھ طوطے کو پڑھایا۔

ایک بہت بڑے فیکٹری اور نے اپنی تفریح طبع کے لئے ایک طوطا خریدا اور اپنی کوٹھی کے مین گیٹ کے پاس اس کا پنجر لٹکا دیا۔ اس نے طوطے کی خوب پرورش کی کھائے کو پیتے اور پینے کو شراب دیا کرتا تھا۔ طوطا بے حد پیارا تھا۔ فیکٹری اور نے اس طوطے کو ایک فقرہ بھی سکھا دیا کہ جب بھی میں کوٹھی سے باہر نکل کر دفتر کی طرف جاتے لگوں تو تم یہ فقرہ کہا کرنا۔ ”اب کب لوٹو گئے؟“

چنانچہ طوطا یہ فقرہ سیکھ گیا اور ہر روز جب سیٹھ جی باہر جانے لگتے طوطا بے ساختہ کہہ اٹھا: ”اب کب لوٹو گئے؟“ قصداً سیٹھ جی انتقال کر گئے۔ جب ان کی ارنی کوٹھی سے باہر نکلنے لگی تو طوطے نے بے ساختہ کہا: ”اب کب لوٹو گئے؟“

حاتم طائی دہلی میں

چند دن جوئے، حاتم طائی دہلی میں آیا کیونکہ اس کے پاس دہلی کے پوسٹ آفس سے سیکڑوں خط پوسٹ کئے گئے تھے کہ کہیں دہلی میں بھی قدم رنجہ فرمائیے یہاں کے باشندے آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔

چنانچہ حاتم طائی گواکب دن رجم آگیا اور وہ دہلی میں آگیا۔ اسے راستے میں جو بھی حاجت مند ملا، اس نے اس کی حاجت پوری کر دی۔ بھکاری کھڑک مزدور، بچہ دکاندار وکیل، حتیٰ کے ایک رشتہ خوار فسر کو بھی اس نے دس ہزار روپے دے دیئے۔ کیونکہ اسے اپنی بیٹی کی شادی پر شاندار جہیز دینا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ خبر سارے دہلی شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ حاتم طائی شہر میں آیا ہوا ہے اور وہ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹا رہا ہے۔ چنانچہ سارے باشندے اپنا کام کا چھوڑ کر حاتم طائی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ وہ حاتم طائی کو شام تک ڈھونڈتے رہے۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ آخر اخبار کے ایک ایڈیٹر نے اس کا پتہ چلا یا اور اسے معلوم ہوا کہ خٹنا روپیہ وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ سبھی ہانٹ چکا اور اس کے پاس روٹی کھانے کے لئے بھی پیسے نہیں بچے۔ چنانچہ اس نے انٹر کے نام پر ایک ایک راہگیر سے بھیک مانگی تو پولیس اسے اندھا دگدا گری کے قانون کے تحت گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔ اور وہ اس وقت تھانے میں قید ہے۔

کالی داس کہاں رہتا ہے

ایک دن کا ذکر ہے ایک ریڈیو سٹیشن نے فیصلہ کیا کہ مہاکوی کالی داس کا ڈرامہ شکنتلا ریڈیو سٹیشن سے براڈ کاسٹ کیا جائے۔ جب ڈرامہ براڈ کاسٹ کے لئے بالکل تیار ہو گیا تو وہ افسر جو ڈرامہ پروگراموں کا اسٹارچ تھا دوڑا دوڑا اسٹیشن ڈائریکٹر کے پاس آیا اور گھبرا کر بولا کہ سراسر اس ڈرامے کے کنٹرول کیٹ پر مصنف کے دستخط

سمروا لے رہے ہیں۔ لیکن کال داس جی کا ایڈریس ہی نہیں مل رہا ہے کیا کیا جائے؟ اسٹیشن ڈائریکٹر بھی قدرے گھبرا گیا اور بولا: ”ہاں رولز کے مطابق مصنف کی اجازت کے بغیر ڈرامہ براڈکاسٹ نہیں کیا جاسکتا لیکن نبھائی میسرے اکیلی داس تو انتقال فرما چکے ہیں۔“

اسٹریڈ کو رولا۔ پھر تواد بھی مشکل ہے۔ ”رولز کے مطابق یا تو وہ انتقال نہ کرتے اور یا اب ان کا ڈرامہ براڈکاسٹ نہیں ہو سکتا۔“

اسٹیشن ڈائریکٹر نے ایک منیجر کے لئے توقف کیا اور پھر ایک دم اسے آئیڈیا سوچو گیا۔ کنٹرولنگ فارم کے اس کے نیچے دستخط کر دیئے۔ ”کالیڈاس“

”اب تو ڈرامہ براڈکاسٹ ہو سکتا ہے؟“ اسٹیشن ڈائریکٹر نے کہا۔

”ہاں لیکن اس کی رائلٹی میں کچھ کمی ہوگی۔“

”اس کا حل میں سوچ لیں گے۔ پہلے ڈرامہ براڈکاسٹ بس کر لو۔“

مجھے بھی میچ دیجئے۔

ساراجی تواد کی ایک مشہور دکان میں ایک صاحب داخل ہوئے جو تھوڑے سے لنگڑا کر چلتے تھے۔ وہ دکان میں گھوم پھر کر مختلف تواد دیکھتے رہے اور ان کی قیمت پر جھپٹے رہے۔ آخر ان کی نظر ایک آئینے پر جا پڑی۔ انھوں نے دکاندار سے پوچھا: ”اس آئینے کی کیا قیمت ہے؟“

دکاندار نے لاکھ روپے۔

”دکاندار لاکھ؟ گاہک نے حیرت سے پوچھا۔“ ایک آئینے کی قیمت دکاندار لاکھ۔“

”جی خباب۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں ملکہ نور جہاں اپنا چہرہ دیکھا کرتی تھیں۔ دوسری میز پر ایک گلاس رکھا تھا۔ گاہک نے اس کی قیمت پوچھی تو دکاندار

نے کہا۔ "یہ گلاس پانچ روپے کا ہے۔ کمزور اس میں شیشہ جہانگیر شراب نوش فرمایا کرتے تھے۔"

اس پر گاہک نے بہت سنجیدگی سے کہا۔ "آپ مجھے بھی اس دکان پر رکھ لیجئے اور مجھے بطور تمیز رنگ کے بیچ دیجئے گا۔"

ہنومان کی واپسی

ایک روز کا ذکر ہے کہ یوں پُتر ہنومان مختلف ممالک کی سیر کرتے کرتے ہندوستان آ پہنچا۔ اس نے سب سے پہلے بالی اور سنگریہ کا ادب پتہ دریافت کیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ دونوں یونائٹڈ فرنٹ پارٹی میں ایک ساتھ کام کر رہے ہیں اور اپنی مندریں بنانے کی فکر میں ہیں۔ اس کے بعد وہ آلو پرست پر گیا۔ تاکہ سنجیونی بونی کے کچھ تپے حاصل کرے۔ لیکن اسے وہاں جانے سے روک دیا گیا کہ وہاں تو جڑی بوٹیوں کی ریسرچ کے لئے ادارہ کھولا گیا ہے۔ اور وہاں سے بوٹیاں توڑنا قانوناً منع ہے۔ مایوس ہو کر وہ اجودھیا پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ وہاں باڑے آٹھک ہے ڈوب جانے کا خطرہ ہے۔ وہاں کی فیکٹریاں تک پانی میں ڈوب گئی ہیں۔ ٹھکانے بارگروہ دہلی آ گیا۔ جہاں اس نے رام اور ستیا کی کھوج شروع کی کسی نے کہا رام اور ستیا فلاں مندر میں رہتے ہیں۔ کسی نے کہا انہیں فلاں مندر میں رہتے ہیں۔ اس نے ہر مندر کے ہر رام اور ستیا کے سامنے اپنا سینہ چیر کر دکھایا۔ جس کے اندر رام "لکھا ہوا تھا۔ مگر کسی رام اور ستیا نے بھی اسے نہیں پہچانا کہ یہ واقعی ہنومان ہے۔"

آخر ہنومان مایوس ہو کر دہلی سے اٹھا اور تنکا کے ہوائی اڈے پر جا اترتا اور وہاں بغیر سپورٹس کے لٹکامیں داخل ہونے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔

محاورے جو غلط ہو گئے۔

• بل کے مہاگوں چھٹیکا لڑنا۔

• لیکن آج کل کوئی چیز چھٹیکوں میں رکھی ہی نہیں جاتی، بلکہ پچر میں رکھی جاتی ہے جس سے بل کے مہاگوں مستقل طور پر پھوٹ چکے ہیں۔

• لٹکا میں جو پیدا ہوا باون گز کا!

حالانکہ خود لٹکا کے ذریعہ اعظم کا قد صرف دو گز کا ہے۔

• ناچ نہ جائے آنکھ ٹیڑھا۔

آج کل کوئی ڈانس ریاہنا نہیں کر سکتی کیونکہ ناچ گھر ٹیڑھے بنائے ہیں نہیں جاتے۔ آرٹسٹ کی سائنس بے حد ترقی کر چکی ہے۔

وہ دونوں برہمن تھے۔

ایک قبیلے میں دو برہمن رہتے تھے۔ ایک برہمن ان پڑھ تھا لیکن امیر تھا۔ امیر تھا اور عیار تھا۔ جیسا کہ اکثر امیروں کی خصلت ہوتی ہے۔ اس کے گرد ہر وقت اور ہر موقع پر عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا تھا جو اس کی معمولی روپوں پیسوں سے بھر دیتے تھے۔

دوسرا برہمن غریب تھا لیکن گریجوئیٹ تھا۔ اسے دھرم کے نام پر لوٹ کھسوٹ کرنا برا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے امیر برہمن کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اور لوگوں کو یہ سمجھانے لگا کہ دھرم — بے ایمانی اور لوٹ کی اجازت نہیں دیتا جن طرح یا امیر برہمن کر رہا ہے۔

امیر برہمن کو اس کے اس پراپیگنڈے سے بہت اندیشہ محسوس ہوا اور ایک

دن اس نے غریب برہمن کو بلا کر کہا۔ ”دیکھو، تم بھی برہمن ہو اور میں بھی میرا اور تمھارا خون کا رشتہ ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں۔“ تمھاری کچھ مدد کروں۔“
 یہ کہہ کر اس نے غریب برہمن کو پانچ سو روپے ماہانہ سہانے ہاں اکاؤنٹ
 کی آسامی پر ملازم رکھ لیا اور دونوں برہمن ہنسی خوشی رہنے لگے۔

دعمرم کا رکھشاک

شہر کے بہت بڑے مندر میں شہر کے بہت بڑے بڑے معزز زمین جمع تھے
 یہاں وہ مندر گلیش کے پردھان کا چٹاؤ کرے آئے تھے۔ کئی تقریروں کے بعد سٹیٹ
 ڈھینگہ چند جی کا اتفاق رائے سے پردھان جن لیا گیا۔ تالیوں کی گونج میں سٹیٹ ڈھینگہ
 چند جی کو بھول مالاؤں سے لا دیا گیا۔ سٹیٹ جی نے جراتی تقریر میں سب کا شکریہ
 ادا کیا اور سر نیاز چھکا کر بھگوان کی موتی کے سامنے وعدہ کیا کہ وہ دعمرم کی رکشا
 کے لئے اپنی جان تک نثار کر دیں گے۔

جب پردھان جی مندر سے باہر تشریف لائے تو ایک پولیس پارٹی نے
 انھیں ایف بی کی اسمگلنگ کے جرم میں گرفتار کر لیا۔

حضرت عیسیٰ مسیح

سڑک کے بائیں فٹ پاتھ پر دو آدمی آپس میں لڑتے رہے۔ دونوں کے ہاتھوں
 میں تیز جانے والی چمک رہے تھے۔ جس سے وہ ایک دوسرے کو زخمی کرنا چاہتے تھے۔
 ایک صاحب انھیں لڑتے دیکھ کر تیزی سے ان کی طرف لپکے اور ان دونوں کے
 ہاتھ میں کاغذ کا ایک ایک پر زور کر چلے گئے۔ دونوں نے پرزے کی طرف دیکھا۔ اس
 پر لکھا تھا:

”ٹاکٹر بھیم سنگھ سرحدی“

”ہمارے کلینک میں رخصتوں کی مرسم ٹی کا بہترین انتظام ہے۔“

سیدھے سادے جواب

”آپ دوسرے ستیراگرہیوں کے ساتھ جلی کیوں نہیں گئے؟“

”مجھے گھر میں تھوڑا سا کام تھا۔“

”آپ دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے گئے تھے، لوٹ کیوں آئے؟“

”پانی ٹھنڈا تھا۔“

”آپ نے اپنی محبوبہ کے نام جو ”لوہیڑ“ لکھا تھا اسے پہچاننے کے لئے خود اس کے

گھر کیوں گئے تھے؟“

”ڈاک کا شک خریدنے کے لئے پتے نہیں تھے۔“

”میں نے آپ کو اپنے جنم دن پر ڈاکر کا دعوت نامہ بھیجا تھا، آپ تشریف کیوں

نہیں لائے؟“

دعوت نامے پر تاریخ درج نہیں تھی۔“

آپ نے اس بدمعاش عورت سے کیوں عشق کرنا شروع کر دیا، جب کہ آپ کی

اپنی بیوی انتہائی خوبصورت تھی؟“

”کیونکہ میری بیوی نے ایک موٹے مجذوبے شخص سے عشق شروع کر دیا تھا۔“

تین ادھوری خبریں

(۱) اٹلی میں ابھی ابھی ایک ایسی عورت کا انتقال ہوا ہے جس کی عمر ایک سو

تین سال تھی، خبریں لکھا گیا ہے کہ اس کی درازی عمر کا راز یہ تھا کہ اس نے ساری

زندگی کسی مرد کے ساتھ جنسی تعلقات قائم نہیں کئے تھے۔

۲۔ ڈاکٹروں نے ایک کا دل دوسرے کے سینے میں فٹ کرنے کے لئے چھڑا دیوں پر تجربے کئے۔ ان میں سے پانچ تجربے ناکام رہے اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ لیکن چھٹا آدمی جس کے سینے میں ایک عورت کا دل فٹ کیا گیا وہ اب تک زندہ ہے۔ مرد مر گیا۔ عورت زندہ ہے۔

۳۔ ایک امیر ترمین آدمی نے پچاس سال کی عمر میں ایک وصیت لکھ کر رک دی کہ جب وہ انتقال کر جائے تو اس کی ساری جائیداد ایک دوصو آئٹم کو دے دی جائے، لیکن جب وہ اٹھانوے سال کی عمر میں فوت ہوا تو اس وقت اس عدالتک ویرا لیبہ ہر چکا تھا کہ اس کے کفن کے لئے نہیں بچتے تھے چندہ جمع کرنا پڑا۔

دو بھوکے

ایک بلی نے کہا: "میاؤں!

چھوٹے جواب دیا: "لیکن میں بے حد بھوکا ہوں۔ پہلے مجھے کچھ کھانے کوں کر

دو۔"

بلی نے ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے لاکر اسے دیئے۔ جسے چربا کھا گیا۔ اس کے بعد بلی چرے کو کھا گئی۔

ڈرکس سے ہے؟

میں اس سیاست داں سے کبھی نہیں ڈرتا جو اپنے دشمن سے دشمن کا سلوک کرتا رہے۔ بلکہ میں تو صرف اس سیاست داں سے ڈرتا ہوں جو دشمن کے ساتھ دوست کا سلوک کرتا ہے اور اسے دشمنی کرنے کے قابل نہیں رہنے دیتا

لازم و ملزوم

میں نے ایک سیاست داں سے پوچھا۔
 ”تم نے ڈھٹائی کہاں سیکھی؟“
 ”وہ بولا سیاست سے۔“
 ”اور سیاست کہاں سیکھی؟“
 ”ڈھٹائی سے!“

دوست

گلی میں ایک بچہ کھڑا درہا تھا۔ ایک پاگل نے اسے اٹھایا۔ اور اس کے سامنے
 زور زور سے ہنسنے لگا۔
 بچہ بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔
 بچے کی ماں بھاگ بھاگ آئی اور بچے کو چھین کر لے گئی۔
 بچہ پھر روئے لگا۔
 پاگل بھی روئے لگا۔

بیرمل نامہ

ایک بار اکبر بادشاہ نے بیرمل سے کہا۔
 ”بیرمل! کل رات یہیں خراب میں ایک پاگل دکھائی دیا۔ جو کہنے لگا میں بیرمل
 ہوں۔“
 بیرمل بادشاہ کی اس چھپی چوٹ کو بھانپ گیا مگر ضبط کر کے بولا۔
 ”مفہوم ہے کیا کیا؟“

بادشاہ ہوا۔

”میں نے اس کو اپنا وزیر بنالیا۔“

بیرہل نے فرامہا کیجھت بڑا عقلمند تھا۔ حضور کو بھی بے وقوف بنا گیا

کوایا خدا؟

ایک پاگل نے ایک راہ چلتے آدمی کو زیر رستی پکڑ لیا، اور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ دیکھو، وہ آسمان پر جڑا رہا ہے۔ یہ خدا ہے یا کڑا ہے؟“

اس آدمی نے کہا۔

”کڑا ہے؟“

پاگل نے اسے چھوڑ دیا اور کہا۔

”جاؤ بھاگ جاؤ۔ تم میں میری طرح پاگل معلوم ہوتے ہو۔“

پاگل بننے کے آزمودہ طریقے

۱۔ ہمیشہ ایسی لڑکی سے عشق شروع کرو۔ جو انتہائی کھلی صورت، اور

انتہائی جاہل ہو۔

۲۔ صبح اٹھتے ہی سچ بولنا شروع کر دیجئے۔ انشاء اللہ شام تک ضرور پاگل

ہو جائیں گے۔

حق بحث دار رسید

فٹ پانچہر ایک بیکاری کی موت واقع ہو گئی۔ اس کی گڑبڑی میں سے ڈیڑھ

ہزار روپیہ نقد نکل آیا۔ لوگوں نے وہ روپیہ معزز شہر کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اسے
مقداد عامہ کے لئے خرچ کر دے۔

دوسرے دن معزز شہر نے وہ تمام روپیہ شہر کے بھیکاریوں میں بانٹ دیا۔ اور
روپیہ پھر گودڑیوں میں پہنچ گیا۔

اشتہار بازار

علاقے کے دو گروہوں میں لڑائی ہو گئی۔ شہر کے ایک معزز نے بیچ بچاؤ سمراٹا
چاہا۔ تو اسے بھی دو چار لالٹیاں لگیں۔ اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے اٹھا کر
ہسپتال لے جانے لگے تو اس نے اچانک آنکھ کھولی اور کہا۔
”ٹھہر جاؤ مجھے فی الحال ہسپتال مدت لے جاؤ۔“

”کیوں؟“

”پہلے اخبار کے فولو گرافر کو جاؤ تاکہ وہ میرا فوٹو لے کر کل کے اخبار میں
چھاپ دے۔“

دلی جو ایک شہر ہے

دہلی کا آداگون

کہتے ہیں دہلی کو بار بار جڑی اور کئی بار آباد ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دہلی کو اجڑنے اور آباد ہونے کا پرانا چکا ہے۔ وہ اجڑنے کے لئے آباد ہوئی ہے اور آباد ہونے کے لئے اجڑتی ہے۔ یعنی آداگون کی تھیوری میں یقین رکھتی ہے۔ بار بار جنم لیتی ہے۔ بار بار مرنے سے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ بار بار اسی گھر میں جنم لیتی ہے جہاں سے اسکی ادنیٰ بھٹی گئی تھی روح وہی نام، وہی مقام — صرف چر لا بدل لیتی ہے۔ بلکہ کئی بار تو چر لا بھی وہی ہوتا ہے۔ صرف اسے ڈرائی کھین کر لیتی ہے، اس کا رنگ بدل دیتی ہے، اس پر نئے پھول اور میل بوٹے کاڑھ لیتی ہے۔ شاید اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے یا نئے نادر شاہ کو ترغیب دینے کے لئے کہ دیکھو میں کتنی پُرش ہوں۔ آؤ اور میرے حسن کو لوٹ لو۔ میری مانگ اجاڑ دو کیونکہ میں اجڑنے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہوں۔ میری بہار میری خزاں ہی کا عکس ہے۔ مجھے اجاڑ دو، لوٹ لو، مار دو

کیونکہ میری موت ہی تھی۔۔۔ زندگی کا پھول کھلتا ہے۔

دہلی۔۔۔ ایک اٹھارہ سالہ دوشیزہ

آج کی دہلی ایک ایسی دوشیزہ کی طرح ہے جس پر جوانی ٹوٹ ٹوٹ کر آتی ہے اس سے آنکھ ملانے کے لئے سورج دلوں کی سہمی آنکھ چاہئے اور ہر شے دشوار مہکا سا نفرت میں وزن، ایمان پر شائبہ ہونے میں ایک سکڑ نہیں لگتا۔ ایک بار جو دہلی آگیا وہ اس کی زلفت کے جال سے نکل نہ سکا اور جوا بھی تک دہلی نہیں آیا۔ وہ درمیانی اس کے فراق میں آہیں بھر رہا ہے اور کون جانتا ہے کہ وہ ایک آہ ایسی لمبی بھرے کہ خود بخود کھینچ کر دہلی تک آجائے۔ اور دہلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر پوچھے: ”کیوں صاحب! کیا دہلی یہی ہے؟“

اور اسے جواب ملے: ”معاف کیجئے مجھے فرصت نہیں“ اور کس سے پوچھ لیجئے۔“

کسان سے سمگلر تک۔

اگر آپ بھی دہلی نہیں آئے ہیں تو کسی نہ کسی بہانے جلدیجا آجائیں گے کیونکہ دہلی آنے کے کوئی بہانے ہیں۔ آپ کسی مظاہرے میں شامل ہو کر آجائیں گے تاکہ پارلیمنٹ کے سامنے آکر مظاہرہ کریں جس کے ارد گرد عام طور پر دفتہ مہم لگی رہتی ہے۔ وزیر اعظم کی کونہوں کے باہر بھوک ہڑتال کرنے کے لئے آجائیں گے۔ گاؤں میں بھوکوں مر مر کر دہلی میں تو کرسی کرنے کے لئے آجائیں گے کیونکہ یہاں کے گناہگار بھکاریوں کے کشکولی میں پانچ دس پیسے کے سکے ڈال کر احساس گناہ کم کرنے کے بہت شوقین ہیں اور اگر آپ بکے پاس دوست زیادہ ہے تو آپ دہلی کے اسٹرا ہوٹل میں چائے پینے کے لئے آجائیں گے۔ جہاں پانچ روپے فی کپ چائے ملتی ہے۔ اور جہاں کے بیر منسل شہزادے لگتے ہیں۔

معلوم ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی بہانہ نہ ملے گا تو آپ کوئی نہ کوئی چیز سمگل کر کے دہلی لے آئیں گے گھڑیاں، سونے، اندج، کپڑے، لوہیاں، عورتیں، کیونکہ دہلی اسٹیکروں کی بہت چھیتی منڈی ہے۔ جہاں گھڑی سے لے کر لوہی تک ہر چیز بغیر رسید پرچہ کے منہ مانگے داموں بک جاتی ہے۔

غرض آپ کسی بھی بہانہ سے آئیں گے، جلد بایدر دہلی ضرور آئیں گے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ جائیں گے۔ شادی کر رہے گے۔ بچے پیدا کر رہے گے، بچے پھر لکھ چکے ہو جائیں گے یا صرف بچے دونوں حالتوں میں دہلی آپ کو برداشت کرے گی۔

اجنبی باشندوں کی بستی

دہلی میں داخل ہونے کے کئی راستے ہیں۔ اور ہر راستے سے ہر ہزاروں لوگ دہلی پر حملہ کرنے کے لئے داخل ہوتے ہیں اور پھر دہلی کے کوچہ و بازار میں یوں پھیل جاتے ہیں کہ دہلی ہی کے باشندے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ایک اجنبی حملہ آور اور دہلی کے مستقل باشندے میں تیز کرنا انتہائی مشکل ہے۔ آپ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ایک بہادری چھوڑ کر جو دہلی کے ایک ہوٹل میں برتن مانجھ رہا ہے، آٹھ سال سے دہلی میں مقیم ہے۔ یا آج صبح ہی بدایوں کے اوڑھے پرانے یا کافی ہاؤس میں جو سیاہ رنگ کا مداسی جینلیں۔ سیاہ رنگ کا سوٹ پہنے سیاہ رنگ کی کافی پی رہا تھا۔ سفر ٹل سکر ٹریٹ میں گذشتہ دس سال سے کلر کی کر رہا ہے۔ یا آج ہی مدراس میں سے سوار ہو کر دہلی میں کلر کی کر کے آیا ہے۔ اور یا اجیر گیٹ سے جس تانگہ بان کے تنگے پر آپ سوار ہو رہے ہیں وہ ۱۹۰۶ء میں یہاں تانگہ بانی کرنے آگیا تھا۔ یا سہارن پور میں اس کا چینی کا ٹرپ تھا جو کسی وجہ سے چل نہ سکا اور یہ دہلی میں یا تانگہ چلانے کے لئے ایک ہی ہفتہ پہلے آیا ہے۔

دہلی کے باشندوں اور باہر سے آنے والوں میں امتیاز کرنا کیوں مشکل ہے؟ اس لئے کہ موجودہ دہلی کا نہ کوئی اپنا کلچر ہے نہ لباس ہے نہ زبان جس سے یہ تہہ چل سکے کہ یہ دہلی والا ہے اور یہ کلکتے والا اور یہ لکھنؤ والا۔ دہلی کی کسی سڑک پر اگر دو آدمی چل رہے ہوں تو آپ یہ جان کر حیران ہو جائیں گے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے۔ ایک نے کوٹ پتلون پہن رکھا ہے تو دوسرا دھوئی کرتے میں ملبوس ہے۔ ایک نے کوٹ پتلون کے اوپر گانڈھی ٹوپی پہنی ہوئی ہے تو دوسرے کے کھدر کی ایکٹن۔ اور پانچ بجائے کے اوپر سیٹ لگا رکھی ہے۔ ایک ابھی ابھی ہوٹل سے پھیل چاؤل کھا کر نکلا ہے تو دوسرے نے پرائیڈ اور چھاپا چھوڑ کر فرمائی ہے اور ستم یہ کہ دونوں ہی اپنے آپ کو دہلی کا باشندہ کہتے ہیں۔

حدود اور رقبہ کہاں ہے؟

دہلی کا حدود اور رقبہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ریاضی اور جغرافیہ کا کوئی فارمولا دہلی پر لاگو نہیں ہوتا۔ دہلی ریاضی اور جغرافیہ کو پس پشت ڈال کر آگے نکل گئی ہے۔ کہتے ہیں کچھ قدرتی حدود ہوتی ہیں، جیسے دریا، پہاڑ، نہر جن سے کسی مقام کا حدود اور رقبہ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ دہلی میں دریا نہیں ہے، پہاڑ بھی اور نہر بھی لیکن دہلی نے قدرت کی لگائی ہوئی ان حدیثوں کی پروا نہیں کی۔ اور تیز رفتار سیاحت کی طرح ان کے اوپر سے دندناتا ہوئی گزر گئی۔ آج کل یہ دریا، پہاڑ اور نہر دہلی شہر کے اندر آگئی ہیں، یہ دہلی کو قید نہیں کر سکیں بلکہ دہلی نے انہیں قید کر لیا ہے مثلاً بھاری جتنا دہلی شہر کے اندر رہا ہے جیسے پولیس کے گھرے میں کوئی سہا ہوا مجرم۔ دہلی کے کسی پہاڑ پر کبھی اپنے سر اٹھائے کھڑے رہتے تھے، اب دہلی کے باشندے ان پر سے موٹریں لاریاں اور سائیکلیں گنڈا کر لیوں لے جاتے ہیں۔ جیسے یہ

پہاڑن ہوں بلکہ ان کے زرخیز غلام ہوں۔ سارے پہاڑوں کے چھوٹے چھوٹے ٹھتے میں گئے ہیں اور دہلی والوں نے ان کا نام پہاڑ گنچ، پہاڑی دھیرج، مہو جہ پہاڑی، آئندہ پرست رکھ چھوڑا ہے اور یہ پہاڑ قدرتی پہاڑوں کی بجائے پہاڑی چھوکرے معلوم ہوتے ہیں جو برتن مانجنے کے لئے دہلی میں آگئے ہیں۔

دراصل جب سے دہلی آزاد سندھوستان کا دارالخلافہ بنی ہے۔ آزاد اور بے پاک ہو گئی ہے اور کسی المٹروڈیشیزہ کی طرح چاروں کھونٹ انعام کیلیاں کرتی پھیر رہی ہے۔ اس لئے اس کی حدود بدل جاتی ہیں۔ اگر ایک ہفتہ پہلے اس کی مغربی حد پشلی نگر نامی کالونی میں تھی۔ تو ہفتہ کے ختم ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے پنر چلتا ہے کہ اب پشلی نگر سے آگے ایک اور کالونی نمودار ہو گئی ہے۔ جو اب دہلی کی مغربی حد کہلاتی ہے۔ مشرقی حد میں پہلے جتا ندی تھی۔ اس کے بعد شاہدرہ بن گئی۔ اور اب شاہدرہ والے سرواہ بھر کر کہتے ہیں کہ اب ہم مشرقی حد نہیں رہے کیونکہ ستاروں سے آگے ایک اور کالونی کا جہاں بس گیا ہے۔ غرض دہلی کی حدیں ٹوٹتی بنتی اور بنتی ٹوٹتی رہتی ہیں۔ یہ پہنا غلط نہ ہوگا کہ دہلی میں شیطان آگے ہے جو اپنی آفتوں کو چاروں طرف پھیلاتا چلا جا رہا ہے اور کچھ عجیب نہیں کہ ایک دن ہم یہ خبر سنیں کہ دہلی کی ایک حد کھلکتی ہے اور دوسری حد سری نگر ممکن ہے۔ نقشہ سے سندھوستان نام کا ملک غائب ہو جائے۔ اور دہلی نام کا ملک نمودار ہو جائے۔ کیونکہ سندھوستان سمٹ رہا ہے اور دہلی بڑھ رہی ہے۔ دہلی ایک جسم ہے جس میں سندھوستان کی روح داخل ہوئی جا رہی ہے۔ جسم اور روح کا یہ اتصال شریچڈی ہے یا کامیڈی۔ اس کا فیصلہ ہم آنے والے مورخ پر چھوڑتے ہیں۔

ایک نہیں پانچ دہلیاں

بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ دہلی صرف ایک ہے۔ انہیں یہ غلط فہمی

دور کر لینا چاہئے۔ کیونکہ دہلیاں پاچھ ہیں، پرانی دہلی رنجی دہلی، سترنا دہلی دہلی، چھپاؤنی دہلی۔ دہلیاتی دہلی اور ان میں سے ہر دہلی دوسری دہلی سے الگ مزاج رکھتی ہے۔ ہر دہلی دوسری دہلی کی سرکس معلوم ہوتی ہے۔ پرانی دہلی اپنے آپ کو خاندان کی دس بڑی بی کی طرح سمجھتی ہے جس کی کمر میں چابیوں کا گچھا لٹکتا رہتا ہے اور جوابے سامنے خاندان کے سارے افراد کو بچ سمجھتی ہے اور منہ میں پانی کی ٹھنڈی دلیکے "پدم سلطان بود" کے نعرے لگاتی رہتی ہے۔ اور رنجی دہلی خاندان کی وہ ماڈرن لڑکی ہے جو چابیوں کے گچھے کی بجائے کلانی میں پرس چمکاتی ہوئی اپنے آپ کو یورپ وژن کہتی ہے منہ میں "چونگ گم" اپنے آپ کو انڈیا کی "ہنر ہانس" سمجھتی ہے اور پرانی دہلی سے الگ کرتی ہوئی کسی مکھی کو ناک پر نہیں بیٹھنے دیتی۔ اور "سترنا دہلی" اپنے آپ کو وہ حسینہ سمجھتی ہے جو اپنی عشرہ طرازیوں کے ساتھ یہاں آئی اور دل عاشق پر حملہ کر کے قاجار بن گئی کبھی منہ میں پانی دیا لیتی ہے، کبھی چونگ گم اور کبھی گڈیریاں اپنے آپ کو دہلی کی ناک سمجھتی ہے۔ مگر سرکار اس پر ہمیشہ مسکندیاں سمجھاتی رہتی ہے جو دہلی کی پوزیشن اس جلا وطن کی سی ہے جو اب بھی اپنے آپ کو تخت و تاج کا وارث سمجھتی ہے۔ اور اپنی رعایا سے دور رہی رہنے میں اپنی بڑائی سمجھتی ہے اور دیوانہ دہلی اس لیے بس وہ شیزہ کی طرح ہے جس کا بیاہ زبردستی ایک ریجسٹریسٹ کے کر دیا گیا ہو۔ جس کے نام کا وہ صحیح "ملفنا بھی نہیں جانتی۔ لیکن گھونگٹ اوڑھے" حتیٰ ورتا دھرم" سمجھائے جا رہی ہو۔

ان پانچوں دہلیوں میں صرف ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہم حاکم ہیں سہارن پٹی حاکم کے سامنے سارا ہندوستان سرحد کا ہے۔ ہم اس دہلی کے مالک ہیں جو بمبلیہ سے اس گمار کی ناک راج کرتی ہے۔ دہلی کا ہر باشندہ اپنے آپ کو راجپوت محسوس کرتا ہے۔ اپنی دگوں میں شاہی خون دوڑتا ہوا محسوس کرتا ہے چاہے اسے

طرح کی میلی ہے۔ جس کے مجوز، اس کے انتظار میں سوکھ کر کاشا ہر جلتے ہیں۔ ایک محبوں نے تو مجھے یہاں تک بتایا کہ وہ دہلی کے ایک میں سنا پچے پیدا ہوا تھا یہیں پر ماں کا دودھ دہلی کی کرڑا ہوا۔ میں پر موتگ پھیلے کھا کھا کر جوان ہوا میں کے انتظار میں ہی مطالعہ کرتے کرتے گر کچھ میٹ ہو گیا۔ میں کھڑے کھڑے اس نے شادی کی۔ یہاں تک کہ اب بوڑھا ہو گیا ہے۔ لیکن ابھی تک بس نہیں ملی جس پر سوار ہو کر وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ جائے اور اسے یہ خوشخبری سنائے کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ لیکن دہلی کا ہر محبوں اتنا صابر و شاکر نہیں ہوتا کہ اپنی ساری عمر میں کے انتظار میں گزار دے۔ چنانچہ وہ ایک کرچھپٹ کر، پڑک کر، دوڑ کر ابھاگ کر بس کا لٹاقب کرتا ہے اور اس نامعقول محبوب کو کسی نہ کسی طرح پکڑ لیتا ہے۔ اور جب بس سے اتر کر گھر پہنچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عینک کا ایک شیشہ ٹوٹ گیا ہے، تھلون گھٹنے پر سے پھٹ گئی ہے جب کسی بیڈ سے کٹ چکی ہے۔ اور لمبے سے خنہ پہ رہا ہے۔ اور گھر جانے کی بجائے اسے ہسپتال مانا جا رہے۔

لیکن آہ! ہسپتال جانے کے لئے بھی بس کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

اس ذلت و خوارگی کے باوجود جب صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے تو دہلی کے ہر بس شاپ پر میلوں میں قطاریں لگ جاتی ہیں۔ دہلی کی آدمی کا وہی ان قطاروں میں سمٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور پھر رات گئے تک بسوں میں بیٹھ کر یوں کی طرح بھر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دی جاتی ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق دہلی کے باشندے اپنی آدمی عمر بسوں کی نذر کرتے ہیں اور باقی آدمی عمر بسوں کے متعلق سوچ نہیں کرتے ہیں۔ ایک صاحب کا بیان ہے کہ اس نے گزشتہ چھ ماہ سے اپنے بچوں سے بات نہیں کی کیونکہ صبح وہ بس نہ ملنے کے خوف سے ملبی گھر سے روانہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت بچے سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور جب رات کو دیر سے بس ملنے کے سبب

گھر بچتا ہے تو بچے بھی سوچے م۔

دہلی کی بسین عہد حاضر کی سب سے بڑی ٹریڈی ہیں جو انسان کی عمر بیدار سے سمجھ کر کھائے جا رہی ہیں۔

دہلی کے بائیکلو اور سکوٹر

دہلی بابوؤں اور بائیکلوں کا شہر ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بابوؤں نے بائیکلوں کو جنم دیا۔ کبھی کہتے ہیں بائیکلوں نے بابو پیدا کئے مگر میری رائے ہے کہ یہ دونوں جڑواں پیدا ہوئے مگر بابوؤں اور بائیکلوں کو دہلی سے نکال دیا جائے تو دہلی بیوہ ہو کر رہ جائے اور گورنمنٹ آف انڈیا ماننے پر دو ہتھ مار کر کہے۔ اب کیا فائدہ جینے کا۔ یہ حقیقت ہے کہ بائیکلو اور بابو کی برکت ہی سے انڈیا کی عظیم سی پبلک چل رہی ہے۔ ہر روز صبح بائیکلوں اور سکوٹروں کے غول گلی کوچوں سے نکل نکل کر سڑکوں پر پھیل جاتے ہیں۔ جو بابوؤں کو اپنے کندھوں پر سوار کئے بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ اگر دہلی کی سڑکوں پر بائیکلو چل رہے ہوں تو سمجھ لیا جائے کہ سندھوستان کی حکومت چل رہی ہے ورنہ نہیں۔ سرزمین سندھوستان پر حکومت کی باگ ڈور بائیکلوں کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ اگر بائیکلو نہ ہو تو بابو دفتر نہیں جاسکتا اور جب دفتر نہیں جاتا تو سندھوستان کا وزیر اعظم تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے اور بار بار کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا رہتا ہے کہ کوئی بائیکلو آئے تو وہ حکومت کا کاروبار چلائے۔ شاید دنیا کی کوئی سلطنت بائیکلو کی اتنی خدج نہیں رہی جتنی موجودہ ستانہ کی گورنمنٹ آف انڈیا

میرا خیال ہے اس رتبہ اگر دہلی اٹھری تو صرف اس بنا پر اچڑے گی کہ بائیکلو فیکٹریاں بائیکلوں بنانا بند کر دیں اور بابو لوگ یہ شعر پڑھتے ہوئے دہلی سے نکل جائیں۔

ہے اب اس معجزہ میں تھا غم سائیکل اسد

ہم نے یہ مانا کہ دہلی میں رہیں اس پر چڑھیں
 بابو اور سائیکل دونوں جڑواں پیدا ہوئے ہیں۔ اس نے
 دونوں کے فضائل اور مسائل میں ایک دوسرے سے بے حد مشا رہیں۔ سائیکل ارتقا
 ترمین سوار سی ہے۔ اور بابو ایک ارزاں ترین ملازم ہے۔ سائیکل پر آپ جتنا
 بوجھ لاد دیجئے اُت نہیں کرتی۔ بابو پر جتنی فائلیں لاد دیجئے اٹھ لیتا ہے۔ آپ سائیکل کی
 مرمت نہ کریں تو بھی کام چلتا رہتا ہے۔ بابو کے انجن پر بھی چاہے جتنے ڈھیلے ہو چکے
 ہوں کام کرتا رہتا ہے۔ سائیکل کچھ نہیں کھاتی، فتوڑی سی ہوا بھر دو چل پڑے گی
 بابو بھی کچھ نہیں کھاتا۔ صرف اس کے دماغ میں یہ ہوا بھر دو کہ وہ بابو ہے اپنے دفتر
 کا بادشاہ۔ بابو چلتا رہے گا۔ سائیکل کو فتوڑی سی گھر میں چاہئے۔ بابو کو دور دریاں
 اور چٹانیں چاہئے زیادہ عیاشی کرے گا تو دفتری کنٹین میں چائے کا ایک کپ
 پی لے گا اور پھر نرہ تازہ ہیر کر اپنی سائیکل کو اٹھا کر نا منگی شکر کے ٹکڑی بدل لگاتا
 ہوا چل پڑے گا۔ وہ اپنی سائیکل کو بیروں کا رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اپنے
 آپ کو سلطنت کا اصل بادشاہ سمجھتا ہے۔ سائیکل پر بیٹھا ہر تو بیش قیمت کا روں
 کو حفاظت سے دیکھ کر کنگے نکل جاتا ہے۔ دفتری کرسی پر بیٹھا ہو تو بڑے سے بڑے
 سیٹھ کو بھپکا کر کہتا ہے۔ سیٹھ صاحب! اس وقت میرے پاس ٹائم نہیں
 ہے، کل آتا۔“

دہلی کا بابو اپنی اپنی سائیکل کی فطرت خوب سمجھتا ہے اور اسے ہر سانچے
 میں ڈھال لیتا ہے بابو کی طرح سائیکل بھی بڑی لچکلی فطرت رکھتی ہے۔ بابو کہیں آئے
 اپر دہلی کی طرح چلتا ہے، اس کے پیچھے فائلیں باندھ لیتا ہے۔ کہیں آٹے کی بوری
 رکھ لیتا ہے کہیں گھر کے سودا ساعت کی گھڑی باندھ لیتا ہے۔ اور کہیں جب چھٹی کے

دن تفریح کے لئے نکلتا ہے تو اسی اپنی واحد وقار بائیکل پر اپنے نئے چاندیوں اور جوی کولا وکرسار دہلی شہر گھماتا ہے۔ اور پھر ٹرے فز سے اپنی جوی سے کہتا ہے "مے کی ماں! چاہے تم میرا ساتھ چھوڑ جاؤ لیکن یہ بائیکل میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گی۔" یہ تم سے بھی زیادہ وقار و حیران ساختی ہے اور سدا سہاگن ہے۔ بائیکل اور یاوکی جوڑی مستقل اور پائیدار ہے۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کا سہاگ اسی جوڑی پر قائم ہے۔

دہلی کے تانگے

دہلی میں تانگے بھی چلتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ چلتے تھے کیونکہ آج کل توڑ حسرت سے کھڑے دیکھتے رہتے ہیں کہ کبھی جن سڑکوں پر وہ مغل شہزادوں کی طرح گردن اٹھائے چلا کرتے تھے ان پر کاریاں اسکوٹا دریس چل رہی ہیں۔ سڑکوں کی مغل سلطنت ان سے تھیں چکی ہے۔ اور اگر کبھی کہہ جاؤ تو تانگے سڑک پر چلا ہوا دکھائی دے بھی جائے تو یوں شرمناکرا ایک ایک کرہم ہم کر گئی کتر آکر کہ چلتا ہے کہ کہیں کوئی دیکھ کر بچان نہ لے کہ سلطنت کا معزول شہزادہ جا رہا ہے۔ "رائن ٹیلی سے تانگے کے تعلقات ٹوٹ چکے ہیں۔ لیکن ان تعلقات کا احساس بھی نہیں ٹوٹا۔ اور احساس کا نہ ٹوٹنا ہی سب سے زیادہ دردناک ہے۔ احساس کے بغیر تانگے کو مکمل "زوان" حاصل نہیں ہو سکتا۔

وہ ہے کہ مشین نے تانگے کو بھجپاڑ دیا ہے۔ پٹرول اور انجن اسے بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ جس سے تانگے میں احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے دہلی کی بڑی بڑی سڑکوں پر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی سڑکوں گلیوں، کوچوں کے اندر سمٹا جا رہا ہے۔ دہلی کی زندگی اتنی تیز ہو گئی ہے۔ اور اتنے

دور دور کے علاقوں تک پھیل گئی ہے کہ بے چارہ تانگو اس تیز رفتار زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس لئے وہ صرف اٹن تنگ و تاریک اور پسماندہ علاقوں میں محدود ہوتا جا رہا ہے۔ جن میں داخل ہو کر چلنا مشین اپنی زمین سمجھتی ہے مگر لوہے کی مشین کا کوئی اعتبار نہیں۔ کب اپنی عارضی زمین کا عبادہ بھلا کر مچینک دے اور تانگو کو اپنی سلطنت کی آخری پناہ گاہوں سے باہر نکال دے اور محکمہ آثار قدیمہ، دہلی کے آخری تانگے کو اٹھا کر لال قلعے کے اندر ایک کونے میں محفوظ کر کے رکھ دے: تاکہ غیر ملکی سیاح اگر اس "سندوستانی عجوبہ" کو دیکھیں۔ اور اس کا فوٹو کر امریکیہ کے لائف میگزین میں تقریر کے لئے شائع کیا کریں۔

دہلی کا تانگو کبھی دیس کی سواری سمجھا جاتا تھا۔ رئیسوں نے کاریں خریدیں تو تانگے نے عوام کی سرپرستی قبول کر لی لیکن اب عوام بھی اسے دغا دیتے جا رہے ہیں اور وہ بھی تانگوں کی بجائے بائیسکلوں کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ کیونکہ وہ بائیسکلوں سے ہمیں وہی کام لینے لگے ہیں۔ جتنا تگوں سے لیا کرتے تھے یعنی بائیسکلوں کو باربرداری کے لئے بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ تانگے کی طرح بائیسکلوں پر بھی گھوڑی چار چار سواریاں بٹھا لیتے ہیں اور تانگوں سے شرط باندھ لیتے ہیں کہ آؤ میں لگا کر دیکھ لو اہم نم سے پہلے منزل مقصود پہنچ جائیں گے۔

غرض دہلی کے تانگے اپنے آخری دن جوں توں کر کے کاٹ رہے ہیں اور عام خیال یہ ہے کہ وہ شاید اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں ایک بار پھر رئیسوں کی سواری بن جائیں گے۔ اور کبھی کبھی کوئی رئیس زادہ منہ کا مزا بدلنے کے لئے وطن کا کرنا یا چکن پین کر دہلی سرسپ لگائے پان کی گھوڑی منہ میں دبائے۔ شام کو تانگو پر سوار کے لئے بٹھے۔ اور لوگ باگ ایک ایک کر اسے یوں حیرت سے دیکھیں، جیسے

بچے ستر میں گھومتے ہوئے سرکس کے ہاتھی کو دیکھتے ہیں۔

دہلی کی کارس

دہلی کی سڑکوں پر کارس گھومتی ہیں اور پارلمینٹ کے ممبران بھی لیکن راہ چلتے لوگوں کو دونوں کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا کہ سڑک پر کوئی کار جا رہی ہے۔ یا ممبر پارلمینٹ، کیونکہ جب کوئی چیز عام ہو جائے تو اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے دہلی میں کارس اور ممبران پارلمینٹ دو بہت عام چیزیں ہیں۔ اس لئے جب وہ سڑکوں پر چلتے ہیں تو صرف انھیں ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کار ہے یا پارلمینٹ کا ممبر ہے۔

جب کوئی کار والا سڑک پر چلتا ہے تو نہ جانے کیوں اسے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ یہ سڑکیں اور پٹرول پمپ صرف اسی کے لئے بنائے گئے ہیں اور یاتی پر جو لاریاں بسیں، یا ٹیکسیاں سکوتر وغیرہ چل رہے ہیں۔ کالے رنگ کے "ریٹائرڈ" ہیں۔ اور بد قسمتی سے ڈیموکریسی نہ ہوتی۔ تو انھیں ان سڑکوں پر چلنے کی ممانعت کر دی جاتی۔ جن پر کارس چلتی ہیں۔ چنانچہ کار والا ان کی طرف ناک سکود کر دیکھتا ہے اور بڑبڑا کر کہتا ہے "ابے اندھا ہے۔ دیکھتا نہیں، کارا رہی ہے۔ راستہ چھوڑ دے یوں سڑک پر چل رہا ہے، جیسے تیرے باپ دادا کی ملکیت ہے، سہٹ جایا در چالان سکروادوں گا۔ جانتا بھی ہے ٹریفک پولیس کا سپرنٹنڈنٹ میرے داماد کا۔ معافی ہے۔" ابھی چند سال پہلے دہلی میں صرف بیڑوں کے پاس کوٹھی ہوتی تھی۔ لیکن ہمارے دیکھتے دیکھتے کوٹھی کی شرط اٹ گئی۔ اور اب تو اس آدمی کے پاس بھی کار ہے، جس کے پاس صرف دو کمروں والا کوارٹر ہے۔ یہی نے ایک ایسے آدمی کے پاس بھی کار دیکھی ہے۔ جو خالتی کے شعر غلط پڑھتا ہے۔ اور ایک ایسا آدمی تو تھی

کاروں کا مالک بنے چند سال پہلے ایک تئو رپر روٹیاں لگاتے کا کام کرتا تھا، جنی کو ایک پہلوان کے پاس بھی کار ہے اور وہ صبح آکھاڑے میں جاتا ہے تو کار پر سوار ہو کر جاتا ہے دہلی میں بمبائیت بمبائیت کی کاریں گھومتی ہیں۔ ان کے رنگ سائز وزن، شکل و صورت میں فتنی ڈریس شوز، کار سا منظر دکھائی دیتا ہے۔ یہاں اسی کاریں بھی چلتی ہیں جن پر لوگ گھاس لادنے ہیں اور اسی کاریں بھی جو در سے جیٹ ہوائی جہاز معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ سب کاریں ہی کہلاتی ہیں۔ چاہے کسی کے پاس کار کے لئے گیمراج تنگ نہ ہو مگر وہ اسے مگر کے باہر شکر یا گلی میں یوں کھڑا کر لیتا ہے جیسے کار نہ ہو کوئی لگا لے بھینس ہو۔

دہلی کی حسینا مئی ۔۔

دہلی کی حسینا مئی یوں گھومتی ہیں، جیسے جنگل میں شیر گھومتے ہیں۔ دہلی پر ان کا راج ہے۔ جہانگیر نے مشراب کے ایک پیالے پر اپنی سلطنت نذر جہاں کر دی تھی، دہلی کے موڈرن جہانگیر صرف کافی کے ایک پیالے پر سلطنت کھنچا کر دیتے ہیں۔

دہلی کی بدیشتر حسینا مئی دہلی کے کھینوں سے نہیں اگتیں بلکہ باہر سے درآمد کی جاتی ہیں۔ دہلی کی اور کھیل حسینا مئی اقلیت میں ہیں۔ اور یہ چھوٹی اقلیت میں اب ہونگا کر رائل فیملی میں شامل ہو رہی ہے۔ درآمد شدہ حسیناؤں کے پہلے پہلے طلائی رخسار غقد سے لال پڑ گئے تھے۔ لیکن حملہ آور زیادہ موڈرن متعیناروں سے مسلح تھے۔ اس لئے قدیم حسیناؤں نے معمولی سی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دیے اور پھر آستہ آستہ خود بھی موڈرن حسیناؤں کے سانچے میں ڈھل گئیں اور جنگل پر راج کرنے میں حملہ آور حسیناؤں کے ساتھ ساتھ ہی داروغہ بنیں۔

ایک مورخ نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: "ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ ہی ہوتا ہے کہ سامراجی حملہ آوروں کے کچھ کہ یہاں کے اعلیٰ باشندے اپنا لیتے ہیں، یہاں تک کہ ایک دن ایسا آتا ہے، جب اصل باشندے بھی حملہ آور اور سامراجی حاکم معلوم ہونے لگتے ہیں۔"

آزادی کے بعد وہاں ایک کاسموپالیٹن سنہرے بن گیا ہے۔ اس لئے یہاں کی حسینائیں بھی کاسموپالیٹن قسم کی حسینائیں بن گئیں ہیں۔ بنگال کی عبادت کرنے والی کالی، لمبی زلفیں، سندھ کے پرہار رنگ زاروں میں کھلی ہوئی دلائی سگرٹوں کے پھول لگا کر، جب مدراسی برہمن زادوں کی ساتولی سڈول اور رقص کرتی ہوئی اینڈریوں پر، پنجاب کے سنہرے مکئی کی طرح مشوخ و مشنگ چمکیلے رخساروں پر خلعت فتنیں کا سایہ ڈالتی ہیں تو یورپ کی لیلگوں آنکھوں اور بھورے کٹے ہوئے بالوں پر بھی جینوں سوار ہو جاتا ہے کہ بنارس سٹریٹس میں گر بازار میں نکلیں اور آتش مشوق میں کاسموپالیٹن حرارت پیدا کر لیں اور جلد صربا زار سے گزریں کشتوں کے پتے لگا دیں اور حسن کو عالمگیر بنادیں اور عاشقوں کو "کنفیوز" کر دیں کہ لگا ہوا شیرے (کہاں شیرے کس پر شیرے کہ کانگو کی پتھر ملی حسینہ اور کشمیر کی گلنار میر ہوئی دونوں بیک وقت دل کو کھینچ لیتی ہیں۔ اور یہ بھی نہیں سوچنے دیتی کہ دل کس کے حوالے کریں۔ پانچ منٹ پہلے ایک جا پانی گرایا جو دل لے گئی یعنی اب اسے کس منہ سے کہیں حضور! ایک افغان زادی ہم سے دل لینے کا مطالبہ کر رہی ہے، براہ کرم ہمارا دل بٹا دو کہ ۔

یہاں عشق کے امتحان اور بھی ہیں

نثاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

دہلی میں حسینوں کی تعداد کتنی ہے؟ اس کے متعلق کوئی اعداد و شمار نہیں ملنے۔

محکمہ مردم شماری اس سلسلہ میں خاموش ہے۔ کیونکہ رولز کے مطابق، حسن شماری کے خزانے میں شامل نہیں۔ لیکن عام اندازہ یہ ہے کہ حسینیوں کی تعداد تیز سے بڑھ رہی ہے۔ ایک مستقل قسم کے "شُرک گرد" عاشق کا حلقی بیان ہے کہ وہ ایک شرک پر گزشتہ دس برس سے حسن شماری کر رہا ہے، لیکن ہر روز اس شرک پر پچھتہ فی صدی نئی حسینیائی نمودار ہو جاتی ہیں۔ نہ جانے وہی حسینیائی بھیس بدل کر سامنے آ جاتی ہیں یا کسی جیسے ہوئے ریزرو شاگ میں سے تیا مال نکال کر مارگریٹ میں بھیبیدیا جاتا ہے۔ اس لئے تعداد کے اضافہ کی صحیح رفتار کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے۔ خطرو یہ ہے کہ ایک دن ایسا آجائے گا جب دہلی شہر کی ہر صنعت "ازک" حسینہ سے چکی ہوگی اور ہر حسینہ لاکھوں دل اپنے پرس میں چھپائے پرس جھیلانی نظر آئے گی اور اس وقت شایدا ان کی شمار کرنا تینا آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ حسن کی تنگڑی میں یہ عام رجحان پھیل رہا ہے کہ لباس کی موڈرن، تنکیں اور پچھلی نراش خراش ہی کو حسن کی بنیاد بنادیا جائے اور لباس ہی کو ایک ایسا فل سورج بنا دیا جائے جس سے چکا چوند میں، نین نقش کے سمی چھوٹے موٹے ستارے اور جھل جھلکی عشق کے لئے یہ ایک بہت جانکاہ اور آزمائشی دور ہے کہ لب و رخسار کی قدیم نرازو میں لباس سے ڈنڈی مارنا شروع کر دی ہے۔ اور بے چارے عاشق حیران ہیں کہ اس ڈنڈی سے دل کی قدر قیمت کو بچائیں یا حسین سودا گردوں کی اس نئے بازی میں نفل و دل و جان نثار کر ہار مان لیں۔

دہلی کی حسینیوں کی لیڈر شپ یونیورسٹی کی لڑکیوں کے ہاتھ میں ہے کیونکہ وہ دل لینے کے منت سے ڈھنگ ایجاد کرتی رہتی ہیں۔ اگر کسی شام کو یونیورسٹی کی ایک حسینہ جو گئے رنگ کا لمبا کرتازیب تن کر کے میدان کارنار میں اخترا تی ہے تو دوسری شام کو دہلی کی تمام حسینیائی جوگنیں بنی ہوئی نظر آتی ہیں اور اب تیسری

شام پوری طرح ختم نہیں ہوئی کہ یونیورسٹی کی کوئی حسینہ جو گیا لباس اتار کر تنگ چلن پہن لیتی ہے۔ جیسے وہ حسینہ نہ ہو بلکہ ایسا کورس کی چاق و چوبند گلو سوار ہو۔ چنانچہ چوکنی شام دہلی کے سلم ایریا میں رہنے والی رام جی داس کلرک کی میٹرک پاس بیٹی ٹائپسٹ کا کام کرتی ہے۔ نزدیکی شلبریا سٹرک کو تنگ چلن تیار کرنے کا آرڈر دے آتی ہے کہ فیشن بدل گیا ہے اور حسیناؤں نے کوئی "ٹرائل کلر" لباس پہننا شروع کر دیا ہے۔

دہلی کی حسیناؤں کی کہانی یہی ختم نہیں ہوتی۔ ان کی زنگوں کی طرح اس کہانی کے بھی کئی سچے، کئی ختم، اور کئی شاکل ہیں۔ لیکن میں صرف ایک بات کہہ کر اسے ختم کرتا ہوں، دہلی کی حسینائیں وہ لیلیاں ہیں جو محبتوں پر جان نثار کرنے کی قائل نہیں ہیں صرف کبھی کبھار ایک آدھ خودکشی کی خبر آجاتی ہے حسیناؤں کی تعداد کے اعتبار سے خودکشیوں کی یہ تعداد کٹے سی ٹک کے برابر ہے۔

دہلی کے عاشق

دہلی کے عاشقوں کی سب سے بڑی ٹریجڈی، یہ ہے کہ ان کی اپنی کوئی آواز نہیں ہے۔ وہ صرف دہلی کی حسیناؤں کی گنبد کی صدائے بازگشت ہیں۔ اگر آپ چاہیں کہ دہلی کے کسی عاشق کو الگ کر کے دیکھیں تو آپ کو مایوسی ہوگی کیونکہ وہ کسی نہ کسی حسینہ کے درپے میں تنکے کی طرح اٹکا ہوا نظر آئے گا اور وہ تنکا دو پٹے کے بغیر آپ کو لاڈلٹ نظر آئے گا۔ درپٹہ ہی اس کی سہمی کی ضمانت ہے۔ اور وہ اگر آپ اسے درپٹہ سے الگ کر کے دیکھنا چاہیں گے تو وہ یوں لگے گا جیسے سگر میٹ کی راکہ زمین پر گر گئی ہے

دہلی میں عاشقوں کی تعداد حسیناؤں سے کئی سرگتا زیادہ ہے۔ تعداد

اس بے بیگم افتاد نے عشق کا معیار مگر ادا ہے اور عاشق لوگ اس مگرے ہوئے معیار کو نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ عشق اندھا ہوتا ہے۔ مجھے ایک عاشق کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ حسن کا تقاب کرنے کے لئے ہر روز بائیسکل پر پندرہ پندرہ میل کا سفر کرتا رہا اور آخر ایک دن جب اس کی محبوبہ نے دُور محبت میں اس سے پوچھا: پیارے میرا جی چاہتا ہے کہ تم پر کچھ کھچا دو کروں۔ بول کیا مانگتا ہے؟

جواب میں عاشق کے من سے بے ساختہ نکلا: "پیارے! مجھے ایک سکوتر دے دو۔ مجھ سے اب زیادہ دیر بائیسکل نہیں چلائی جاتی۔"

دہلی کا عاشق حساب کتاب کا عاشق ہے۔ وہ عشق کو بائیسکل اور سکوتر پر توڑتا ہے۔ وہ بے حد چمکتا ہو کر دیکھتا ہے کہ حسینہ کے حسن کی کیا قیمت ہے۔ وہ کافی کے کتنے کپ پلا چکا ہے۔ اور اس کے بدلے میں اسے کتنی مسکراہٹیں مل چکی ہیں۔ اگر محبوبہ کی طرف سے مل ہوئی مسکراہٹوں کی تعداد کم ہے تو عاشق کا ناوک شیخہ دل چرچر ہو جاتا ہے۔ اور وہ محبوبہ پر بے وفائی کا الزام لگا دیا ہے۔ اگر زیادہ ذکی الحس ہو جاتا ہے تو مسکراہٹیں کم ہونے کے غم میں ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے۔ راتوں کو تارے گنتا ہے۔ اور فلمی گیت گنتا ہے اور کافی کے بلوں کے غیر متوازن بھٹ کو اس طرح پورا کرتا ہے کہ ٹرہیا بلیڈوں کی بجائے گھٹیا بلیڈ استعمال کرنے لگتا ہے۔ بلکہ کئی بار تو ہفت روزہ شیٹ نہیں کرتا۔ اور اگر وہ حال ہو کر یہ شعر پڑے رقت انگیز میں بھجے میں گاتا ہے۔

اک بے وفا سے پیار کیا، ادا کئے کیا کیا

خرد کو ذلیل و خوار کیا ادا کئے کیا کیا

دلی کے عاشقوں کی ایک اور بلند قسم بھی ہے جو حسن کا مول تول

نہیں کرتا، بلکہ اپنے عشق کا مولی تول کرتی ہے۔ اس قسم کے عشق میں کافی کے پیالے

نہیں ملے جلتے اور نہ دیکھا جاتا ہے کہ حسی کے تناقب میں کار کا کتنا پٹرول ضائع ہوا۔ بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ عاشق کو سرشل اور اقتصادمی طور پر کہیں ہٹیا کر نہیں سمجھا جا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں مکانات کے کرائے کی طرح حسیناؤں کا رمیٹ بھی بڑھا دیا جاتا ہے۔ بلڈنگ کا کرایہ جتنا زیادہ ہوگا۔ بلڈنگ کی سماجی حیثیت اتنی ہی زیادہ بڑھے گی۔ اور بلڈنگ کی حیثیت بڑھنے کے ساتھ ساتھ بلڈنگ کے مالک کا مرتبہ بھی بڑھے گا۔ اس قسم کے گھر محض تنگ تناسخ دیکھنے والے مالک مکان قسم کے عاشقوں نے جہاں عشق کا مارکیٹ ریٹ بہت بڑھا دیا ہے وہاں محبوباؤں کے دماغ بھی بگاڑ دیئے ہیں اور عشق کے مفہم کو چیک بیلنس کی سالانہ رپورٹ بنا دیا ہے۔ آپ کے پاس کار ہے یا نہ۔ یا آپ صرف کسی پبلک پارک میں ایک آنے کی مڑنگ پھلی ہی سے محبوبہ کا دل دھجا رہے ہیں ؟ کار اتنا نگر اور مڑنگ پھلی میں جتنا فرق ہوتا ہے، اسی فرق کی بنیاد پر عشق کیا جاتا ہے اور ان چیزوں کو پرکھنے کی کوئی صورت حسیناؤں کے پاس ہے۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ دہلی کے عاشق کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے جو کچھ حسیناؤں کے پاس ہے۔ دہلی کے عاشق حسیناؤں کے دوپٹے کے تنگے ہیں۔ اس تنگے کو الگ کر کے دیکھیے تو نہ کار کی حیثیت باقی رہتی ہے نہ بائیکل کی۔ نہ پتے اور بادام کی نہ مڑنگ پھلی کی۔ غریب اور امیر دونوں کے عاشق مول تول کا فکا رہیں۔ اور یہ مول تول محبوباؤں کے اختیار میں ہے۔ عاشقوں کے اختیار میں تو صرف چند رومانسک اشعار ہیں جنہیں پڑھ پڑھ کر وہ اپنے شب دروڑ بگاڑ رہے ہیں۔ اس کے باوجود سمجھتے ہیں کہ وہ نفس اور رانجے کی روایات کے وارث ہیں۔

دہلی کے عاشقوں کی ایک اور قسم بھی ہے جن کے پاس کوئی محبوبہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے پاس اپنے عشق کی کئی مفروضہ کہانیاں موجود

ہیں۔ اور وہ محفلوں میں، کلبوں میں، ریستورانوں میں اپنی ان محبوباؤں کے دلغریب قصے بیان کرتے رہتے ہیں جو اس پیدا نہیں ہوئی اور اگر پیدا ہو چکی ہیں تو عاشقوں کے نام پتے اور شکل سے آگاہ نہیں مجھالیے ہی ایک عاشق سے ملاقات کا سٹر حاصل ہے۔ وہ راہ چلتی ہر تیسری حسینہ کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ اس پر مرمی ہے۔ اور آج کل دو بچوں کی ماں بن چکی ہے۔ فلاں موتیوں جیسے دانتوں والی حسینہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی اور اس نے میرے ساتھ ساری عمر گزارنے کا عہد کیا تھا۔ لیکن اس کی ایک چھوٹی دسی بے وقوفی پر میں نے اسے دھتتا تبا دیا۔ اپنی بے وقوفی اور میری بے نیازی کے باعث ابھی تک شادی نہیں کر سکی۔ اور فلاں خلیگوں ساڑھی اور آنکھوں والی حسینہ مجھے اعنا کر کے تاج محل تک لے گئی تھی۔ لیکن جب میں نے کہا کہ میرے پاس شایجاں کی طرح اتنا روپیہ نہیں ہے کہ تمہارے لئے ایک تاج محل بھڑاسکوں تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اور آج کل تاج محل کی بجائے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتی ہے اور کلرک کی نیچے پیدا کرنے والی ٹائپ مشین بنی ہوئی ہے۔

ان عاشقوں کی عمر کے متعلق جب کسی حسینہ کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب سب حدود سے آگے بڑھ گئی ہے اور ان کی خودکشی کا خطرہ ہے تو ان میں سے کوئی حسینہ رحم کھا کر ان کی طرف بڑھتی ہے اور کہتی ہے کہ "اب" سب قصے تمام ہوئے اب شادی کر لو۔"

جس پر وہ جوابیت آتا ہٹ اور بے بسی کے عالم میں "ہاں" کہہ دیتے ہیں اور کسی بینڈ پارٹی کا ایڈریس پر چھپے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو ان کے فرضی عشق کے ماتم اور حقیقی شادی کی خوشی کی دھن بچا سکیں۔

اسی کوئی ماتمی خوشیوں میں شرکت کرنے کا مجھے بھی نصیب حاصل ہو چکا ہے۔

دہلی کے مکان

دہلی میں صرف دو قسم کے انسان رہتے ہیں۔ مالک مکان اور کرایہ دار ایک انور قسم میں ہے جو "لامکان" کہلاتی ہے اور خدا کی طرح ہر جگہ موجود ہے فٹ پائنتوں پر تھڑوں پر، بارکوں میں، پلوں کے نیچے، پلوں کے اوپر، برآمدوں میں کھنڈروں میں مگر یہ ضمنی قسم ہے۔ خدا کی طرح مکان سے بے نیاز ہے۔ حقیقی قسمیں دو ہی ہیں۔ مالک مکان اور کرایہ دار۔

مالک مکان — مکان بناتے ہیں۔ اپنے لئے نہیں بلکہ کرایہ داروں کے لئے دہلی میں جو مکان بنتا ہے اس میں کرایہ داروں کے مزاج اور فضاؤں کو انیٹوں کی طرح جن دیا جاتا ہے۔ جن مکانات میں ایسا نہیں ہوتا۔ ان کے مقلد مالک مکان سمجھتا ہے بیکار پیسہ ڈلو یا مکان کے نقشے ہی میں کرایہ داروں کے چہرے اور جیب فٹ کردی جاتی ہے۔ بلکہ اکثر اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ مکان کے لئے ایجنسی سنٹ کی منفرج بھی نہیں آتی کہ اس پر کرایہ داروں کا ہر ڈلگ جاتا ہے۔

دہلی میں ایسے مالک مکان بالکل گدھے سمجھے جاتے ہیں جو کرایہ دار نہیں رکھتے اور شکوہ ہے کہ دہلی میں گدھوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مجھے ایک ایسے ہی گدھے رئیس کے بارے میں معلوم ہے کہ اس کی کوٹھی میں کرایہ دار رکھنے کا سخت مخالفت ہے۔ لیکن اس کی بیوی اسے ایک سو روپیہ ماہانہ گریڈ میٹروپولیٹن ایکسچینج نے اپنا مکان اپنے بیٹے اور بہنو کو کرایہ پر دے رکھا ہے۔

چاٹ والے سے ممبران پارلیمنٹ تک :

دہلی کے مکان۔ انسانوں کے لئے نہیں کرایہ کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ بلکہ

کے گرد و گولہ کے بیل کی طرح جھومتے ہیں۔ اگر یہ دایوں کی معنی اقسام ہیں۔ اتنی ہی اقسام کے تفسیری آرٹ ہیں۔ آرٹ — غرضی چیز ہے۔ اگر یہ بنیادی چیز ہے۔

یہاں کے مکان چار قسم کے ہیں۔

(۱) قدیم مکان (۲) نئے ننگے اور کوٹھیاں (۳) عوامی مکان (۴) مسلم ایریا

کی تعبیرات ہیں۔

دہلی کے قدیم مکان۔

مکانوں کی قسم پرانی دہلی میں پائی جاتی ہے۔ انہی مکانوں کی گلیوں کے

بارے میں ذوق نے کہا تھا۔

کون جائے ذوق اب کی گلیاں چھوڑ کر

یہ گلیاں اتنی تنگ و تاریک اور بھول بھلیاں قسم کی ہیں کہ ان سے باہر

نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ اس لئے انہیں چھوڑ کر جانا آسان نہیں۔ ذوق

نے ٹیبلٹ کہا تھا۔ ان سے باہر نکلنے کا واقعی کوئی راستہ نہیں۔

قدیم طرز کے یہ مکان اس زمانے کے انسانوں کی گہری اور قریبی محبت کو ظاہر

کرتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں۔ اتنے جڑے ہوئے ہیں کہ ایک مکان

کا یا شندہ اپنی چھت پر کھڑا ہو کر دوسرے مکان کی چھت پر کھڑے ہوئے یا شندے

کا بوسہ دے سکتا ہے۔ مل کر ڈوسٹ کا سکتا ہے۔ ایک دوسرے کا سگریٹ سٹو

کے آگے تو ہاتھ بڑھا کر پتھر مار سکتا ہے۔ ان مکانوں کی عورتیں اپنے گھروں

سے نکلے بغیر ایک دوسرے کو گالیاں اور کوسنے دے سکتی ہیں۔ حال ہی میں ایکس چینج

کر سکتی ہیں۔ اپنی چھت پر کھڑے کھڑے غرضیت تک کر سکتی ہیں۔ غرض یہ قدیم طرز

کے مکان دو انسانوں کے دماغ اور غرضیت کا سمبل ہیں۔ اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں

۱۔ دنیا بھر کے لوگوں قریب آجاء کیونکہ قربت ہی تمہارے دکھوں کا علاج ہے نہ صرف علاج ہے بلکہ خود بھی ایک دیکھ ہے۔ اس لئے دکھی ہونا چاہئے ہوتا ایک دوسرے کے مکانات کا قریب آئے اور محرموں کو مورچے بنائے میں اور عورتوں کو سیاہ کرنے میں سہولت ہو جائے۔

یہی جذبہ وصال و قربت ہے کہ اگر ان میں سے ایک مکان بھی گھرے تو وہ میدانِ صحرایہ پر گرتا ہے۔ اور دوسرا مکان تیسرے پر۔ اور اس طرح ایک مکان کے گرنے سے ایک سا تہذیبی چار مکان گر جاتے ہیں۔ جیسے بچھڑے ہوئے اہل محبت ایک دوسرے پر بوسے ثبت کر رہے ہوں۔

اور چونکہ یہ قدیم مکان ہیں۔ اس لئے عام طور پر گھومتے رہتے ہیں۔ اگر چہ ان کا عمر نامہ بشکونی سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ دہلی کے قدیم کلچر کی یادگار ہیں۔ انہیں محفوظ رکھنے کے لئے برابر انٹیسٹین اور پلستر لگائے جاتے ہیں۔ اس کلچر کو محفوظ کرنے کے سلسلہ میں فرانیسٹری بھی دی جاتی نہیں اور ہر سال مکان گرنے سے بہت سے لوگ طبے کے دھچکے آکر شہید ہو جاتے ہیں۔

جب یہ قدیم مکان طبے بن جائیں گے۔ دہلی کا قدیم کلچر بھی طبے بن جائے گا اور انشاؤ اللہ وہ دن بہت جلد آ رہا ہے۔

کوٹھیاں اور شنگلے

مکانوں کی دوسری قسم کوٹھیاں اور شنگلے ہیں۔ ان کی طرز تعمیر میں یہ خیالی رکھا جاتا ہے کہ ان میں مصری، ایرانی امریکی، فرانسیسی، روسی، جاپانی، افریقی روح نظر نظر آئے۔ مگر ہندوستان ہرگز نظر نہ آئے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی روح مفلس ہے اور یہ کوٹھیاں اور شنگلے امیر لوگ بناتے ہیں۔ اور وہ نہیں چاہتے کہ ان پر مفلس ہندوستان کا

سرایہ بڑے۔ اس لئے وہ اپنی کونٹیاں ہفلس عوام کی چشم بد سے دور شہر سے یا ہر بنواتے ہیں۔ اگر ان کا بس چلے تو وہ اپنی کونٹیاں شہر کے باہر ہی نہیں ہندوستان کے بھی باہر تعمیر کر دیتیں۔

عوام سے دور شہر سے باہر کونٹیاں بنوانے کا رجحان آہستہ آہستہ اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ شہر کے باہر کونٹیوں اور جنگلوں کا ایک اور شہر بن گیا ہے اور بڑے لوگ بہت پریشان ہیں کہ اب کیا کریں۔ وہ اس دوسرے شہر کے بھی باہر جنگلوں کی طرف بڑھ رہے ہیں تاکہ عوام سے دور اور فطرت کے نزدیک جا سکیں۔ لیکن وہ جوں جوں جنگلوں کی طرف بڑھ رہے ہیں شہر ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ چنانچہ اب دہلی کے ارد گرد جنگل اور پہاڑ عام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ جنگل اور پہاڑوں میں کونٹیاں اور جنگلے نمودار ہو گئے ہیں۔ فطرت غائب ہو گئی ہے۔ افلاس اور سرمایہ کی لسی نے فطرت کو روند ڈالا ہے، مار ڈالا ہے۔ فنا کر دیا ہے۔

ان کونٹیوں میں وہی لوگ رہتے ہیں جو دہلی (بلکہ ہندوستان) پر راج کرتے ہیں۔ کار، بل ڈاک، ہرے ہرے لائن، برقی قہقہے، معنوروں کے قیمتی نشانہ سہکار، ریشم و کچھاب، دودھ اور چاندنی میں دھلی ہوئی عورتیں، ڈرائیوٹنگ روم، پانگ روم، ریننگ روم، اوٹینگ روم، ڈرائیوٹنگ روم، پانگ روم، چیلڈرن روم، ڈانس روم، انگریزی میں سنٹا، روٹا، لٹنا، عشق کرنا۔ غرض راج کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ وہ سب ان کونٹیوں میں جمع کر لی جاتی ہیں۔ ان سب نعمتوں کے لئے روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ یہ رائل فیملی کے شہزادے ہی جانتے ہیں۔ کیونکہ یہ ان کا "ٹریڈ سیکرٹ" ہے۔

ہاں! دہلی میں ایک افواہ ضرور پھیلی ہوئی ہے۔ کہ یہ سب نعمتیں وہی لوگ ہی بنا کر لے رہے ہیں جن سے یہ شہزادے بھاگ بھاگ کر جنگلوں کی طرف بڑھتے اور کونٹیاں بناتے

جابر ہے ہیں۔

یہ کرمبیاں اور بنگلے کرایہ پر مل جاتے ہیں، لیکن ان میں صرف وہی کرایہ دار رہتے ہیں جو خود بھی رائل فمیلی سے تعلق رکھتے ہیں، کیونکہ ان کا کرایہ بھی شاہی ہوتا ہے۔
 کچھ ہیں ایک بار ایک سرکاری افسر نے جن کی تنخواہ ایک ہزار روپے ماہانہ تھی، ایک کوٹھی ایک ہزار روپے ماہانہ کرایہ پر لے لی وہ اپنی تنخواہ کرایہ میں دے کر کوٹھی کے باہر بیٹھ گیا۔ اور ہر راہ چلتے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا۔ بابا! خدا کے نام پر ایک چمبے دے دو۔ بھوکا ہوں۔“

لیکن شام تک اسے بھیک میں ایک چمبہ تک نہ ملا، کیونکہ ہر راہ چلتے نے یہ سمجھا۔ ایسا سوڈا بوتل ڈال دی بھکاری نہیں ہو سکتا۔ مذاق کر رہا ہے۔

عوام کے مکان

دہلی عوام کا شہر ہے۔ اس لئے ان کے مکان بھی بڑے ہیں ان کے مکانوں کی وہی ساخت ہے جو عوام کی اپنی ساخت ہے۔ عوام بھوک کے مارے ہیں اس لئے ان کے مکان بھی یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے صدیوں سے بھوک ہڑتال پر ہیں۔
 عوام کے مکان عوام کے کلچر کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی تعمیر کے وقت بھی عوام کے کلچر کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے۔ ایک کمرہ ایک رسوائی۔ ایک باتھ ... مگر نہیں۔ باتھ روم کا کام رسوائی سے بھی لیا جاسکتا ہے اور بس۔ اس سے زیادہ کی عوام کا کلچر اجازت نہیں دیتا۔ اگر کسی عام آدمی کے پاس ایک کی بجائے دو کمرے ہوں تو اس کی بیوی یہ کہہ کہہ کر اس کی نیند حرام کر دیتی ہے کہ یہ دوسرا کمرہ کرائے پر اٹھا دو۔ ہماری ضرورت سے زیادہ ہے۔ اور کچھ نہیں تو اس کرایہ سے بچوں کی ٹیکس اور قسطیں ہی بن جائیں گی۔

عوام شاشتروں کے انبیائی ہیں، اس لئے ان کے مکان بھی شاستروں کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان مکانوں سے صبر و قناعت نکلتی ہے۔ حرص و ہوا کا اور کبھی گز نہیں ہوتا۔ اکڑوں اور جمبوٹا غور و انقباض جمع تک نہیں گیا۔ ایک پادشاہ سپدرہ عوامی کنبوں کے لئے کافی ہے۔ اکیس غسل خانہ میں دس دس گھوڑے اسٹنان کر لیتے ہیں ایک ہی کمرے میں چار پائیاں کرسیاں، ریڈیو سیٹ، انگلیشی، جوئے کتابیں برتن ہر چیز سما جاتی ہے۔ کیونکہ عوام کی تعمیر ری یہ ہے کہ دل بڑا ہونا چاہئے مکان نہیں۔ دل بڑا ہے تو اس میں کرسیاں بھی رکھی جاسکتی ہیں اور پانی کی بالٹیاں بھی۔ کئی لوگوں نے تو اپنے دل میں بچپن کے لئے پلے گرافنڈ تک بنا رکھے ہیں۔ جسے دیکھ کر وہ ہذا کا شکر بجا لاتے ہیں۔ جس نے انقباض صوفہ سیٹ عطا نہیں کیا۔ ورنہ وہ اسے کہاں رکھتے۔

عوام کے ان مکانوں کی ایک اور کلچرل خصوصیت یہ ہے کہ وہ یہ کہ ان مکانوں کے ناموں میں لکھتے اور جھوٹے رو نہیں رکھا گیا۔ یعنی عوام نے اپنے مکانوں کے "سٹیش محل"، "بریم بھون"، "قنرا عمر"، "آرام محل"، "عشرت کدہ"، جیسے شائدا نام نہیں رکھے۔ بلکہ ان کے مکانوں کے نام منہ سوں پر رکھے گئے ہیں۔ بلاک نمبر، کوآرڈینٹ نمبر، چوبیس نمبر، اٹھائیس نمبر، پچاس نمبر۔ ان سیدھے سادے، غیر پیچیدہ ناموں سے عوام کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ عوام کو سب اپنے نام رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ یعنی اگر کسی کا نام گھنٹیاں لال ہے تو اسے گھنٹیاں لال کے نام سے نہیں پکارا جاتا۔ بلکہ یہ کہا جاتا ہے، "اٹھارہ نمبر والا آیا تھا۔" کہا تھا، "پائیس نمبر والے کی بیوی اس کے نیچے کا خلاف چرا کرے گئی ہے۔" ہم نے یہیں نمبر والے سے اس کی شکایت کی تو کھٹے نمبر والا باہر نکل آیا اور اس کی بے جا حمایت کرنے لگا۔

یعنی عوام کا کوئی نام نہیں رہا۔ مکانوں کا نام ہی باقی رہ گیا ہے۔ عوام

اب اپنے مکان کے نام ہی سے پہچانے اور پکارے جاتے ہیں۔ عوام اب نشان نہیں رہے مکان ہو گئے ہیں۔ عوام اور مکان میں بعید بعد مضبوط گیا ہے۔ اور "ترمین شرمی، امن تو شرم" کے مصداق ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے آتما، پرمانما میں مل جاتی ہے اور عوام کے کلچر کی وہ بلند ترین منزل ہے۔ جہاں سے خدا صرف ایک آدھا اپنا آگے رہتا ہے۔

سلم ایریا کی جھوٹریاں

دہلی میں سلم ایریا کی جھوٹریاں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ ان کا کوئی طرز تعمیر نہیں۔ یہ خود رو پردوں کی طرح اٹھتی ہیں اور خود بخود مرجھا جاتی ہیں۔ یہ عام طور پر گدے نالوں، نشیبی علاقوں اور جھاڑ جھنکاڑ کے پاس بنائی جاتی ہیں۔ بظاہر یہ دہلی کے ماتھے پر داغ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس داغ کے بغیر دہلی کا ماتھا مکمل نہیں ہوتا۔ اس لئے جب دہلی کے ماتھے کو صاف کرنے کے لئے ایک جھوٹری عرائی جاتی ہے تو نئی جھوٹریاں جنم لے لیتی ہیں۔ دہلی کے مہذب حکام کا خیال ہے کہ جب تک ان جھوٹریوں میں رہنے والوں کو ختم نہیں کیا جائے گا، یہ جھوٹریاں ختم نہیں ہو سکتیں۔ لیکن جھوٹریوں والے چونکہ سماج کی تہذیب کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اس لئے وہ ختم نہیں ہو سکتے کیونکہ تہذیب کی کوکھ کو بانجھ کرنا کس کے بس کا ہو گا نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ تہذیب کے نمائندے ان جھوٹریوں کو ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں۔ انہیں "پانی، بجلی اور تاباں مہیا کرتے ہیں، انہیں دوشروں کی فرست میں شامل کر لیتے ہیں، اہی کے خلاف آواز اٹھاتے رہتے ہیں تاکہ یہ غلامت قائم رہے، زندہ رہے۔ کیوں کہ جمہوریت کو زندہ رکھنے کا یہی تقاضا ہے

خط لکھیں گے...

آنریبل ادگھاٹن سنگھ جی کے نام

وزیر صاحب قبلہ !

کل آپ نے جوتیوں کی دوکان کا ادگھاٹن کرتے ہوئے ایک شعر پڑھا تھا۔

جب بھی کسی نے محبوب کا نام لیا

ہم نے دل اور جگر دونوں کو تھا لیا

ایک حسین شعر کو آپ نے صرف اس لئے ذرا کڑا لیا۔ کیونکہ آپ وزیر تھے

اگر آپ آپاٹی کے وزیر ہوتے تو بے شک آپ شعر و ادب کا ستیا ناس کر سکتے تھے

لیکن آپ کو یہ یاد نہیں رہا کہ آپ تعلیم کے وزیر ہیں۔ آنریبل ادگھاٹن سنگھ جی آپ

اپنے ماتھے کی طرف خاص دھیان دیجئے کہ آپ کس محکمے سے متعلق ہیں۔

میرا خیال ہے آپ نے گزشتہ مہینے چار پائیوں کی دوکان کا ادگھاٹن کرتے

وقت میں یہی غلط شعر پڑھا تھا اور ایک چٹ نڈکیپنی کی مینگ میں بھی یہی غلط

شعر ارشاد فرمایا تھا کیا آپ کو کوئی اور غلط شعر نہیں آتا؟ میرا مطلب ہے کہ

کبھی ایک آدھ صحیح شعر بھی پڑھ دیا کیجئے اور اگر یہی غلط شعر ہی پڑھنا ہے تو اس

میں وقتاً فوقتاً مغز اسی مغز اسی تبدیلی اور اصلاح کر لیا کیجئے، یعنی ہمیشہ دل دھج رہا
 نہ تھا، کیجئے، کہیں پھیپھڑا بھی ختم کر لیا کیجئے۔ آخر دوسرے اعضاء نے کیا تصور
 کیا ہے۔ سب کے ساتھ سوشلزم رہتے۔ مگر آپ سوشلزم کے بڑے حامی
 ہیں اس انکوائری کمیٹی کا کیا بنا جو آپ کی تاجائز اولاد کے سلسلے میں بھڑکیا کیا تھا؟
 بائی دی دے! یہ بتائیے کہ آپ وزیر بننے سے پہلے کیا کام کرتے تھے؟ کیا یہ
 افراد صحیح ہے کہ آپ تاجائز مشراب کی بمبئی چلائے ہوئے ایک بار گرفتار ہو گئے
 تھے۔ لیکن بعد میں تسمیری کمیٹی کے چیرمین بنادے گئے تھے۔ مگر تو آپ کا بڑا نہیں
 تھا۔ اپنا "حال" کیوں بگاڑ لیا اور غلط شعر پڑھتے لگے۔ لیکن قسمت کے دھنی
 ہوا نرسل! غلط شعر پڑھی سامعین سے داد کی تالیاں بجوا لیتے ہو۔

نوجوان بھکارن کے نام

رام کل ڈارنگ

میں نہیں جانتا بہتہ را نام رام کل ہے یا چپا کلی۔ کیونکہ بھکارن کا کوئی نام
 نہیں ہوتا۔ وہ نام سے جس کام سے پہچانی جاتی ہے اور "ڈارنگ" میں نے محسوس
 اس لئے لکھ دیا کیونکہ رام کل کچھ اچھا نہیں لگتا۔ بھیکا بھیکا سا لگتا ہے "ڈارنگ" کا
 لفظ صرف تمہاری تخیل کے لئے لگا ہے۔ جیسے لوگ اپنے نام کے ساتھ لقب، سرنام
 چودھری، انٹری یا مہاشے لگا کر اپنے نام میں جان پیدا کرتے ہیں۔

رام کل! میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تم کہاں سے آئی ہو۔ ہو سکتا ہے۔ تمہارا
 سلسلہ نسب بھی کسی سردار، چودھری یا نواب سے ملتا ہو۔ کیونکہ اس دنیا کا ہر انسان
 کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی "رائل فیملی" سے متعلق رہا ہے۔ دھارے مٹنے کا حلوائی اپنے چپ
 کو سورج شبی خاندان سے جوڑتا ہے، عین ممکن ہے تمہاری پروادی بھی کسی شہزاد کی

محبوب رہا ہو۔ میں ایسے کئی سفید پوش چودھریوں کو جانتا ہوں جو یا تو کسی نہ کسی رام کلی کے بطن سے نمودار ہوئے یا کسی نہ کسی حسین اور جان رام کلی کے بطن سے آئے۔
وہ چودھریوں کو نمودار کر کے نکال با عیش اپنے۔

یہ حسب نسب کی تکلیف دہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں رام کلی ڈار لنگے
کہ جس پٹر کے بیچے چند ماہ پہلے تم دین بیسرا کرتی تھیں وہاں سے تم ایک دم گم ہو گئیں
لیکن اب کے جب تم پھر لوٹی ہو تو تمہاری نگو میں ایک نفاسا بچہ بھی تھا مستقبل کا
ایک اور نفاسا بیکاری۔ سچ سچ بتاؤ تم کسی راج محل میں چلی گئی تھیں بسو سائے کا
کوئی شہزادہ، کوئی چودھری، کوئی سرور تھیں شاہی نسل کی بد نصیب بیکاری
سمجھ کر لے گیا تھا اور تمہارے بطن سے ایک راجکار پیدا کرنے کے بعد تمہیں پھر اس بچے
کے بیچے پھینک گیا ہے۔ تاکہ تم اپنے پٹر کے ساتھ جڑ جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے۔ رام کلی !
راکل فیملی ابھی تک تمہیں نہیں بھولی۔ ان کی رگوں کا ہونہارے لئے آج بھی کبھی
کبھی محل اٹھتا ہے۔

یہ کیفیت تمہیں بیٹا مبارک ہو۔ بڑا ہو کر یہ بھی بیکاری بن جائے گا۔ نسل کوئی
بھی ہو رام کلی ! اسے قائم رہنا چاہئے۔ کم از کم اس کی وجہ سے خاندان کا نام تو
زندہ رہے گا۔ گداگری کی رسم تو جاری رہے گی۔

گھر کے چوہے کے نام۔

برخوردار نور چشم عزیزی چوہے !

جے بہاری بلی کی (جو کسی بچے کے ساتھ مہیاگ گئی ہے) اور بعد اس جے کے
میں تم سے ایک خانگی قسم کی شکایت کرتا جا رہا ہوں کہ میری بیوی کی تازہ ترسیں
اطلاع کے مطابق اب گھر میں پانچ چوہے آچے ہیں اور ان سمجھوں کو تم نے آکے ہو۔

دیکھو عزیز! میں تم کو پناہ پاؤں سمجھتا ہوں اور تم میرے گھر میں یوں رہ رہ کر ہو جیسے میری جائیداد پر تمہارا آبائی حق ہے۔ تم چینی کی پلیٹ توڑ دو، صابن کی ٹمبیہ اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دو، میز پریش کتر ڈالو، کتابیں کھا جاؤ، پھلوں سے ناشتہ کرو، مرغی سے ڈنر یا آلؤوں سے لंच میں نے کہیں اس کا برا نہیں مانا۔ بلکہ ہمیشہ یہ سوچ کر معاف کر دیا کہ اولاد نالائق ہو تو اسے گھر سے باہر نہیں نکال دیتے۔

مگر میری اس رواداری اور شفقت کا تم نے غلط مطلب نکال لیا اور تم میرا گھر برباد کرنے کے لئے چار مزید مشنڈے لے آئے ہو نتیجہ یہ کہ اب میرا خرچہ چار گنا بڑھ گیا ہے۔ اے تا خلعت! میں تمہیں تو اس لئے سبکدشت کر رہا تھا کہ ایک آدھ چورل گھر میں صندوق رہنا چاہئے۔ اس سے ذرا گھر کی رونق اور درائیں قائم رہتی ہے۔ گھر میں چور نہ ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی میں کوئی چیز کم ہے اور پھر تمہاری دھم سے مجھے ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ چور ہمارے گھر آنے سے گھبراتے تھے۔ کیونکہ رات کی گھبراہٹ میں جب بھارا گھر سو جاتا ہے تو تم فوراً بیدار ہو جاتے ہو اور گھر بھر میں اچھیل کود، کھر کھڑا دھڑکھڑا کر رہتے ہو۔ چور ان آوازوں کو سن کر اپنے پاؤں لوٹ جاتے ہیں کہ جب گھر میں ایک چور پہلے سے موجود ہے تو ہماری گنجائش کہاں ہے۔

لیکن اے بد بخت! تم نے اسے ہماری کمزوریوں پر محمول کیا جنہیں اتنی عقل نہیں آتی چراغ خانہ صرف اکھڑتا چورل ہوتا ہے، پانچ پانچ چورے نہیں ہوتے۔ پہلے سارے گھر پر صرف تمہاری مثالیں ملتی۔ لیکن اب جائیداد کے چار وارث اور پیدل ہو گئے ہیں تمہیں اتنا احمق نہیں سمجھتا تھا کہ اپنی سلطنت میں غیر ملکیوں کو دخل دینے کی اجازت دے دو گے۔ غرض کرو، کل کلاں یہ چاروں چورے گھر تمہیں ہی اس گھر سے بھاگادیں تو کہاں جاؤ گے نالائق۔

بہذا میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ اس خط کو تاؤ سمجھو اور ان چاروں غیر ملکیوں کو نکال دو۔ ورنہ تمہیں بھی پوریا بستر اٹھا کر چل دینا ہو گا۔ میں جلی کو مٹا کر پھرے آؤں گا۔ چرہے دان کا استعمال سنجیدگی سے شروع کر دوں گا۔ تمہیں صرف دو دن کی مہلت دی جاتی ہے۔ سنبھل جاؤ، ان چاروں چرہوں کو دھو کے سے پھسلا کر پڑوسی دشمنی رام کے گھر لے جاؤ۔ وہاں میرے گھر سے زیادہ پھل آتے ہیں۔ کیونکہ اس کا بہنوی ایک نفا نیدار ہے۔

نبال چند ڈاکے کے نام۔

نبال چند جی!

یہ تم نے کیا غضب کر دیا کہ کسی مس پر بھیا کی جپٹیں میرے گھر پھینک گئے، جیپ کھول کر پڑھا۔ (یہ میری بد اخلاقی تھی) تو وہ کجنت "لولیٹر" نکلا۔ لفظ براڈر میں نکسا تھا، فقیر چند کا۔ تم سمجھے یہ فکر تو سوی کا خط ہے۔ لفظ عطر کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ بھلے آدمی! نام سنیں پڑھا جانا تو کم از کم لفظ سونگے ہی لینے کہ یہ خط فکر تو سوی کا نہیں ہو سکتا۔ تمہاری معلومات میں اضافے کے لئے یہ عرض کر دوں کہ فکر تو سوی کا نام الفٹ نہیں لگتا، اسے تو ماتمی خط ملتے ہیں یا قرص خراہوں کے۔ یہ حرکت کہ تم نے صرف مس پر بھیا اور فقیر چند کے عشق ہی کو رسوا نہیں کیا، محکمہ ڈاک و تار کو بھی رسوا کر دیا۔

اور نبال چند، اس ایسے کا ایک اور پہلو بھی ہے کہ اگر مس پر بھیا کا خط میرے پاس پہنچ گیا ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ میرا کوئی خط تم مس پر بھیا کو دے آئے ہو۔ یا اس نے سبھا رفیق چند کو دے آئے ہو۔ اور ہو سکتا ہے وہ میری بیوی کا خط ہو۔ جو مجھے طلاق کی دھمکی دے کر میرے چلی گئی تھی۔ میں اس کی گالیوں بھرے خط کا انتظار کر رہا ہوں

اب وہ گایاں میرے بجائے فقیر چند کو مل گئی ہوں گی۔ بچنے والے فقیر چند اب میرے بارے میں کیا سوچنا ہو گا۔ اس کے دل میں میری جو عظمت ہو گی وہ خاک میں مل چکی ہو گی،

میرے ظالم نہال چند اتنے بے سب کچھ بنڈل کر دیا۔ مس پر بھیا فقیر چند، فکر تو نسوی سب کے راز فاش کر دیے۔ اے اندھے! اپنی عینک کا نمبر کیوں نہیں ٹھیک کرا لیتے؟

مس پر بھیا کا "لوٹیر" ابھی تک میرے پاس ہے۔ میرے لئے وہ بیگار کا فیچر کسے لئے اکیر ہے تاہم محراب نہ ملنے پر نہ جانے اس بچارے پر کیا سمیت رہی ہو گی کل بے اختیار میرا جی جا رہا تھا صدی کر یہ خط فقیر چند کو دے آؤں۔ لیکن عقل نے سمجھایا اس سے عاشق کی رسوائی ہو گی۔ خواہ مخواہ نام نہاد ہو جائے گا۔ میں ذاتی طور پر عشق کی رسوائی کا قائل نہیں ہوں۔

اس لئے نہال چند! یہ تمہارا اخلاقی فرض ہے کہ مجھ سے وہ خط لے جاؤ اور فقیر چند کے حوالے کر آؤ اور ہاں، یہ بات نوٹ کر لو کہ اگر آئندہ مس پر بھیا کا کوئی خط تم نے میرے گھر دیا تو میں اس کی اطلاع مس پر بھیا اور انسپکٹر جنرل ڈاکخانہ جات دونوں کو دے دوں گا۔

پا چھی غنڈے کے نام۔

کل سٹیٹ لٹریچر چندھی (بلدی کی فنوک اور پرچون والے) قبکایت کر رہے تھے کہ پا چھی مجھ سے خفا ہو گیا ہے۔ حالانکہ میں اس پر نو آئڈا ایک لاکھ روپیہ صرف کر چکا ہوں۔ لیکن اب وہ مجھے چھوڑ کر سٹیٹ گورنر چندھی (کھدریشم رنگ والے) کا غنڈہ بن گیا ہے۔ بالوں بالوں میں انہوں نے اشارہ دیا۔ کتاب دہ کسی اور غنڈے

کی تلاش میں ہیں۔ جوان کی جان و مال کی حفاظت کر سکے اور پانچویں کو بھی سرِ باندہ لڑکائی کا مزا چکھ سکیں۔

پانچویں دادا! میں نہ تو مڑ چند ہوں نہ گڑ چند۔ اس لئے مجھے تم سے شکایت نہیں ہے۔ لیکن ایک نکتہ تم پر ضرور واضح کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے اچھا سٹیج بدل کر غلطی کی۔ اس سے تمہارے کردار پر ناحق ایک دھبہ آگیا۔ لو مڑ چند ہو یا گڑ چند تمہارے لئے دونوں برابر ہیں۔ دونوں ایک ہی غزل کے دو تانے ہیں۔ تمہیں تو خدمت کرنا ہے۔ کسی کی کرلو۔ دونوں کے لئے تم بازو کی جنس ہو۔ ایک قزوین جنس نہیں ان میں سے کوئی بھی خرید لے تمہیں اس سے کیا۔ ہاں مگر پانچویں!۔۔۔ خنڈے کے کردار کی بلندی یہ ہے کہ وہ ایک بار جسے مالک کہہ دے اسی کا وفادار بن کر رہے۔ تم ذرا سوچو، کتنے تک اچھا مالک نہیں بدلتے اور تم تو انسان ہو۔ اور پھر یہ بھی تو نہیں کہ گڑ چند کے پاس جا کر تم کوئی ایسی شئی اورا چھپو تو خنڈ انجام دو گے جو لو مڑ چند کے ہاں انجام نہیں دیتے تھے۔ ؛ نہیں پانچویں دادا! تمہارا کام ہر جگہ ایک جیا رہتا ہے۔ یعنی جیب میں چھپا رکھنا، سٹیج کے مخالفوں کو ڈرانا دھمکانا، مالک کی تاباں کرنا اور نازیبا حرکتوں پر اپنی قوت اور شوکت کا پردہ ڈالنا اور موقع ملے تو ایک اوجھ مخالف کا سر اتار کر گڑے تالے میں پھینک دینا تمہیں یاد ہوگا کہ ایک بار سٹیج لو مڑ چند کے ایکشن حملے میں تم نے سٹیج گڑ چند کے مٹن چارماٹیتوں کے دانت توڑ ڈالے تھے۔ اب تم اسی سٹیج گڑ چند کے خنڈے بن کر لو مڑ چند کے حمایتیوں کے دانت توڑ دو گے۔ تمہارے بنیادی رد میں کیا فرق پڑا پانچویں! ذرا سوچو ذرا سوچو۔ اس میں لو مڑ چند یا گڑ چند کی رسوائی نہیں، تمہاری رسوائی ہے۔ آئے دے مورخ تمہارے بارے میں کیا لکھیں گے کہ پانچویں نے چند ٹکوں کی خاطر خنڈ نسل کا ایمان بیچ دیا۔

اس لئے میری مائے قریب آؤ۔ لوٹ آؤ سٹیج لوٹ چند کے پاس لوٹ آؤ مگر لوٹ چند کا وزن بھی مع توند ایک کو ٹنٹل ہے اور گوڑ چند کا وزن بھی مع توند ایک کو ٹنٹل ہی ہے۔

پڑوسی منگل چند کے نام

پیارے منگل چند جی

تم سے ایک بات کہوں براؤ نہیں مانو گے ؟

تم ہر روز میرے ہاں تشریف لے آتے ہو اور میری میزبانی کے اخلاق سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو۔ ناجائز فائدوں کی ایک مختصر سی فہرست ملاحظہ فرماؤ۔
(۱) میرے سگریٹ پھونک جاتے ہو کبھی کبھی الیش ٹرے بھی میز پر پلٹ دیتے ہو
(۲) میرے رسالے اور کتابیں اٹھا کر لے جاتے ہو اور اول تو لوٹتے نہیں اور اگر لوٹاتے بھی ہو تو زخمی حالت میں۔
(۳) تم چائے کا مطالبہ کرتے ہو اور وہ بھی دودھ اور چینی کی۔ اس منہ گان کے زمانے میں۔

(۴) اپنی وقت گزاری کے لئے تم میرا قیمتی وقت برباد کر جاتے ہو۔
وہاں تم دنیا کی بے ایمانیوں کا روتا روٹتے ہو۔ جو میرے لئے کوئی نیا انکشاف نہیں ہے۔

(۵) کبھی کبھی مجھ سے ادعا بھی مانگ لیتے ہو جو ہمیشہ ادعا رہی رہتا ہے۔
یہ خط جمعیتیں اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میں زبان کا بزدل اور تحریک کا شیرازنگ ہوں۔ شاید میرے اس خط کی تحریر سے تم مستقبل جاؤ اور آئندہ ان حرکتوں سے باز آ جاؤ اور اگر تم واقعی برامان گئے تو بھئی ! بے شک آج یا کرو میں تمہاری خاطر

اپنا اخلاق ترک کر دوں گا۔ اطمینان رکھو۔

گھائل نامراد آبادی کے نام۔

قبلہ گھائل صاحب!

میں نے اکثر آپ کا کلام سنا ہے۔ پڑھا یا نکل نہیں۔ کیونکہ آپ کا کلام پڑھنے کے قابل نہیں صرف سننے کے قابل ہے۔ خدا نے آپ کو گلا نہیں جلتنگ عطا کیا۔ اگر شاعر کی بجائے قوال بن جاتے تو زیادہ نچر رہتے۔ اس سے جہاں شاعری آپ کی دستبرد سے محفوظ رہتی، وہاں قوالوں کے قبیلے کی ساکھ اور تعداد بھی بڑھ جاتی۔ اے آپ کے شعر کہتے بے معنی ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کا گلا کتنا معنی خیز ہوتا ہے آپ کا گلا نہیں ہے ڈک شری ہے۔

کل ایک اور شاعر نے آپ کی تدلیل کرنے کی خاطر مجھے بتایا کہ آپ دراصل خود شاعری نہیں کرتے بلکہ دوسروں سے لکھواتے ہیں۔ یہ تو انتہائی ناشائستگی ہے۔ گھائل صاحب! کبھی کبھی خود بھی شعر لکھا کیجئے۔ جب بے معنی شعر ہی لکھتا ہیں تو خود لکھنے میں کیا حرج ہے؟ کو شمش کر کے دیکھیے تو ہنس میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آپ اس سے بھی زیادہ بے معنی شعر لکھ سکتے ہیں۔ تخلیق چاہے کسی بھی ہر اپنی ہوتی چاہئے۔

اور ہاں، وہ جو آپ کی ایک کلاسیکل اچکن ہے، اسے اب بدل نہیں ڈالے۔ وہ بھی اب آپ کے اشعار کی طرح بے معنی ہو چکی۔ (افواہ ہے کہ آپ کے پردادا جناب قاتل نامراد آبادی نے بھی یہی اچکن پہن کر شہنشاہ جارج پنجم کے دربار ڈیلی میں تصدیق پڑھنے کے لئے رنیم تن فرمائی تھی۔ لیکن قبلہ گھائل! اب تو شہنشاہی دور ختم ہو گیا ہے۔ ڈیموکریسی آگئی ہے۔ کوئی ڈیموکریٹک اچکن پہنا کیجئے شاعری

وہی اچکن تو اچھی ہوتی چاہیے۔

شری باگڑ بلا سنگھ کے نام ڈیر باگڑ بلا جی

یہ معلوم کر کے کہ آپ ممبر اسمبلی بن گئے ہیں۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ جہاں تک مجھے یاد دہاتا ہے آپ میٹرک میں فیل ہوئے تھے تو اشتعال میں اگر ہندوستان ہی سے ہجرت کر گئے تھے اور خایدا فریقہ میں بیزاری کی دکان کرتے رہے اور پھر جب آپ کے پاس دس پندرہ لاکھ روپے جمع ہو گئے تو ہندوستان سے انتقام لینے کے لئے وطن لوٹ آ گئے۔ سچ منج آپ نے ممبر اسمبلی بن کر اپنے میٹرک فیل ہونے کا خوب انتقام لیا۔ یہ ساری خطا یو یورسٹی کی تھی۔ کاش! وہ آپ کو میٹرک پاس ہونے کا میٹرک ٹکٹ دے دیتی تو آج سہاری ڈیمو کریسی کا چشتر نہ ہوتا جو آپ کے ہاتھوں ہوا۔

ساتھ آپ نے اپنے الیکشن پر ایک لاکھ روپیہ خرچ کر ڈالا۔ بظاہر یہ کافی گھٹیا حرکت معلوم ہوتی ہے لیکن جس کے پاس پندرہ لاکھ روپیہ ہوں اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ اہل ثروت کی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ لیکن ڈیر باگڑ بلا مجھ جو چیز معیوب محسوس ہوئی وہ یہ نہیں کہ آپ ممبر اسمبلی کیوں بن گئے بلکہ یہ کہ آپ کے تین نقش کافی بے بندھے ہیں۔ حسن ذہن نہ ہیں حسن جسم ہی ہوتا تو ممبر اسمبلی بننے میں کوئی خاص ہرج نہیں تھا۔ مثال کے طور پر اپنی آنکھوں کو لیجئے۔ آپ کی کل ملا کر ڈیرہ آٹھ ہے۔ کم از کم دو آنکھیں تو سالم ہوتی۔ چاہئیں۔ آپ کی تاک اگر پوری ہو تو آلو کا پکڑا معلوم ہوتی ہے۔ کاش! آپ پلاسٹک سرجری سے اس کی نراسخ خراسن کرا لیتے تو آپ مخالفت امید دار کی ضمانت ضبط کر دے سکتے تھے اور جہاں اس پکڑنے چہرے پر آپ کی ادٹ اور کچھ پانگ دالھی؟ ہمارے رے ۱۰ سے

دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مناسب غذا نہ ملنے سے دھڑکی چمچ گئی ہے اور کچھ بے سنگ جمیاٹیاں ادھر ادھر سے اگ آئی ہیں اور جناب یا گڑبلا صاحب! میں آپ کی توند کے متعلق کوئی تشبیہ پیش نہ کروں گا کیونکہ وہ تشبیہات کی حد سے بہت آگے نکل گئی ہے معاف کیجئے، میں یہ نہیں کہتا کہ آپ پر صنعت ثانی یا گڑبلا گارہ کیوں نہ ہوئے؟ یا سنت کے لئے بدن کا حسن نہیں، دماغ کا حسن چاہئے لیکن آہ آپ کو تو وہ بھی میسر نہیں، اچھا تیار ذرا، اہلی موریہ کون تھا اور اس نے شادی کیوں نہیں کی تھی؟

میرے اتفاقاً کا براعت ماننا۔ مجھے دراصل ابھی ابھی نئی پر سخت غصہ کیا تھا۔ کیونکہ وہ ہمارا دودھ پی گئی اور میں اپنا غصہ کسی نہ کسی پر نکالنا چاہتا تھا، نلی سے مجھے بے کا خیال آگیا اور پھر یا گڑبلا کے کا اور یوں یہ غصہ بلا خط آپ کو لکھ ڈالا۔ ورنہ پیار سے اہلیاں تو دودھ پی ہی جاتی ہیں۔ ہم ان کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟

آپ اس خط کو پڑھ کر رومی کی ٹوکری میں پھینک دیجئے۔ اپنے ربکا رٹھ میں محفوظ رکھ کر لیجئے۔ ورنہ کہنے والی نسلیں بڑھی دکھی ہوں گی کہ ہمارے اکاؤنڈ اعداد کو کیسے خط لکھ جاتے تھے۔

بالو بدری لال کے نام

۱۷ لورڈ ڈیرن کلرک

میں ہر روز دیکھتا ہوں کہ تم اپنی چھپت پر کھڑے ہو کر ایک لڑکی کو اشارے کرتے رہتے ہو۔ سچ بچ بتاؤ، کیا تمہیں اس سے عشق ہو گیا ہے؟

دیکھو بیٹا! عشق میری بلا ہے، اس سے گھر برباد ہو جاتا ہے اور تمہارے پاس تو ابھی گھر بھی نہیں ہے۔ کرائے کی ایک ذلیل سی کوٹری میں رہتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ

تم اپنی دوسروں کی تنخواہ میں گھر کے پانچ افراد کو پالتے ہو۔ تنہا ہی بائیکل کی ٹیوب پر چدرہ بچکر گئے ہوئے ہیں۔ تمہارے جوتے سفینوں پالش سے محروم رہتے ہیں پرسوں تم نے اپنی چھوٹی ماہیں کوڈنڈے سے پٹا تھا۔ کیونکہ وہ بغیر فیس کے سکول جانے سے انکار کر رہی تھی۔ شیو کا بیڈ تم اکثر پڑوسی سے مانگتے دیکھ گئے ہو وغیرہ وغیرہ یعنی تم انسان مفلوڑے ہو، صرف وغیرہ وغیرہ ہو۔

ایسے عالم افلاس میں اے بدری لال! تمہیں عشق کی سوچ بھی ہے۔ اے عشق کی بجائے بائیکل کی نئی ٹیوب ہی خرید لیتے یا کسی سٹیڈ گوجر چند کے گھر پیدا ہوتے۔ پندرہ بچروں کے ساتھ محبوبہ کے لب درخسار کی باتیں کرتے ہو، شرم نہیں آتی! اس لڑکی کا کیا ہے اس پر تو شباب ٹوٹ پڑا ہے۔ جس نے اسے مضطرب کر رکھا ہے اور وہ کسی نہ کسی کے گھر کو برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس نے میری مائتو تو ماہیں عشق کو ملنوی کر دو۔ میں تو کہتا ہوں بھر بھر کے لئے ملنوی کر دو اور مفلوڑے سے روپے جمع کر کے شادی کر لو۔ کلک کا کام شادی کرتا ہے عشق کرتا نہیں۔ عشق کے کاغذ پر ٹاپ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ ٹاپ کرنے کے لئے دفتر کی چھٹیاں ہی مزدور ہیں۔ اپنی زندگی کی ٹاپ مشین پر "لو ایٹر" ٹاپ مت کیا کرو کیونکہ تمہاری مشین کی کو الٹی کچھا چھیں نہیں ہے۔ اپنی مشین کی طرف دیکھو، لڑکی کے قبسم کی طرف مت دیکھو۔

میں اس لڑکی کو بھی سمجھا دوں گا کہ وہ بھی تم پر رحم کرے اور اپنے شباب کا رخ کسی اور طرف موڑ دے۔

دلی چند جی کے نام
دلی چند!

معاف کرنا، تم انتہائی برا آدمی ہو اور سچائے کس ستم گر نے۔ تمہیں میرے

گھر کا ایڈریس دے دیا اور کہہ دیا کہ فکر تو منوی کو بڑھاتا ایک ہیٹ بڑا کارڈ اب تم
 تم بیٹھے میں دو تین بار لے لے رہا ہوں میرے درشن "کرنے کے لئے ضرور آجاتے ہو
 ایک خاندانی لفظ کی وجہ سے مجھ میں شرافت نفس بدرجہ اتم موجود ہے لیکن اس کا
 یہ مطلب نہیں کہ تم میری شرافت کے سینے پر پھاڑیں کر بار بار گرتے رہو۔ کاش! تمہیں
 معلوم ہوتا کہ تم میرے پاس آکر جو گفتگو کرتے ہو اس کا کوئی مطلب اور مفہوم نہیں
 ہوتا۔ تم آلوگوں کے رشتہ سے لے کر ہندوستان کی اخلاقی گراؤٹ سے ہوتے
 ہوئے عرب کی کھجوروں تک کا ذکر کر ڈالتے ہو اور پھر ان میں سے ہر ایک چیز پر
 اپنی بیش قیمت رائے بھی ضرور دیتے ہو اور پھر اے عالم! یہ تقاضا بھی کرتے ہو
 کہ میں بھی تمہاری ہاں میں ہاں ملاؤں اور میں ملا دیتا ہوں، یہ صرف میری شرافت
 عرف بزدلی ہے دعوہ کے میں منت رہتا

ہائے! اب میں تمہیں کس منہ سے کہوں کہ مجھے آلو کے رشتہ اور عرب کی کھجوروں
 سے کوئی دلچسپی نہیں اگر آلو میں گھونگے ہوتے جا رہے ہیں تو اس کے خلاف اخبار میں ایک
 شکایتی خط لکھ دیا کرو۔ مگر خدا کے لئے مجھے روزانہ اخبار مت سمجھو اور باقی رہی عزت
 کی کھجور تو عرض یہ ہے کہ تم میرے گھر آنے کی بجائے عراقی عرب کیوں نہیں چلے جاتے
 وہاں مزے سے جا کر کھجوریں کھاؤ۔ میں تمہارے خلاف کسی غنائے میں رلیڈٹ نہیں
 کروں گا کہ یہ شخص کھجوریں کھاتا ہے اسے گرفتار کر لو۔ ایک گزارش اور بھی ہے کہ تم
 مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش ترک کر دو۔ یہ کوشش بیکار جا رہی ہے۔ یعنی تم
 میرے سگریٹ نوش فرماتے رہتے ہو، چائے کا مطالبہ کرتے ہو اور کل تو تم نے یہ
 مطالبہ بھی کر دیا کہ پینے منگواؤ، چائے کے ساتھ بڑا لطافت دیتا ہے۔ تم میری کتابیں
 اور رسالے اٹھا کر لے جاتے ہو اور اول تو لوٹاتے نہیں اور اگر لوٹاتے بھی ہوتو یوں
 جیسے پورٹ مارٹ کے لئے کوئی کس کی لاش حوالے کر رہا ہو۔

۱۔ میرے نصیب جگہ میری بد نصیبی! مجھ پر ترس کھاؤ میرے غریب خاں۔
 پر تشریف ضرور لاؤ لیکن یوں آؤ جیسے ہوا کا جھوکا آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ میرے
 پڑوس میں ایک اور صاحب مشر جانندی رام رہتے ہیں۔ تم مجھ سے گزر کر اس کے
 گھر چلے جایا کرو۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے گزرا رہا ہے۔ اپنا مفصلہ حیات
 پر راکر چکا ہے۔ اگر تم اسے بزرگ کرنا شروع کر دو تو اس پر کوئی اچھا یا برا اثر نہیں
 پڑے گا اور تنہا راکام بھی بن جائے گا۔
 جانندی رام تنہا را منتظر ہے۔

بلی کے نام

جھوٹے بڑے سب کی موسیٰ
 یہ خط نہیں مشری رنگبیر داس کے گھر کہتے پر بھیج رہا ہوں کیونکہ سنا ہے، غ
 کرنے کے بعد جب تم کوئی تکفین اور اور ایک کلید سونا سمگل کر کے ساتھ لائی تمہیں تو
 رنگبیر داس تمہیں پہلا مہیلا کرا اپنے گھر لے گیا تھا۔
 دیکھو بی بلی! تمہیں یہ معلوم کر کے بہت مسرت ہوگی کہ ہمارے گھر میں ایک بہت
 موٹا تازہ چہرہ رہا ہے۔ اس کی قریبی کا سبب ہمارے بے بسی اور اس کی دھٹائی
 ہے۔ اس کے پیٹ میں نہ جانے کتنے انواع و اقسام کے کھانے پہنچ چکے ہیں۔ مچل
 کیا، گوشت، ممکن، ادودھ ملانی، پلاؤ، بادام، گھی، ڈبل روٹیاں۔ کیا کیا
 گزرا انہی موسیٰ! جو چیز ملنے لگتی ہے۔ چٹ کر جاتا ہے۔ ہم تو اس حرام خور کو یوں
 پال پوس رہے ہیں جیسے وہ ہمارا داماد ہو! اور کل رات تو بقل میری اہلیہ
 محترمہ کے وہ دھسکی کی بوتل کے اور گرد بھی گھوم رہا تھا۔ یعنی وہ بادہ خواری پر بھی
 اترا آیا ہے۔

حز مر اہم اس جو چھ سے نالاں ہیں۔ کیونکہ ایک نوعہ چوہے دان کی گرفت میں نہیں آتا۔ بے حد ڈپلومیٹ ہو گیا ہے اور دوسرے کھا کھا کر سپینگر ٹی باز بھی ہو گیا ہے۔ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔ انتہائی بد تمیز بن گیا ہے جیسے کہ حرام کا مال کھا کھا کر ہو جاتا ہے اور کل کو اس نے حماقت کی حد کر دی کہ دیوانہ غالب کو کتر کتر کے اس کے پرزے پرزے کر ڈالے۔ یعنی وہ اب ناشوروں کی طرح شعرو ادب کا بھی دشمن بن گیا ہے۔ ذرا سوچو غالب سے اسے کیا دشمنی؟

اس نے موسیٰ! میں غالب کے نام پر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تمہارے گھروٹ آؤ۔ ہمارے تمہارے تعلقات کافی پرانے ہیں۔ ان تعلقات کے واسطے تمہیں آجائے میں تسلیم کرتا ہوں کہ تمہارے گھروٹوں نے تمہیں کافی ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچائی تھی۔ کیونکہ تم ایک بکے کو بھی تمہارے گھر لے آئیں۔ اور اس کے ساتھ رنگ رلیاں منایا کرتی تھیں، ہم نے اسے برا سمجھا کیونکہ تم عشق میں اندھ سی ہو کر چوہے پکڑنا بھول گئی تھیں، ہم تمہیں پینے کے لئے جو درد دہ دیتے تم چوری چھپے اس لفٹ کے پلاؤتین ہم نے تمہیں کئی بار سمجھایا کہ یہ مناسب نہیں ہے کہ

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والے کو بھی چاہوں

مرا دل پھر دو مجھ سے یہ سودا ہو نہیں سکتا

مگر تم بے حد جذباتی ہو گئیں اور اسی سوال پر ہم میں شکر رنجی ہو گئی اور کہ دن میرے بیٹے نے اس غنڈے بکے کو ڈنڈا مارا اور تم نے بطور احتجاج میرے بیٹے کو اپنے پنجے سے لہو لہان کر دیا اور پھر تم ناراض ہو کر سبھاگ گئیں۔ (اور جھگڑ گئیں) لیکن موسیٰ! اب میں سمجھتا ہوں کہ عشق ایک ازلی سچائی ہے اور تمہارے عشق میں تمہاری مزاحمت غلط تھی۔ تم ہمیں معاف کر دو اور لوٹ آؤ۔ وہ موٹا چوہہ اور ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور اگر اس بکے سے تمہارا عشق اب بھی چل رہا ہو

اے بھی ہمراہ لے آؤ۔ کم از کم اس حرام خورچہ کے مقابلے پر تودہ غائبتر ہے کہ وہ عاشق ہے۔ چور تو نہیں ہے۔

طلوے کے نام۔

مشرشیں!

میرا خط پا کر محفیں تعجب تو ضرور ہو گا کہ زبان نہ پہچان، لیکن فکر تو سنو می نے مجھے خط کیوں لکھ ڈالا؟ لیکن پیارے! میں سماجی بیہودی کا عادی ہوں اور تم سماج میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہو اس لئے تم سے صرف چند استغاثات کرنا چاہتا ہوں تاکہ معلوم کر سکوں کہ انسانوں کے ساتھ تمہارے تعلقات کی صحیح صحیح عینیت کیا ہے؟

مثلاً کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم شنگل کے ایک ادارہ بچھی ہو تم جہاں جا ہو جا سکتے ہو جو کھانا جا ہو کھا سکتے ہو۔ درختوں کے پھل تمہاری "ڈسپوزل" پر رہتے ہیں۔ تم کتر کتر ان کا استیانتا کر سکتے ہو۔ مگر اس آزادی کے باوجود تم نے انسان کی غلامی کیوں قبول کر لی، کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارا صرف خارجی ڈیمانچے آزاد ہو۔ تمہاری ذات غلامانہ ہو۔ (اس دو غلطے میں پرہیز ستم آئی چاہئے)

اور پھر تمہارے اندر یہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ انسانوں کی آواز کی ہو ہو نقل کر لیتے ہو۔ یعنی تم نقل نویسی ہو، اور بحیل نہیں ہو۔ تمہارے پاس اچانکچہ نہیں ہے جو کچھ ہے مانگے کا ہے۔ تم صرف انسانی آواز کا بھونڈا چرب ہو۔ کیا یہ صورت حالات تمہیں پسند ہے؟ کیا نقل نویسی کی زندگی تمہارے فخر کر سکتے ہو؟ دوسروں کے سہارے زندہ رہنا اگرچہ جہالت تو نہیں ہے۔ لیکن غیرت مندی بھی نہیں ہے۔ اس لئے پیار اور بحیل بننے کی کوشش کرو۔ کیا سچ مچ خدا نے محفیں وہ ذہن عطا نہیں کیا جو خود

سوچتا ہے، خود عمل کرتا ہے۔

اور پھر مٹا ہے تم بے وقاف بھی ہو۔ جہاں تک بتغییں پہنچا کھلاتا ہے، تم اس سے آنکھیں پھیر لیتے ہو۔ ورا سوچو، یہ کوئی مشرفاء کا کام ہے، جذب طریقہ تو یہی ہے کہ جس کا کھلاؤ اسی کا گھاؤ۔ یہ نہیں کہ کھاؤ تو کسی کا، لیکن گن کسی کے بھی نہ گھاؤ۔ بلکہ موقع ملے تو پھر سے نکل کر گس اور کے گھر بھاگ جاؤ۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہاری آنکھ کا پانی کیوں مڑ گیا؟ یا اس میں ازل ہی سے پانی نہیں تھا اور کیا کبھی ستہار اندر حیا پیدا ہونے کے امکانات بھی ہیں یا بالکل "ہو پ لیس کس" ہو۔

میرے ان استفسارات کے جواب میں صرف ٹیں ٹیں نہ کرنا، مدلل جواب دینا۔

کرسی کے نام

۱۔ نامراد حسینہ !

جب سے تم غریب خانے پر آئی ہے، میرا کردار دیگر گوں ہو گیا ہے۔ بالکل ایسے جیسے کسی ان پڑھ کے ہاتھ میں پارکر کا سنہری قلم تھا دیا جائے اور وہ کہے "میں تو اب ناول نگار ہوں اور میرے ناول پڑھ کر لوگ ڈکنس کو بھول جائیں گے۔"

جب میں بتغییں خرید کر دنیام گھر سے گھر لایا تھا تو صرف اس لئے کہ تم سستے بھاؤ مل رہی تھیں، عزت اور عظمت اگر سستے بھاؤ مل جائے تو کون چھوڑتا ہے۔ لیکن گھر لایا۔ تو میرے بچے ایک دوسرے سے دھینکا مشنی کرنے لگے۔ ہر ایک کہتا تھا کہ کرسی پر بیٹھوں گا، چنانچہ اس سول داریں دد بر خور داریں کی قیصیں بھٹ گئیں، جیڑی چھڑانے کے لئے آئی تو اس کے ماتھے پر ہانکی کا پلا پڑا اور مسم پٹی کا بل ادا کرنے کے لئے خون بہہ نکلا۔

ثابت ہوا کہ عزت اور عظمت بھی ایک طرح کی سیلام میں خریدی ہوئی کرسی ہے

جڑ پھٹی ہوئی قمیصوں اور مانتوں کے لہو کے بدلے میں خریدی جاتی ہے، تم بے تاریخ عالم میں گرد و زور اور بے قیصیں بچاڑی ہیں، بیواؤں اور یتیموں کو جہنم دیا ہے، اہل گناہ کھیتوں میں زہریلی گئیوں سے آبیاری کی ہے، کئی نسلیں، کئی ہندو یہیں صرف تمہارے نام پر ہمارے گئیوں، لیکن اس کے باوجود اے حسین و جمیل ستم گر! تمہاری کشتی ختم نہ ہوئی اور تم بدستور عظمت اور عزت کی دریا علامت بنی رہیں۔ (شیم شیم! تم پر نہیں کرسی پرستوں پر)

تمہارے آنے سے پہلے میں ایک شریف انسان تھا۔ مگر آہ! میں شاید اپنے آباؤ اجداد کا آخری شریف انسان ثابت ہوا۔ تم نے میری شرافت کو بھی لہذا بے وقار سمجھ کر نگلیا۔ کہونکہ جتنی پہلی بار میں تم پر بیٹھا، مجھے یوں محسوس ہوئے۔ لگا جیسے مجھے کسی کی جیب کا ٹٹنی چاہئے، کسی کو گالیاں دینی چاہیں، کسی کو چابک مارتا چاہیں اور کچھ نہیں تو اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چاٹے کا پیالہ نیچے گرا کر توڑ دینا چاہئے اور طیش میں آکر نوکر کو آواز دینا چاہئے۔ "اے حرامی! یہ کپ کیوں توڑ دیا باپ کی جاگیر سمجھا تھا کیا؟"

ہر روز جب ایسے ہیپ اور وحشیانہ خیالات ذہن میں آنے لگے تو تمہیں یاد ہوگا، میں دبیری کی آنکھ بچا کر تمہیں باہر گلی میں پھینک آیا تھا، شام کو گھر لوٹا تو تم پھر گھر میں براجمان تھیں اور ہماری دبیری صاحبہ تم پر جلوس فرماتیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔ "دیکھا آپ کا پڑوسی وہ جو گندرمشا بڑا دھرماتا بنا پھرتا ہے آج سہاری کرسی ہی چرا کرے جا رہا تھا۔ میری نظر لگی تو میں نے اسے وہ عملی کئی ستائیں کر اب کم از کم چھ مہینے ہم سے بات نہیں کرے گا۔"

اے بدتمیز! دیکھتے تم نے اپنے لٹھیں! میری دبیری بالکل گنہگار تھی تم پر بیٹھ کر چلتا بن گئی۔ جو گندرمشا ہمارا ٹیک پڑوسی تھا اس کی دھوئی کسی کانٹے سے

حک جائے تو وہ کاشٹے سے بھی مانی مانگ لیتا تھا۔ لیکن ہم تم دونوں پڑوسیوں کے درمیان آئیں تو چھ ماہ کے لئے بہاری بول چال بند کرادی۔ وہ مجھ سے کچھ کتابیں مانگ کر لے گیا تھا اب وہ نہیں لوٹائے گا۔ پیاری تازنین! یہ تم نے کیا غضب کیا۔ دو اچھے پڑوسیوں میں ہی جھگڑش کرادی کیا یہی تمہارا خاندانی پیشہ ہے، کہ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی خاطر پڑوسیوں کے درمیان کالی لکیر کھینچ دو، دوستوں کو بھڑا دو بھجائی بہنوں کے لباس تازنار کرادو، مذہبوں، قوموں اور ملکوں کے درمیان رخنے ڈال کر صدیوں تک احمقیاں ملنے نہ دو۔ ایک بار پھر شیم شیم! تم پر بھی اہم پڑھی محترمہ! اب میں بے حد پریشان ہوں کہ تم سے کیسے نجات حاصل کروں میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا چاہتا ہوں۔ لیکن مزہبوی مانتی ہے نہ بچے اور خدا جمہور نہ بلوائے تو تم میں ہی چاہتا ہوں۔ کیونکہ محلے والے رشتہ دار اور احباب سبھی تمہیں دیکھ کر کہنے ہیں۔ فکر تو نسوی عزت دار آدمی ہے۔ کیونکہ اس کے پاس کرسی ہے۔

کبھی کبھی رات کی انتہاء تاریکیوں کو چیر کر میں ایک دم خواب کے چرنک اٹھتا ہوں اور یوں لگتا ہے جیسے تمہیں کوئی چور اٹھا کر لے گیا ہے۔ لیکن آہ! صبح تم پھر موجود ہوئی ہو تم چوروں سے تھوڑے ڈرتی ہو۔ تم تو خود چوروں کی محافظ ہو۔ ! -

سمو نے کی ڈلی کے نام

۱۔ سنہرے دس کی شہزادی

نہ جانے تم کہاں ہو، میں نے کئی بار تمہیں پیغام بھیجے تار بھیجے، ٹیلیفون بھی کیا۔ لیکن خدا کی طرح تمہارا کبھی نہیں پتہ نہ ملا۔ ہاں کیا اچھا زمانہ تھا،

جب لوگ سڑکوں پر سونے کی ڈلیاں اچھال دیتے تھے اور کوئی اکٹھا نہیں تھا اور اس زمانے میں نم کبھی کبھی مجھے نظر آ جاتا کرتی تھیں۔ لیکن اب تو ایسا زمانہ آئی گا ہے کہ سونے کی ڈلی چھوڑ، خالی ماحس تک سڑکوں پر پھینکو تو لوگ اکٹھا لینے ہیں کہ اس سے بچتے ہی کھیلے گے۔

کبھی کبھی جب خبر آتی ہے کہ فلاں سمگلر کے ہاں سونے کی ڈلیاں پڑی گئیں تو دل بلیوں اچھلنے لگا ہے۔ اور ایک ہو کہ سی اکٹھتی ہے کہ کاش میں بھی سمگلر ہوتا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تمہیں زمین میں دبا کر رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے گھر کی ساری زمین کھود ڈالی۔ لیکن اس کے اندر سے لوہے کے ذیل سے دو چار ٹکڑے ہی نکلے۔ پھر کسی نے اطلاع دی کہ محلے کے ناچر سٹیٹ وٹری لال جی کی آسنی تجوری میں نم لے بود و باش اختیار کر رکھی ہے۔ چنانچہ ہمیں چراغے کی نیت سے پیچھا کر تجوری کے ساتھ ایک بل ڈاگ بندھا ہوا تھا۔ لہذا لوٹ آیا۔ کتے سے کون جھگڑا کرے۔ یہ کوئی تہذیب کی زبان بھوڑے سمجھتے ہیں۔ لیکن اس باعث پر بڑا تعجب ہوا کہ کتوں سے تم نے تعلقات کیوں کرے بنا رکھے ہیں کیا انسان برے تھے؟

ایک بار پتہ چلا کہ تم بنک کے لاکر میں پڑی ہو۔ میں نے بنک منیجر سے التجا کی کہ لاکر کھول کر مجھے اس منبری شہزادی کے دسترس کرا دیجئے۔ پہلے تو اس نے یہاں تراشے کہ لاکر کی چابی اس کی مالکن شرمستی بیبا بچیاں دیوی جی کے پاس ہے۔ پھر کہنے لگے کہ مالکن کے علاوہ کسی اجنبی کو سونے کی ڈلی دکھانا بہارے بنک کے قواعد کے خلاف ہے۔ میں نے کہا۔ اتنی حسین شہزادی کو قواعد کی زنجیروں میں کیوں جکڑ رکھا ہے۔ قواعد تو انسانوں کے لئے ہوتے ہیں مگر یہ تو بے جان چیز ہے۔ میرے اس اصرار اور دلیل بازی کو بنک منیجر نے غلط رنگ میں لیا اور مجھے ڈاکوؤں کے گردو کا

جواب۔ جواب میں ایک لطیفہ عرض ہے۔

ایک نوجوان نے دوسرے سے کہا: چلو دوست آج ایک فلم دیکھ آئیں؟ وہ بولا: نہیں دوست! میں نے ڈیڈی سے نہیں پوچھا۔ پہلے نوجوان نے کہا: یار! تم نے ڈیڈی کو بہت لعنت دے رکھی ہے۔ سوال: میں نے اپنا نام فکر تو نسوی رکھ لیا ہے۔ مجھے تو یہ نام بہت ذلیل لگتا۔؟

جواب۔ ذلیل نہ ہوتا تو کیا آپ رکھ لیتے۔

سوال: خیر صرف ایک بچہ کیوں پیدا کرتا ہے؟ جواب۔ قبل پلاننگ۔

سوال: میں کسی ایسی بوی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جو بولے نہیں، صرف میرے حکم کی تعمیل کرے۔ کوئی آپ کی نگاہ میں ہے؟

جواب ہاں ہے۔ آپ ایک بایسکل خرید لیجیے۔

سوال: محبوبہ اور ریڈر میں کونسی چیز مشترک ہے؟

جواب۔ وعدہ شکنی۔

سوال: اگر محبوبہ صرف اردو جانتی ہو اور عاشق صرف انگریزی تو آپ ان کے عشق کو کیا کہیں گے؟

جواب۔ اینگلو انڈین —

سوال: میری ایک رشتہ دار خاتون نے پرسوں دسویں رکنی کو جنم دیا ہے آخر وہ چاہتی کیا ہے؟

جواب۔ گھر میں گرل اسکول کھولنا۔

سوال۔ ایک والد اور ایک سسر میں کیا فرق ہے؟

جواب۔ کچھ نہیں — دونوں ایک دوسرے کا غلط ترجمہ ہیں۔

جواب۔ دفتر میں ادور ٹائم۔

سوال۔ میں راشن دہی بھون خریدنا چاہتا ہوں۔ (سودا کرا دیجئے۔

جواب۔ کرا دوں گا۔ لیکن مالک مکان کا ایڈریس نہیں لی رہا۔

سوال۔ شریف آدمی کی پہچان کیسا ہے۔؟

جواب۔ جو چور سے کہے۔ بسایا! خالی ہاتھ لوٹنے پر تم سے سمانی مانگتا ہوں۔

سوال۔ دہن کے حسین خواب کب ٹوٹتے ہیں۔؟

جواب۔ جب وہ راشن ڈپ کے کیڑے ۵۰۰ میں جا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

سوال۔ میں نے اسے کہا: "حق کر دو گی" تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور

کہا۔۔۔۔؟

بتائیے اُس نے کیا کہا ہو گا۔

جواب۔ یہی کہ سوری، آپ ریٹ ہو گئے۔

سوال۔ زندگی میں پریشانی کا علاج کیا ہے۔

اسٹگلنگ یا خدا کی عبادت؟

جواب۔ اسٹگلنگ کے بعد خدا کی عبادت۔

سوال۔ وہ خواب میں ہاں کہہ دیتی ہے، بیداری میں نہ کر دیتی ہے۔ بتائیے وہ

کون ہے؟

جواب۔ آپ کی بیوی۔

سوال۔ بچہ اپنی ماں کو کیا کہتا ہے؟

جواب۔ دودھ کی ڈیری۔

سوال۔ میں نے شادی کی تو بیوی کو دیکھ کر یوں لگا، جیسے لاری کا ٹکٹ نکلا ہے۔

اس ٹکٹ پر مجھے کتنا انعام ملے گا؟

جواب۔ تین بچے۔

سوال۔ دور حاضر کی اولاد اپنے والدین کے بارے میں کیا سوچتی ہے؟

وال: اگر چر لیڈ رہیں جائے تو سب سے پہلا کام کیا کرے گا؟
اب: چوروں کی ٹریڈرین بتائے گا۔

وال: بھکاری کو دان پیسے دیتے وقت دانا کا ہاتھ کا پتہ کیوں ہے؟
اب: کسی دھندے میں پونجی لگاتے وقت ریسک (Risk) کا احساس تو ہوتا ہی ہے۔

وال: اگر کوئی بددیانت شخص دیانت دار بن جائے تو اسے کیا کہیں گے؟
اب: خود کشی۔

وال: جب خدا ہر وقت میرے دل میں رہتا ہے تو بتائیے میرا اور خدا کا کیا
رشتہ ہے؟

اب: آپ - مالک مکان

خدا - کرایہ دار

وال: کیا جنت میں بھینسیں ہوتی ہیں؟

اب: کیا آپ کا پروگرام وہاں بھی ملاوٹ کرنے کا ہے۔

وال: ایک شاعر، ایک عاشق - دونوں میں کوئی فرق ہے؟

اب: ہاں ہے۔

شاعر - شاعری کی نمبری تیار کرتا ہے۔

عاشق - اس نمبری کو بچاتا ہے۔

سوال: کل مجھ سے بچے ننگا کہہ دیا، مگر میں نے برا نہیں مانا - کیوں؟

جواب: بچی بات پر کوئی برا نہیں مانتا۔

سوال: ایک ہاتھ سے تال کیسے بجاتی ہے۔

جواب: کسی سینہ سے تھپڑ کھا کر دیجیے۔

سوال: شادی کے بعد بچے پیدا کرنے چاہئیں تو بچے پیدا کرنے کے بعد کیا کرنا

چاہیے؟

جواب۔ جب حادثی چیزیں بھی چور بازار میں ملا کر بی گئی۔

سوال۔ ہمارے ملک میں آبادی بھین کر ڈھ ہے۔ ان میں یوتون کتنے ہیں اور قتلند کتنے؟

جواب۔ بے وقوف — بھین کر ڈھ

عقل مند — بھین کر ڈھ

سوال۔ پہلے زمانے میں لوگ دھرم کی خاطر بھانسی پر چڑھ جاتے تھے۔ آج کل کیوں نہیں چڑھتے؟

جواب۔ آج کل وہ دھرم کو ہی بھانسی پر چڑھا رہے ہیں۔

سوال۔ من میں کنول کھلتے ہیں، تن پر کیوں نہیں کھلتے؟

جواب۔ کنول عینط جگہ پر کھلتا ہے۔ مگر تن کو لوگ صاف تھرا رکھتے ہیں۔

سوال۔ میں نے ایک فلم دیکھی کہ جیب کاٹنے کا ٹر سیکو لیا۔ لیکن سینما ہال سے نکلتے

وقت میری اپنی جیب کٹ گئی — کیوں؟

جواب۔ اُس جیب کمترے نے وہ فلم دو مرتبہ دیکھی ہوگی۔

سوال۔ اگر بھینس کو عقل آجائے تو وہ کیا کرے گی؟

جواب۔ اپنے دودھ میں آپ ہی پانی ملا کر کرے گی۔

سوال۔ خدا کی پرستش کرنی چاہیے یا محبوب کی؟

جواب۔ جس میں خوجہ کم ہو۔

سوال۔ ترازو میں ایک طرف حینہ بیٹھی ہو، دوسری طرف کرنسی نوٹ۔ تو آپ

کسے ترجیح دیں گے؟

جواب حینہ سے بیاہ کر لوں گا۔ کرنسی نوٹوں کو جینز کھ مل گیا۔

سوال۔ جب کوئی نئی کوٹھی بن جاتی ہے، تو اس پر کالی ہانڈی کیوں لٹکا دیتے

ہیں؟

جواب۔ انکم ٹیکس دالوں کو ڈرانے کے لیے۔

جواب: وہ بیک وقت باپ بھی لگے گا اور خاوند بھی۔

سوال: عورت کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو کب آتے ہیں؟

جواب: خوشی کے آنسو۔ عورت جب ڈول میں بیٹھتی ہے۔

سوال: نورامیدہ بچہ اپنی مٹھی کب کھولتا ہے؟

جواب: جب وہ خیرات کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے۔

سوال: بچہ پیدا ہوتے ہی کیوں روتا ہے؟

جواب: ماں باپ کے مستقبل پر۔

سوال: کھرک کو اپنی بیوی کے چال چلن پر مشد کب ہنستے ہیں؟

جواب: جب وہ خاوند کی جیسٹن ٹون بند کر دے۔

سوال: بچے کوئی بار ٹھوکر لگے، مگر پھر بھی عقل کیوں نہیں آتی؟

جواب: ٹھوکر لگانے والے آپ سے زیادہ عقل مند ہوں گے۔

سوال: عورت اگر جو ٹھابرتن ہے تو پھر مرد کیا ہے؟

جواب: برتن کی بوتھ۔

سوال: جو بچہ اپنی ساس کو ماں کا مرتبہ دے دے وہ کہاں ہے؟

جواب: وہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہے۔

سوال: سوشلزم کیوں لیٹ ہو گیا؟

جواب: بچاؤ کے پاس بس کامرا یہ نہیں ہے۔

سوال: ہمارے محلے کا ایک بلیک، ہر روز مندر کیوں جاتا ہے؟

جواب: یہ دیکھنے کہ پڑھاؤ کے کی بلیک کس طرح کی جاسکتی ہے؟

سوال: اگر کوئی کا زوا اجینز اچانک آپ کے کمرے میں داخل ہو جائے تو آپ کے

مذہب سے سب سے پہلا کر نفاق قرہ نکلے گا؟

سوال: یہ حد بازار میں کب کلا ٹمکس پیدا ہوگا؟

جواب :- آپ کے سن میں کوئی چور ہے ۔

سوال :- دنیا سے تیاگ کس وقت اختیار کرنا چاہیے ؟

جواب :- جب دنیا آپ کو تیاگ دے ۔

سوال :- سائیں بابا ! خودکشی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

جواب :- بس یہی کہ نام خودکشی نہیں کرنی چاہیے ۔ ورنہ پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے ؟

سوال :- میرے ایک دوست کی بیٹی ہے جو ایک ہند کتاب کی طرح ہے ۔

ایسا سلوم ہوتا ہے اُسے کسی نے کھول کر نہیں دیکھا ۔

جواب :- کئی کتابیں ایسی ہوتی ہیں ۔ جن کا کوہ پیچ ہی دیکھ کر لوگ رکھ دیتے ہیں ۔

سوال :- میرا خاندان کلرک ہے ۔ دفتر سے گھرتے ہی سیدھا چھت پر چلا جاتا ہے اور ایک

راکی کو گھورتا رہتا ہے ۔ اس سے آخر کیا حاصل ہوتا ہے ؟

جواب :- اور ٹائم ۔

سوال :- خدا نے آیام کو پیدا کر کے خلطی کی تو پھر خدا کو کیوں پیدا کر دالا ؟

جواب :- خلطی کی نصیح کے لیے ۔

سوال :- عشق اگر پاسپورٹ ہے تو شادی کیا ہے ؟

جواب :- بچے پیدا کرنے کا دیر ۔

سوال :- حسین و جمیل راکی اگر دلائی شراب ہے تو طواف کیا ہے ؟

جواب :- دس تھرا ۔

سوال :- وہ کس قسم کے میاں بیوی ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو طلاق نہیں دیتے ؟

جواب :- جو پہلے ہی طلاق پاؤں نہ ہوں ۔

سوال :- میرا خاندان اپنے آپ کو گدھا کہوں کہتا ہے ۔ حالانکہ وہ بہت عقل مند ہے ۔

جواب :- گستاخی صاف عقل مند ہوتا تو کیا آپ سے شادی کرتا ۔

سوال :- فکر صاحب ! اگر بچا س سال کا کوئی مرد بیس سال کی راکی سے شادی کرے

تو کیا گئے نکاح ؟

جواب :- اس کے پرانے نو لیٹر۔

سوال :- عورت کی گفتگو کا لذیذ ترین موضوع کیا ہوتا ہے ؟

جواب :- کپڑوں کے ڈیزائن اور پڑوسنوں کی قیمت ۔

سوال :- خدانے خوبصورت عورتوں کو حسن عطا کر دیا، سمجھو شہی عورتوں کو کیا دیا ؟

جواب :- عقل ۔

سوال :- جس عورت کے پاؤں کی اڑیاں میل ہوں ؟

جواب :- وہ ضرور گرہن ہونگی ۔

سوال :- عقل مند آدمی اور ایک بھینس میں کیا فرق ہوتا ہے ؟

جواب :- عقل مند آدمی بھوکوں مرتا ہے مگر بھینس کو ہر روز چارہ مل جاتا ہے ۔

سوال :- سیر ایک روکا نہایت ذہین ہے مگر دوسرا بڑا نالائق ہے ۔ ایک باپ

کے دو بیٹے مگر قسمت جدا جدا کیوں ہے ؟

جواب :- اُن میں سے ایک اپنی مال پر گیا ہو گا ۔

سوال :- خدائی فوجدار سے کیا مراد ہے ؟

جواب :- جحشا کی فرج میں ملازم ہو سگو خواہ فلولق سے وصول کرتا ہو ۔

سوال :- کیا ایک حسین عورت ایک بدصورت مرد سے بھی محبت کر سکتی ہے ؟

جواب :- آپ کے دیکھ لیجئے ۔

سوال :- اچھے پڑوسی کی کیا پہچان ہے ؟

جواب :- جو آپ سے ڈر کر خاموش رہتا ہو ۔

سوال :- میں نے بہت سے ایسے آدمی دیکھے ہیں جو سننے زیادہ ہیں مگر بولنے کم ہیں ۔

ایسے آدمیوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

جواب :- ایسے آدمی یا تو بہت زیادہ جاہل ہوتے ہیں یا بہت زیادہ عقل مند ہوتے ہیں ۔

سوال :- بھلے تارکی میں بڑا سکون ملتا ہے ۔ لیکن روشنی سے بے حد گھبرانا ہوں ۔

اس کی کیا وجہ ہے ؟

اس کے ڈیڑھی سے کیا بات کروں؟

جواب :- ”جبیز کی؟“

سوال :- ”جو مسجد میں بیٹھ کر شراب پیتے ہیں وہ کون ہوتے ہیں؟“

جواب :- ”کائنات کی سب سے بڑی“

سوال :- ”میرا دادا اجڑا رہا تھا۔ باپ جیب کترا تھا۔ میں سگنگ کا کام کرتا ہوں۔“

میرا بیٹا کیا بنے گا؟

جواب :- ”لیڈر“

سوال :- ”عورت ناقابل فہم کیوں ہے؟“

جواب :- ”کیوں کہ وہ بھی خالق ہے۔ خدا کی طرح۔“

سوال :- ”ایڈیل شادی شدہ جوڑہ کیسا ہوتا ہے؟“

جواب :- ”ہوتا ہی نہیں۔“

سوال :- ”دانہ گندم کھانے میں قصور کس کا تھا؟ آدم کا یا حوا کا؟“

جواب :- ”میرے خیال میں یہ دانہ گندم کا قصور تھا۔“

سوال :- ”کئی عورتیں عمر بھر شادی کیوں نہیں کرتیں؟“

جواب :- ”وہ غریب حسن بن کر رہ جاتی ہیں۔“

سوال :- ”عورت کو پاؤں کی جوتی کیوں کہا جاتا ہے؟“

جواب :- ”کیوں کہ خدا خدا مٹی جوتی ہے اپنے سر کی رست کرتا ہے۔“

سوال :- ”عورت کس وقت سب سے زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے؟“

جواب :- ”جب وہ بچے کی ماں بن جاتی ہے۔“

سوال :- ”میاں بیوی کی ازدواجی زندگی کیوں کر خوش گوار ہو سکتی ہے؟“

جواب :- ”اندھے بن کر۔ تاکہ دونوں ایک دوسرے کے عیبوں کو نہ دیکھ سکیں۔“

سوال :- ”میں اپنی بھریہ کو اس کی شادی پر ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ تمہارے کون سا

تحفہ دوں؟

سوال :- ہندوستانی سوشلزم سے سب سے بڑا خطرہ کس کو ہے ؟

جواب :- سوشلزم کو !

سوال :- چاند میں جو بڑھیا بیٹھی چرخہ کاٹا کرتی تھی وہ کہاں گئی ؟

جواب :- ٹیکسٹائل مل میں نوکر ہو گئی !

سوال :- عاشق کو کس وقت بھیانک پنپنے آئے لگتے ہیں ؟

جواب :- جب محبوبہ تنگ آکر بیاہ کا مطالعہ کر بیٹھے ۔

سوال :- میں کسی ایسے دیرینہ چینہ کی رفاقت میں گھومنا چاہتا ہوں کہ کوئی مجھ پر تلے ۔

جواب :- اُس کی کار کے ڈرامیور بن جائیے ۔

سوال :- شادی اگر عشق کی قبر ہے تو بچے ؟

جواب :- قبر کے مجاور !

سوال :- اگر انسان تنہا ہو تو کیا لگتا ہے ؟

جواب :- خدا ۔ کیونکہ وہ بھی لاشریک ہے ۔

سوال :- میرے والد صاحب میری ماں کے ساتھ جب بھی جھگڑا کرتے ہیں تو اسے

طعنہ دیتے ہیں کہ تم تو بچپن میں بھینس بھینس تھیں ۔

میرے والد صاحب کو کس طرح معلوم ہوا ؟

جواب :- وہ گزشتہ جنم میں ڈیری کا مالک ہو گا اور بھینس کے دودھ میں پانی

ملاتا ہو گا ۔

سوال :- آپ نے ایک بار لکھا تھا حسین لڑکیاں بے وقوف ہوتی ہیں لیکن میں

حسین بھی ہوں اور بے وقوف بھی نہیں ۔

جواب :- ہر حسین لڑکی بے وقوف تو ہوتی ہے لیکن ہر بے وقوف لڑکی حسین نہیں ہوتی ۔

سوال :- سائی آدھی گیارہ والی ہوتی ہے تو سالا ؟

جواب :- پورا چپڑا سی !

سوال :- میری محبوبہ اگر مجھ سے کہتی ہے میرے ڈیڈی سے بات کر دو آخر

جواب :- اس شق کا آغاز ہی نہیں ہوتا جس کا انجام ہو جائے۔
 سوال :- میرے شق کا سورج غروب ہو گیا ہے یعنی میری محبوبہ کی شادی ہو گئی ہے لیکن وہ ابھی تک میرے خوابوں میں کیوں آجاتی ہے؟
 جواب :- سورج ڈوبنے کے بعد کچھ دیر تک اس کی کرنیں کا پٹی رہتی ہیں۔
 سوال :- تو میرے بعد کونسی منزل ہوتی ہے؟
 جواب :- آؤ گویا کی۔

سوال :- جب لیڈر سٹیج پر تقریر کر رہا ہوتا ہے تو کیا سوچتا ہے؟
 جواب :- لیڈر سوچے بغیر تقریر کرتا ہے۔
 سوال :- شنیدیں آیا ہے کہ جب ظلم ایجنٹوں کے ہاں بچہ تولد ہوتا ہے تو وہ اُسے اپنا دودھ نہیں پلاتیں! اس کی وجہ کیا ہوگی؟
 جواب :- وہ دین دیتی ہیں کہ ہم مائیں ہیں ملک بونہ نہیں ہیں!
 سوال :- بے وقوف دوست کون ہوتا ہے اور دانا دشمن کون؟
 جواب :- بیتی دیتا استری اور جتنا کا لیڈر!
 سوال :- آج کل کے لوگ گلیسرین کے آنسو کیوں بہاتے ہیں۔ اگلی آنسو کیوں نہیں بہاتے۔؟

جواب :- گلیسرین کے آنسو سستے پڑتے ہیں۔
 سوال :- خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ کیسے؟
 جواب :- جیسے جیب کترے کو دیکھ کر پولیس والا رنگ پکڑتا ہے۔!
 سوال :- وہ کون سے مغزین ہیں جو ہندوستان اور پاکستان کو ایک نگاہ سے دیکھتے ہیں؟
 جواب :- سنگٹکر!

سوال :- راجہ اندر کے دربار میں جو افسر اسے نقص کرتی تھیں، وہ آج کل میرے ڈانسر بن گئی ہیں تو راجہ اندر کہاں گیا؟
 اب :- بلیک میں کیمرے ڈانسر کی ٹھٹھیں بچتا ہے۔

سوال :- آپ سن کا ٹھیکہ لے کر میں لے کر مکانوں کے دروازے کھٹکھٹانے

لیکن کسی نے مجھے جھپک نہیں دی؟

جواب :- آپ نے خالی مکانوں کے درکھٹ کھٹائے ہوں گے؟

سوال :- ٹھکانے کی خدمت کرنا بہتر ہے یا انسان کی؟

جواب :- ٹھکانے کی۔ کیونکہ انسان کی خدمت کریں گے تو وہ آپ کی ٹھکانے

بھی چمڑالے گا۔

سوال :- کیا یہ سچ ہے کہ محبوب کی آواز کانوں میں رس گھول دیتی ہے؟

جواب :- یہ کانوں کی کواٹھی کے اوپر منحصر ہے۔

سوال :- انسان دوسروں کی نظروں میں گرنا کیوں پسند نہیں کرتا؟

جواب :- کیونکہ اپنی ہی نظروں میں گرنا کافی ہوتا ہے۔

سوال :- بہادر شاہ ظفر نے یہ شعر کیوں لکھا تھا۔

جہ کنابہ نصیب ظفر دفن کے لیے

دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

جواب :- آن دنوں دہلی میں زمین بہت ہلکی ہو گئی اور بہادر شاہ ظفر کی اعتقادی

پوزیشن بڑی نازک تھی۔

سوال :- کہتے ہیں پائلس بہت غلیظ گیم ہوتی ہے تو پھر اچھے آدمی اس میں

کیوں پھنستے ہیں؟

جواب :- آپ سے کس نے کہا کہ وہ اچھے آدمی ہوتے ہیں؟

سوال :- پھول کب پتھر بن جاتے ہیں؟

جواب :- سب کوئی خوبصورت لڑکی بیڑی پولیس میں بھرتی ہو جاتی ہے۔

سوال :- میں کسی بھینس کے آگے میں بجانا چاہتا ہوں، کسی مقول بھینس کچھ بتائیے۔

جواب :- فکر تو نسو، سرنٹ گل جہاں تک دہلی۔

سوال :- عشق کا آغاز کیسا ہوتا ہے اور انجام کیا؟

سوال - "سوشلزم کے غرض کی کتنی اہمیت ہے ؟"

جواب - "امیروں کی ڈانٹنگ ٹیل کے ایک لہجے کی !"

سوال - "وہ لوگ کہاں گئے جو کہا کرتے تھے ملک میں انقلاب لائیں گے۔"

جواب - "وہ مندرجہ ذیل مقامات پر مل جاتیں گے :-

(۱) پبلک پارک میں گلی سٹری موٹو پھلیاں کھاتے ہوئے ۔

(۲) راج گھلوں میں پستے کھا کر بوگ پھلیوں پر آنسو بہاتے ہوئے ۔"

سوال - "عاشقوں اور بڑھوں کو نیند کیوں نہیں آتی ؟"

جواب - "عاشقوں کو محبوب اور بڑھوں کو موت کے انتظار میں ۔ دونوں نہ جانے کب ٹپک پڑیں۔"

سوال - "وہ کونسی آنکھ ہے جو روتی نہیں مگر آنسو بہاتی ہے ؟"

جواب - "لیٹہ کی آنکھ ؟"

سوال - "اس دنیا سے ناطہ کب توڑنا چاہیے ؟"

جواب - "جب دنیا آپ سے ناطہ توڑ لے !"

میری آنکھوں میں گر گئیں، میرے کندھے پر سر رکھ کر روئیں، میرے ہونٹوں تک آپہنچیں (کبھی کبھی میری جیب تک بھی جا پہنچیں) میں نے تمہاری ہلکوں پر اپنے کپکپاتے ہوئے آنسو دیکھے اور انھیں اپنے ریشی روال سے پونچھ ڈالا۔ تم نے اپنی ریشی محرومی، نازک انگلیوں سے میرا سگریٹ سلگایا اور پھر دھوئیں کے نیلے نیلے مرغولوں کے ہلکے ہلکے تیرتے ہوئے بادلوں میں ہم دونوں گم ہو گئے۔ ایک دوسرے سے اوجھل ہو گئے۔ اور پھر یہ گم شدگی کا عالم اکثر دہشتہ صدیوں تک پھیل گیا۔ اور میں نے اکثر انوس ظاہر کیا کہ محبت کے لیے صدیاں بھی کتنی کم ہوتی ہیں۔ کاش محبت کے لیے وقت کی کوئی قید نہ ہوتی، گھڑیاں اور ٹائم میسن نہ ہوتے، کیلنڈر اور جنتریاں نہ ہوتیں۔

لیکن اے میری صدیوں پرانی محبوبہ! کل رات ایک انوس اک ٹھننا ہو گئی کہ جب مجھے سگریٹ نوشی کی زیادتی سے خیند نہیں آرہی تھی اور میرا سر گھوم رہا تھا تو میں نے تمہیں سرد ہانے کے لیے بلایا۔ اور جب تم میری آنسوؤں کے سارے پتھر کٹی، اٹھلاتی ہوئی آئیں تو تمہارے ساتھ پانچ چھ جینائیں اور بھی نہیں۔ اور یہ دیکھ کر میں بوکھلا گیا کہ تمہاری برقی ایسی آنکھیں تمہارے چہرے پر نہیں تھیں بلکہ ایک اور حینہ کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ تمہارے ہونٹوں کے گلاب دوسری حینہ کے پاس تھے۔ تمہاری محرومی انگلیاں تیسری کے پاس اور زلفیں چوتھی کے سر پر سوار تھیں۔ غرض تمہارا عضو عضو ٹپک چکا تھا، بے ٹھکانہ ہو گیا تھا۔ یوں گنتا تھا جیسے دنیا بھر کی حیناؤں نے مل جل کر تمہارے حسن کو لوٹ لیا ہے اور دارلنگ! یہ بات مجھے بہت بُری لگی کہ تم اپنا حسن (جو میں نے تمہیں عطا کیا تھا) یوں الم غلم کر کیوں میں لٹاتی پھرو۔ اور پھر تمہارے سامنے سب نے میرا منہ کھڑا کر دیا۔ غصیب یہ کہ اس تذلیل میں تم بھی شامل تھیں۔

بیاری! اگر تم واقعی مجھے چاہتی ہو تو آئندہ ایسی حرکتوں سے گریز کرو۔ یاد

تمہارا عاشق

رکھو

(زلم کہنے سے ناتوا)

کا زخم ہو چکا اور اب صرف تمہارا فاتحہ باقی ہے۔ اس لیے آؤ کب تو اپنا وعدہ پورا کرو اور زیادہ نہ ٹر پاؤ، شکے لگ جاؤ۔ تمہارے میسر ساٹھ سال گزار دے مگر اب یہ باقی کے دو چار سال گزارنا انتہائی مشکل ہو رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم بھی اب بور ہو چکی ہو اور اپنا بوڑھا دل کسی نہ کسی کو دے دینا چاہتی ہو۔ مگر

میں ہر ڈاک سے تمہارے نوٹیز کا انتظار کروں گا بلکہ میں تو کہتا ہوں پیاری بڑھیا! نوٹیز کا تعلق بھی کیوں کرتی ہو؟

مہرباں ہو کے بلا لوجے چاہیں دت میں گیا دت نہیں ہوں کہ پھر آجی نہ سکوں
تمہارا قدیم ترین عاشق
بدھ رکھا ناٹھ ریٹا سڑا ڈیڈ کیٹ

ان ہیکھی محبوبہ کے نام —

شیلا، نیلا، کملا، زہرہ، طاہرہ، (جو بھی تمہارا نام ہو)
یہ عجیب ٹریجڈی ہے کہ میں تمہیں نہیں جانتا (اور ظالم! تم مجھے نہیں جانتیں)
نہ ہمارا نام، نہ ہمارے والد صاحب کا نام، نہ ہمارا پوسٹل ایڈریس، نہ گلی اور مکان کا
میں سبیل نمبر۔ اور اس ٹریجڈی کے بعد کامیڈی یہ ہے کہ میں نے
تمہیں کبھی دیکھا بھی نہیں۔

لیکن جان من! اس کے باوجود میں تم سے محبت کرتا ہوں،
کبوں کہ میری تصویر سی یہ ہے کہ محبت کسی رسمی تعارف کی محتاج
نہیں، پوسٹل ایڈریس اور میں سبیل نمبر سے بہتر چیز ہے۔ اور اس
بلندی ہی کا نتیجہ ہے کہ میں نے گھنٹوں تمہارے ساتھ بیٹھ کر محبت بھری
باتیں کی ہیں، مگر کبھی ہم دونوں نے ایک دوسرے کا نام اور پتہ
نہیں پوچھا — میں نے تمہیں جب بلایا جس کا نام سے بلایا تم انہیں۔

برہم پیدا کر دیا تھا۔ ہمارے ابا۔ جی بھارت کی جنگ بندی تو صرف پانچ
 گاؤں کے سوال پر ٹری گئی تھی اور ہمارے محلے کی جنگ بھی پانچ ہی کی اینٹ
 پر ٹری گئی۔ میں پوچھتا ہوں اسی اینٹ ہی اینٹ! تم نے یہ کیا کر دیا۔ کیا تم اس
 لیے پیدا کی گئی تھیں کہ انسانوں کو بھڑا کر لہو بہان کر دو۔ تم تو سایہ دار
 مکان بنانے کے لیے پیدا کی گئی تھیں۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تمہارے
 اندر مکان مسمار کرنے کی خاصیت بھی موجود ہے۔

لہذا کل تمہاری وجہ سے ہمارے محلے بھر میں جوڑ لگا ہوا اس کے لیے
 تمہیں شرم سے ڈب مڑنا چاہیے — جے ہند!!
 کنوارا بڑھا بنام کنواری بوڑھی
 میری شام حیات!

اس سے پہلے کہ قبر کے دروازے ہم دونوں پر کھل جائیں، آؤ ہم ایک دوسرے
 پر کھٹ جائیں۔ تمہیں یاد ہو گا کہ آج سے چالیس برس پہلے میں نے تمہیں ایک ٹولیر
 دکھا تھا جسے پڑھ کر تم نے کہا تھا "سٹر بردی ناتھ! یہ بچپن ہے۔ انسان صرف
 عشق اور شادی کے لیے پیدا نہیں ہوا، بلکہ ایک بہت بڑا کاز لے کر آیا ہے چنانچہ
 میلاد ٹوٹ گیا اور میں نے طے کر لیا کہ اگر عشق کر دوں گا تو صرف تم سے اور نہ عمر بھر
 محروم عشق یعنی کنوارا رہوں گا۔

چنانچہ اسے میری پیاری! میں نے چالیس برس تک تمہارا انتظار کیا۔ اگر
 چالیس برس تک میں ہالیوڈ پرست پر جا کر تمہارا قربان نہ بن جاتا لیکن
 آہ نہ میں خدا کو پاسکا نہ تمہیں۔ میں نے برسوں تمہیں بازار میں جاتے ہوئے
 دیکھا۔ تمہاری کمر خیمہ تھی، اماؤں کی لاش تمہارے کندھے پر سوار تھی، آنکھوں
 پر موٹے موٹے میٹھنوں کی جینک تھی۔ مٹی پر کے بوجھ سے تمہارے ہاتھ کانپ رہے
 تھے۔ میں پوچھتا ہوں ظالم! کیا یہی تمہارا کاز تھا؟ یہی خیمہ گی، یہی لاشیں، یہی
 جینک اور یہی کپڑے؟ اگر واقعی یہی کاز تھا تو جان تمنا! اب اس کی تکمیل ہو چکی

صرف سمجھ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔

غرض اسے جانِ تنہا! میں نے تیرا جلوہ دیکھنے کے لیے کیا کیا معاہدے بدداشت نہ کیے۔ لیکن تمہارا دل دیکھا عجیب بات ہے کہ تمہارے دھماکے کے لیے ہمیں چور بننا پڑتا ہے، ڈاکو اور سنگٹکر کہلانا پڑتا ہے، وحشی کہتے ہیں عاشقوں کا راستہ روک لینے میں۔ تم جہاں بھی جیتی ہو کسی نہ کسی پردے میں یا قید میں یا تلے کے اندر۔ آخر تم نے کون سا جرم کیا ہے کہ تمہیں ہر آدمی اندھیری تاریک قیدوں میں رکھتا ہے۔ آخر تم ایک دھماکے کا ٹکڑا ہی تو ہو۔ تمہارے اس دھماکے کے پھیلنے محسن کی خاطر دوسرے انسانی سماج نے اپنا حلیہ بگڑا لیا ہے۔ تمہاری خاطر دنگے، قتل، ڈکیتی یہاں تک کہ تہذیبیں ایک دوسرے کو فنا کر دیتی ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ کیا وجہ ہے؟ کیا وجہ ہے؟

اینٹ کے نام۔

اینٹ ری اینٹ!

کل تمہاری وجہ سے ہمارے محلے میں جو دنگا ہوا اُس کے لیے تمہیں شرم سے ڈوب مرنے چاہیے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہماری پڑوس (نام تو تمہیں بھی معلوم ہو گیا ہو گا) تمہیں سامنے کے چمک چمک سے اٹھا کر (بکے چاکر) لے آئی تھی۔ جہاں تم دوسری سینکڑوں اینٹوں کے ساتھ کسی کی دیوار بننے کی خاطر ٹری ہوئی تھیں۔ تم صرف پانچ پیسے کی اینٹ تھیں لیکن غضب یہ ہوا کہ اسکول ماسٹر رام سائے کی لڑکی نے اسے اینٹ چراتے دیکھ لیا اور محلے بھر میں شور مچا دیا۔ بس پڑوسن بچاری بدنام ہو گئی اور اس نے بھتے میں آکر تمہیں اسکول ماسٹر کی بیوی کے سر پر دے مارا اسکول ماسٹر نے بھرپور اٹھا کر پڑوسن کا سر بھاڑ ڈالا اور یوں دنگا

جواب : حیب : امیری اور غریبی دونوں ترقی کر رہی ہوں ۔

سوال : کال بیل اور کال گرل میں کیا فرق ہوتا ہے ؟

جواب : کال بیل بچائی جاتی ہے ۔ کال گرل خود بخود نکلتی ہے ۔

سوال : پکڑی کے دکیل اور کوٹھے کی طوائف میں کونسی چیز مشترک ہے ؟

جواب : گالک

سوال : اگر جتنا اپنے لیڈر کو بے ایمان کہہ دے ۔ تو لیڈر کیا جواب دے گا ؟

جواب : یہی کہ میں اس پر غور کروں گا ۔

سوال : انسان گرمی ہوئی چیز کو اٹھالیتے ہیں ۔ مگر گرتے ہوئے انسان کو کیوں

نہیں اٹھاتے ؟

جواب : کوڑا کرکٹ کو اٹھانا اچھا نہیں سمجھا جاتا ۔

سوال : ناک کس کی پر جا کرتا ہے ؟

جواب : اپنی

سوال : کئی لوگ اپنی قبر آپ کیوں کھودتے ہیں ،

جواب : کھدائی کے پیسے بچانے کے لئے ۔

سوال : اگر کسی لیڈر میں قوم کا درد اچانک روپے پیسے کے درد میں بدل جائے

تو آپ اسے کیا کہیں گے ؟

جواب : دردناک

سوال : رام راج اور جنتا راج میں کیا فرق ہے !

جواب : رام راج میں دیا اور تیل مل جاتا ہے ۔ مگر جنتا راج میں صرف دیا ملتا

ہے ۔ تیل نہیں ۔

سوال : حیب عاشق اور محبوبہ ایک دوسرے کی بات نہ مانتی تو کیا ہوتا ہے ؟

جواب : بچہ ڈرنا ہو جاتا ہے۔

سوال : بچے دنوں خیرانی یعنی کہ کچھ سورتوں سندوں نے چند ہری جن عورتوں کی متیا کر ڈالی۔ آپ اسے کیا کہیں گے ؟

جواب : گمراہ متیا۔

سوال : لوگوں نے پیسے کو بھگوان بنا لیا ہے۔ تو اصل بھگوان کو کیا کہا جائے ؟

جواب : کھڑا سکہ

سوال : میں باوجود خواہش کے زندگی کی اونچی منزل پر نہیں پہنچا۔ کارن ؟

جواب : نقص خراب ہوگی۔

سوال : انسان اور بھگوان میں کیا رشتہ ہے ؟

جواب : دونوں ایک دوسرے کی تخلیق ہیں۔

سوال : اس سرورن کا نام بتائیے جس نے ہمیشہ ایک سرور کے ساتھ رول کیا ہو ؟

جواب : آپ کی میری۔

دل کی ڈائریاں

ایک جیب کترے کی ڈائری

پہلی اپریل -

آج اپریل فول تھا۔ اس لئے میں نے اپنی آتما سے کہا - ”اے مکند لال
کی آتما! آج لوگ دوسروں کو فول بنا دیں گے۔ میں تمہیں بناؤں گا!“ اور میں نے
بھگو۔ بے کپڑے پہنے۔ ماتھے پر ماتھے رکھے۔ سینہ درمیان تلک لگایا اور علاقے
کے اس مشہور مندر میں چلا گیا، جس کے پجاری کی جیب کچیلے جھینے کاٹی گئی تھی۔
اس پجاری پر غصہ بھی بہت آیا تھا۔ کیونکہ اس کی جیب میں سے کئی کھوٹے سونے
نکلے تھے۔ نہ جانے لوگ پوجا کے لئے کھوٹے سونے کیوں چڑھاتے ہیں۔

جب میں مندر میں پہنچا تو عقیدت مندوں کی ایک ٹھیر لگی ہوئی تھی۔ بے اختیار
جی چاہا جیب کاٹنے کا نادر موقع ہے۔ لیکن آتما نے مجھے خوش گالی دی کہ تم مرد ہو یا
سیاسی لیڈر، وعدہ کر کے ایسا نہیں کرتے۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش
ہو گیا۔ اگرچہ مجھے آتما پر سخت طیش آیا کہ یہ کسی ڈھیسٹ ہے۔ ہر وقت انسان کے
چھٹی رہتی ہے۔

شرودھا لوگوں کی بیڑ کو چکر میں بھگوان کی مورتی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اندھی عقیدت کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں، اگرچہ کبھی کبھی ایک آنکھ غھوڑی سی کھول کر چڑھاوے کے دھن کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا، اور پھر بھگوان کی مورتی کے سامنے حلف لیا کہ اگر میں آئندہ کسی کی جیب کاٹوں تو تم مجھے کاٹا یا بہرا دونوں بنا دینا! یہ حلف میں نے دل ہی دل میں لیا کیونکہ بلند آواز میں لیتا تو راز دگر دکھڑے ہو گئے لوگ سن لیتے۔ انسان کو ایمان دار بننے ہوئے یہی لوگوں سے شرم آتی ہے۔

حلف لینے کے بعد جب میں چڑھاوے کے لئے جیب سے پیسے نکالنے لگا تو بزدلیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری جیب کٹ چکی تھی!

اس کے بعد سارا دن ادا اس رہا میں آتما کو فول بنائے۔ کھلا تھا۔ لیکن آتما نے مجھے فول بنا دیا! میں نے آتما سے پوچھا: ”یہ تم نے کیا حرکت کی؟“ میں تو صورت تم سے بچا پر تل فول کر رہا تھا۔ صدق دلی سے جیب کڑی سے توڑ غھوڑے کر رہا تھا لیکن تم سو گئیں اور کوئی میری جیب ہی کاٹ کر لے گیا۔

”آتما نے جواب دیا قہہ قہہ قہہ!!“

میں نے کہا ”شیم! شیم! شیم!!“

تین اپریل -

مندر میں جس آدمی نے میری جیب کاٹی تھی آج اس کا پتہ چل گیا ہے جیب کتروں کے گوردے جسے ہم سب ”جٹی دادا“ کہتے ہیں، مجھ سے ذکر کیا کہ آج کل مندروں میں ٹٹ پونجی شرودھا لو جانے لگے ہیں۔ پرسوں ہمارے گروہ کے ایک جیب کترے شنبھو نے ایک بھگوانے کپڑوں والے بھگت کی جیب کاٹی تو اس میں سے صرف سو روپیہ اور ایک ادھ چلی بیڑی نکلی! — یہ کہہ کر جٹی دادا قہہ مار کر میرا ہنسا کہ یہ سو روپیہ اور ادھ چلی بیڑی تو میری جیب میں تھی جس میں اتنی کروڑوں کے

سامنے اعتراض کرلوں کہ وہ مجھ کو فاسق شریف ہی کی جیب تھی لیکن پھر یہ سوچ کر لرز اٹھا کہ دادا اپنے چایک سے میری چٹری ادھیڑ دے گا۔ — اپنے گروہ میں ہی خارج کر دے گا رین جیب کڑی کی تو میں بے کر جیب کترے کی ہی جیب کٹ جائے۔ دادا مجھے ان کو ایسا میڈ کر دے گا۔ اس لئے اپنی عداوت کا زہر چپ چاپ پی گیا۔

اللہ تعالیٰ مجھے شہیدو سارے پرہیز غصہ آیا کہ اس نے مجھے پہچان کیوں نہیں حالانکہ ہم نے کئی بار اکٹھے مل کر جیسیں صاف کی تھیں۔ دل میں فیصلہ کر لیا کہ کسی دن شہیدو کسی کی جیب کاٹے گا، تو میں ہاتھ کی صفائی دکھا کر اس کی جیب کاٹ لوں گا۔

آج شام کو ایک بس سٹاپ پر اپنا "کاروبار کرنے کے لئے گیا تھا۔ ایک نوجوان کا لچیٹ کا بڑا ڈالیا گیا، مگر اس بڑے میں صرف ایک حسین لڑکی کا فوٹو نکلا، شاید اس کی کالچیٹ عجب دیر ہوگی۔ فوٹو کی پشت پر لڑکی کا ایڈریس لکھا ہوا تھا میں نے اس ڈر میں پر فوٹو واپس ڈاک سے بھیج دیا اور مجھے پیچھے کا لچیٹ نوجوان کی طرف سے کہہ دیا۔ "شکریہ کے ساتھ واپس!"

۱۴ اپریل

کئی دنوں سے کاروبار مدہم ہے۔ میں جیب میں بھی ہاتھ ڈالتا ہوں، آخر میں یہ رقم ہاتھ لگتی ہے۔ نہ جانے لوگوں کی آمدنی کم ہو گئی ہے یا منہ گانی بڑھ گئی ہے کہ لوگوں کی جیب میں پیسے ٹپکتے ہی نہیں، معلوم ہوتا ہے ہم سے بھی بڑے جیب کترے یعنی بایک کیسے میدان میں سرگرم ہو گئے ہیں۔ آخر گورنمنٹ ان بایک مارکیٹوں کے خلاف ایکشن کیوں نہیں لیتی۔ ان کی وجہ سے ہمارے ایسے خاندانی جیب کترے کا بزنس تباہ ہو رہا ہے۔

مجھ پر قرض چڑھ گیا ہے۔ آمدنی نہ ہو تو قرض چڑھتا لازمی ہے۔ کاش! کوئی مرثیہ سامی ہاتھ لگے۔ جائے تو سارا دلدادہ دور ہو جائے۔ جنگی دادا نے کسی بار پیغام بھیجا بلکہ دھمکی بھی دی کہ سہارا بھیتہ ادا کر جاؤ۔ نہیں تو پوچھ لیں کہ تمہاری گزشتہ کر دہوں گا! ادھر علاقہ مدن پورہ کا چھوٹا تھا نیارا بہت پریشان کر رہا ہے کہ سہارا بھیتہ ابھی تک کیوں نہیں پہنچا؟ جنگی دادا اور چھوٹا تھا نیارا دونوں ایک دوسرے کے ہزار ہیں اور بھوتوں کی طرح ان کی روحیں میرے ارد گرد منڈلاتی رہتی ہیں سارے ڈکثیر بنے پھرتے ہیں۔ سہارے ایسے عوام کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے معذرت خورے کہیں کے!

آج میں نے ایک راجپوت جیوتشی کو روک کر اپنے ہاتھ کی چھیا دکھائی۔ سہارا راج! ذرا ان فیکرروں پر تیر جاؤ اور دیکھو کہ محبوبہ نجات کے نصیب میں کوئی دولت لکھی ہے یا نہیں؟ جیوتشی نے مجھ سے کہا دن پچیس لے کر بتایا کہ میری پچاس ہزار روپے کی لاٹری نکلنے والی ہے! میں نے اٹھتے اٹھتے جیوتشی کی جیب پر اپنی قسم حد آزمائی تو اس میں سے صرف پچاس پیسے نکلے! یہ گویا میری پچاس ہزار روپے کی لاٹری یعنی! بہت تیرے جاہل جیوتشی کی ایسی منسی! ان کا ایک ہزار روپے ایک پیسے کے برابر ہوتا ہے۔ بکھنوں کو معیت منسیں بھی نہیں آتا۔

۱۰ اپریل۔

سینچر جو کئی ہفتوں سے میری تعذیر کے خانے میں پھپکڑا مارے بیٹھا تھا ابھاٹک۔ بھاگ گیا ہے۔ اس کے فرار سے میرے اندر بہار آگئی۔ آج کا دن میری زندگی کا خوبصورت نریمان دن تھا۔

آج ایک اعلیٰ ترقی ہوٹل کے سامنے کھڑا تھا کہ چانک تیزی سے ایک ٹیکسی آکر رکی اور اس میں سے ایک خوش پوش اور عظیم آدمی اور غصیلے نوجوان جھینڈا کر

— ۲۰ اپریل —

آج تین دن بعد گھر سے باہر نکلا تھا۔ ان دونوں بوڑوں کا نشہ ابھی اترا نہیں، لیکن انار کا احساس ضرور شروع ہو گیا ہے۔ اس خدشے سے مارکیٹ میں پھر آ گیا کہ کہیں جیب نر ساشی کی پریکٹس نہ بھول جائے۔ آج تو ایک چھپرا بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ کیونکہ اخباروں میں پڑھا کہ آج کل حفاظت خود اختیار سی کی خاطر جیب کترے حضرات چھپرے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ بلکہ جیب ایک کترا جیب کاٹتے پکڑا گیا تو اس نے جیب کھٹوانے والے کی بجائے شور مچانے والے ایک اور آدمی کے پیٹ میں چھپرا اتار دیا۔ جیب وہ بھیانگنے میں کامیاب ہوا۔

تین تھلے ایک طلبہ گاہ میں پہنچا۔ ایک۔ مگر نو دس سال کے ایک چھپو کرے کو لوگ پکڑے ہوئے تھے اور لات، سکوں اور طمانجنوں سے اسے ”با اخلاق“ بنا رہے تھے۔ معلوم ہو کہ اس نے ایک بوڑھے کی جیب میں سے تین روپے اڑائے تھے۔ جس نے آگے بڑھ کر اس چھپو کرے کو تراخ تراخ چائے رسید کئے، جس سے اس کی ساری جیب کتری نکل گئی اور اس سے تین روپے لے کر بوڑھے کو واپس دے دیئے اور اعلان کر دیا کہ میں خود اس لونڈے کو تھانے میں لے جاؤں گا!

بوڑھے نے میرا شکریہ ادا کیا اور جیب میں اس لونڈے کو کان سے پکڑے تھانے کی طرف لے جا رہا تھا تو اس بوڑھے کے تین روپے میری جیب میں واپس آچکے تھے۔ کیونکہ جب وہ بوڑھا میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ میں اس کی جیب: دوسری بار کاٹ رہا تھا! میں نے راستے میں اس چھپو کرے کو گالیاں دے کر ان تین روپوں میں سے ایک روپیہ دے دیا۔ اور اسے سمجھایا کہ بے وقوف! جیب کاٹا ہوا تو پہلے کسی استاد سے یہ سہز سیکھ لو۔ تمہارے ایسے فامکار جیب کتروں نے

اس خونِ مطہیٰ کو رسوا کیا ہے ۔

میں نے وہ دو روپے بیکاریوں میں بانٹ دیئے۔ آخر وہ بھی انسان ہیں
 انہیں بھی زندہ رہنے کا حق ہے۔ اگر فوجیہ نہیں کتر سکتے تو جیب کتروں ہی کی کئی
 کھائیں ۔

۲۵ اپریل —

بد قسمتی جیب ساتھ دیتی ہے جیب کتر کسی کلرک کا بیوہ اٹا لیتا ہے تاکہ
 ایک کلرک کا بیوہ اپنے سامنے رکھے اس کی بد قسمتی دہرائے۔ بے وقوفی پر سنیں رہا ہوں
 ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ بیوہ اسے مرنے کا نشان ہو۔ جس پر لکھا ہو ”شمنشان
 گھاٹ کو۔“

در حقیقت غلطی مجھ سے ہوئی۔ میں گزشتہ تین دن کے ایک رشوت خور
 کلرک کا پھینچا کر رہا تھا تا کہ وہ فلسفہ مساوات کی رو سے اپنی رشوت کا روپیہ
 ہم جیب کتروں میں بھی نفیٰ نفیٰ بانٹ سکے۔ لیکن عین موقع پر وہ میرے ہاتھ
 سے نکل گیا۔ جس پر مجھے سخت غصہ ہوا اور میں نے غصے میں آکر ایک دوسرے کلرک
 کی جیب کاٹ لی۔ اس میں سے جو کچھ برآمد ہوا اور ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ ایک فیلرنگ شاپ کا بل ساڑھے چھ روپے۔ یہ شاید ایک تھیں کا بل تھا
 جسے یہ کلرک نہ ادا کر سکا نہ تمیں لا سکا۔ حالانکہ مقررہ تاریخ کو وہ دے بیٹھے گزر چکے
 تھے !

۲۔ کلرک کے سارے کو ایک خط جس میں اس نے دھمکی دی تھی کہ ہم اپنے
 بال بچوں سمیت آپ کے گھر میں گرمی کی تعطیلات گزارنے آ رہے ہیں۔ کلرک
 کے گھر کو اس نے بل اسٹیشن سمجھ لیا تھا۔

(۳) ایک بھول سی رٹ جہاں اس نے اپنے بچے کے لئے دفتر سے جرائی ہوئی۔

۴۔ ”ور کے لئے کنیا کی ضرورت، کے اشتہار کی ایک کٹنگ اس کا مطلب ہے کلرک کی بیٹی اپنی جوانی کا بوجھ لئے اس کے کندھے پر سنبھلی ہے۔

۵۔ دس پیسے کا رسیدی ٹکٹ (اسے رسیدی ٹکٹ کی کیا ضرورت پڑی ہوگی، نہ جانے کیسے اس کے ہاتھ لگ گیا) جریمے لئے بھی بیکار رہا تھا۔

۶۔ ایک فولڈ گراف جس میں کلرک اپنے پانچ بچوں اور ایک بائیکل کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ بائیکل اس کا ٹھپسا بچہ معلوم ہو رہی تھی!

۷۔ ”دروپے کے ایک میلہ کچیلے نوٹس کے تین ٹکڑے — وہ نوٹس اس کی غیر منقولہ جائیداد کے طور پر محفوظ رکھا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ کچھ انتہائی غیر ضروری کاغذات تھے۔ ایک میل سے بھری کنکھی تھی لیکن سب سے زیادہ بیش قیمت چیز جو کلرک مذکور کے ہارٹ فیل ہوئے کا باغٹ ہے۔ ”وہ کتنی دروپے میں پیسے کی تعداد رقم! جس کے بل بوتے پر کلرک اس پیسے کے آخری مارک دن گزارنا چاہتا تھا!

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ تمام چیزیں ایک رجسٹرڈ سپیکٹ کے ذریعہ کلرک مذکور کو پوسٹ کر دوں گا اور دروپے میں پیسے کی رقم اس کی رجسٹرڈ فیس پر خرچ کر دوں گا۔

اور آئندہ نے نے میں نے حلف لے لیا ہے کہ جیب بھی کسی کی جیب کا نہیں لگوں گا، اس سے بلا چھپوں گا کہ تم کلرک تو نہیں ہو؟

۲۸ اپریل

آج میں تیل میں بیٹھا ہوں۔ کئی فٹ بال میچ کے دوران اچانک جیب کاٹے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ میرا دوسرا سامعہ تو تیرہ لے کر فرار ہو گیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کیا البتہ داروغہ میں جیب مجھے ہر بند کرے۔ لو لگا تو میں نے اس کی جیب سے

یہی دس بارہ روپے کی رقم اڑالی!

مجھے افسوس صرف یہ ہے کہ یکم مئی آئے والی ہے، یہ سرکاری ملازموں کی تنخواہ کا دن ہے۔ اور تنخواہ کے دن ایک جیب کترے کا جیل میں رہنا جیب تراشی کی تاریکی کا ایک المیہ کا حادثہ ہے۔ میں نے جیجی دادا کو پیغام بھیجا ہے کہ مجھے یکم مئی سے پہلے پہلے رہا کروادے!!

ایک لیڈر کی ڈائری

نوٹ: میری یہ ذاتی ڈائری میرے انتقال کے پانچ سال بعد شائع کی جائے۔

۱۷ اکتوبر

کل میرا جنم دن تھا۔ کہتے ہیں جو لوگ اکتوبر میں پیدا ہوتے ہیں وہ راج گری پر بیٹھتے ہیں۔ میرا سوسٹا رام دھن بھی اکتوبر میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن وہ راج کے چھوٹے بھائی نہ ہوتا ہے۔ رام دھن نے اپنا جنم دن کہیں نہ منایا کیونکہ کالسی ٹیوشن کی رد سے ہر آزاد شہری کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنا جنم دن منائے یا نہ منائے۔ ہمارا کالسی ٹیوشن بس آزاد خیال ہے۔

میں نے اخباروں میں یہ مجاہدہ اعلان شائع کروایا تھا کہ اپنا جنم دن نہایت خاموشی اور سادہ طریقے سے منائوں گا۔ لیکن صبح صبح میاں کا دینے والوں کا یوں تاننا بندھ گیا جیسے گڑ کی بھیلی پر مکھیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ مجھے لمروں اور تختوں سے نا دیا گیا۔ ایک پرسی رپورٹر نے مجھ سے پوچھا: کیا آپ اپنے پہلے بیان کی ترمیم کرنا پسند کریں گے کہ آپ کے جنم دن میں گاندھی جی کی کسی سادگی ہوگی؟

لیکن میری بجائے میرے خرائٹ سکریٹری نے جواب دیا: "اس کا جواب عوام سے پوچھئے۔ کیونکہ ہارٹیا صاحب کا یہ جنم دن عوام خود منا رہے ہیں۔ عوام نے اپنے لیڈر کے ہاتھ سے باگ ڈور چھین لی ہے۔"

میرا سکریٹری جھوٹ بول رہا تھا۔ کیونکہ ہارا اور تختے لانے والے عوام بالکل نہیں تھے۔ ان میں کچھ وزیر تھے، کچھ بڑے بڑے کارخانہ دار تھے، کچھ میرٹھ پولیٹیکل سیفٹنٹ تھے۔ کچھ میری بیوی کی نقل نقل کرتے حسبن والی سہیلیاں تھیں۔ جن کے دبیز ہونٹوں پر نقی ہوئی لپ شک کی گئی تھیں چڑھتی ہوئی تھیں اور انہوں پر جب مبارک باد کی مصنوعی سکراہٹ ابھرتی تھی تو مجھے گھن آجاتی تھی۔ لیکن میں اس گھن کا جواب مصنوعی سکراہٹ سے دیتا تھا۔ میرے پاس اپنا کچھ بھی نہ تھا، جو کچھ تھا، میرے مداحوں کا دیا ہوا نفع تھا۔

میرے جنم دن کی خوشی میں رات کو عوام نے یعنی جوائے ہوٹل کے۔ ایک سیٹھ ٹھیکہ پر سادے عوام یعنی سیٹھوں و وزیروں، سمگلروں اور دھارکے نیتاؤ کو ایک سادہ اور خاموش ڈنڈ دیا۔ جس میں سبکی سپرے کے ٹیکھے۔ دھکی اور پردے کے باہر منگ کی دال اور مرغ مسلم شامل تھے۔ سیٹھ ٹھیکہ پر سادے کے ہوٹل کی بدعنوانیوں کے خلاف جب دو سال پہلے میں نے ایک عوامی اندولن شروع کیا تھا، اس وقت سے وہ میرا مداح بن گیا تھا۔ ڈنڈ کے بعد میں نے سیٹھ ٹھیکہ پر سادے کے ساتھ فوٹر کھینچوایا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس فوٹر کی بدولت اپنے معزز کاہلوں کو بلیک میل کرے گا۔

میں اس بلیک میل کی انیٹ سے انیٹ بجا سکتا تھا۔ لیکن اندولن کے دوران اس کی تیسری بیوی میرے پاس سمجھوتے کا فارمولا کر آئی تھی۔ وہ

کم بہت بے حد خوبصورت تھی۔ کسی عورت کو اتنا بھی خوبصورت نہ ہونا چاہیے کہ پورے کا پورا سوشلزم اس کے سامنے سرسیدہ ہو جائے!

ڈنر کے بعد سکرٹری نے اعلان کیا کہ عوام کے محبوب نیا شرمی لپاٹیاچی کو جو سادہ تختے موصول ہوئے ہیں وہ جھگی جھونپڑی والوں کی بہبودی پر خرچ کئے جائیں گے۔

ایسا اعلان میرے گزشتہ جنم دن پر بھی کیا تھا۔ ہر دوسرے اعلان کا حشر پہلے اعلان کا سا ہوتا ہے۔ جمی جھونپڑی کے کالے کلوٹے ادھ ننگے بچوں کے نصیب میں تو دو دولٹو لکھے تھے۔ حالانکہ ان میں سے کئی بچے اکتوبر مہینے میں ہی پیدا ہوئے تھے۔

۱۳ نومبر

شاید یہی چودہ نومبر کا دن تھا۔ آج سے چودہ برس پہلے میں نے اپنے بچے ہرے جوتے اور پچھلے ہوئے پاجامے کے ساتھ ایک جلے میں اخبار ”دین بندھو“ کی چودہ کاپیوں کو آگ لگا کر کھنکھائی تھی۔ اور اسی راستہ کو اخبار ”دین بندھو“ کا کنٹرول مالک لالہ بھگت چند اپنی چمکیلی کار پر میرے تنگ رتاریک کوارٹریں یوں کیا تھا جیسے کرشن بھگوان سداياں کے گھر آئے ہوں! اور ایک ہزار روپے کے کرنسی نوٹ میرے میلے کچیلے تکیہ پر رکھتے ہوئے کہا تھا: ”پاٹیاچی! آپ سچ ایک ایک آتش بیان مقرر ہیں۔ لیکن افسوس! کہ اس اسمبلی کے دسٹ میں جوہر قابل کی قدر نہیں ہے۔ آپ دینا ہیں اور سہارا اخبار ”دین بندھو“ ہے۔ یہ ایک ہزار روپے کی تچہ مہینٹ ”دین بندھو“ کی طرف سے قبول فرمائیے اور اپنے ’نئے پانچاھے سلوا لیجئے۔“

”تم مجھ کو نوٹ دے کر میرا صغیر خریدنا چاہتے ہو؟“ میں نے گرج کر

کہا تھا ان دنوں میں کافی اہم تھا)

مگر لالہ کلبگتی چند ضمیموں کا گھاگ بیوپاری تھا، میری جاہل انقلابی شمشیر کہ بلند بانگ دعوے سے دل برداشتہ تھیں ہوا۔ میری چٹھی پر مشفقانہ تبصری دیتے ہوئے مسکرا کر بولا، فوجوان انقلابی! دیش کے کروڑوں مفلس ہتھاری رہنمائی کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر دیش کا افلاس دور کرنے سے پہلے اپنا افلاس دور کرو۔ درنہ دو چار سال بعد ہتھاری یہ بھوک اور تاریکی اور غلامت ہتھاری ہڈیاں چاٹ جائے گی۔

اس ایک سزا رو پے کو تم ملٹی پریز ڈٹا منتر کی گویاں تصور کرتے قبول کر لو یہ کہ وہ چلا گیا۔ ڈٹا منتر کی گویاں میرے غلیظ سرانے کے اندر گھٹے چھوڑے لی، لی کے جراثیم کو مارنے کے لئے پڑی رہ گئیں، میرے ایمان کی مضبوط دیوار کی پہلی اینٹ گر چکی تھی۔ غصے اور بے بسی کے طے حملے تاثرات ساری رات بیداروں کی طرح میرے خوابوں میں دھنیا زرقن کرتے رہے۔ لیکن جب دوسری صبح بیدار ہوا تو اخبار ”دین بندھو“ کا تاڑہ پرچہ میرے سامنے پڑا تھا جس میں جلی عنوان کے ساتھ ریختر درج تھی :-

”عوام کے محبوب رہنما مشری لپاڑیا کی گرفتاری آج متوقع ہے۔“ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ کل جتنا کھانا تھ ملنے کے اندر عوام کے محبوب تریبی رہنما مشری لپاڑیا نے ریشمی کپڑوں کی ایک گانٹھ کو چراگ لگائی تھی، اس سلسلے میں سرکار کی طرف سے ان کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کئے جا چکے ہیں اور آج کسی وقت بھی ان کی گرفتاری متوقع ہے۔ مل وکروں میں ان کی گرفتاری کے بعد کتنا غیض و غضب پھیل سکتا ہے؟ اس کے متعلق سارے شہر میں چمیک رہی ہیں۔ مل کے ارد گرد دفعہ ہمہ انگاہی گئی ہے۔“

گویا لاد بھگتی چند نے میری مشہرت اور میری لیڈرئی کا شاندار آغاز کر دیا تھا میرا سر بارے احسان کے اخبار تو بن بندھو کے اور پر جھلک گیا اور مجھے زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ اخباروں کی آزادی صرف ایک پرفریب جمہوری طلسم ہے اور یہ دنیا غمیروں کی خرید و فروخت کی ایک ہیٹ بڑی منڈی ہے۔ اور میں بھی منڈی کی ایک جنس ہوں۔

آج چودہ برس بعد لاد بھگتی چند میرا لنگوٹ باندھا دوست بن چکا ہے اور آج جب بھی ہم دونوں اس واقعہ کو یاد کرتے ہیں تو ہم خوشی کے آنسو بہاتے ہیں۔ ہاں، آج چودہ نومبر ہے اور میں اپنی ڈائری میں یہ چند الفاظ خوشی کے آنسوؤں کی طرح بہا رہا ہوں۔ اور اپنے اس بھٹے ہوئے پاجامے کو الماری سے نکال کر سوچ رہا ہوں۔ یہ پاجامہ آج بھی موجود ہے۔ سندھوستان کے افلاس کی طرح اور افلاس آج بھی سندھوستان میں زندہ ہے۔ اگر چودہ نومبر کو میں اخبار تو بن بندھو کے پرچوں کو لگا رہ لگاتا تو اس پاجامے کوئی۔ لی کے جراثیم چاٹ چکے ہوتے۔ چودہ نومبر زندہ باد! افلاس کے پاجامے پائینڈ باد!!

۳۰ دسمبر

کچھ دنوں سے زندگی بہت ڈل ہو رہی تھی، نہ کوئی شہ گامہ تھا نہ شور و مشر۔ سیٹھ ٹھیکنگا پر ساد کی حسین ترین بیوی بھی پیرس کے سیر سپاٹے پر چلی گئی تھی اور مجھے داغ جبرائی دے گئی تھی۔ غلطی میری اپنی تھی۔ میں نے ہی اسے سندھوستانی سنگیت کاروں کی ڈبلی گمش میں شامل کر دیا تھا۔

حالانکہ وہ علم موسیقی میں پرائمری پاس بھی نہ تھی۔ لیکن میرے جن کے تاروں کو کبھی کبھار جھپڑ دیا کرتی تھی۔ اس لیے اس کے سنگیت کار ہونے میں کوئی شک

وہ چلی گئی اور مجھے سرکاری کاموں کے بیابان میں تنہا چھوڑ گئی۔ میں نے اپنی تنہائی اور اداسی اور جدائی کا غم دور کرنے کے لئے ایک نیا مشورہ کھڑا کر دیا۔ سہرے کے ایک ویران ٹیلے پر ایک ذلیل سا چھوٹا سا مندر بنایا ہوا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس مندر میں بھگوان رہتا ہے۔ میں نے اپنے ایک جنونی دوست کے ہاتھوں سے گروا دیا اور بھگوان کا بھگوان مندر بنوا کر پڑا۔

مندر گرنے کی خبر سے بھگوان کے ہزاروں بھگت پاگل ہو گئے۔ مندر سے جھاگ بہانے لگے۔ انھوں نے جوش اور غصے میں دوسرے ہی دن مندر کی تعمیر پھر شروع کر دی۔ دوسری طرف سے خدا کے پرستاروں نے بھی خدا کی حفاظت کے لئے جھنڈے اٹھائے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اس مندر کے نیچے ایک پرانی مسجد دی پڑی ہے اور کہ ہم اس مسجد میں رہے ہوئے خدا کو باہر نکالیں گے۔ دونوں طرف سے حقوق کی جنگ شروع ہو گئی۔ صبح کو مندر کی دیوار کھڑی ہو جاتی، دوپہر تک مسجد کی دیوار اور شام تک پھر مندر ابھرنے لگتا۔ بھگوان اور خدا آپس میں گتھم گتھا ہوتے۔ لگے میری اداسی اور ڈول زندگی میں ایک شہکار، ایک رونق پیدا ہو گئی۔ میری پیرس میں گئی ہوئی حسین محبوبہ کا عارضی نعم البدل مجھے مل گیا۔

حبِ صورت حالات نازک ہونے لگی۔ قومیں نے تین شہکار می اقتدار مات کئے۔ (۱) فریقین کے نام صلح اور تسلی کی دھتاک اپنی جاری کر دی (۲) دونوں طرف کے دہکروں کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ (۳) پیرس میں اپنی حسین محبوبہ کو ٹیلی گرام بھیج دیا: "ڈارنگ! سارا شہر فساد کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ دن بھر جگا دوڑ رہا ہوں۔ تم لوٹ آؤ تو اس فساد کو دیکھنے والے شہکار سے جی سکون اور سرور کے چند لمحے میسر آ جائیں۔"

میری امن کی اپنی اور شیلی گرام دونوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ تناؤ اپنے حروج پر ہے۔ اعدا اور بھگوان دونوں خاموش تماشائی ہیں۔ لاکھیاں اور گولیاں چلائی جا چکی ہیں۔ کل سے سارا شہر ہڑتالی پر ہے کالج دن بھر میاں ہڑتال زدہ شہر کا دورہ کیا۔ ایک امن کمیٹی بنادی گئی ہے جس میں فریقین کے فساد رستہ شامل ہیں۔ دونوں طرف کے فساد رستہ میرے عقیدت مند ہیں۔ میں ایک انکوائری کمیٹی بنا کر اسے متنازعہ جگہ کی تاریخی ریسرچ کرنے کا حکم جاری کر دیا ہے۔

فیصلہ کرنا دشوار نہیں ہے۔ مگر میں ابھی پیرس سے شیلی گرام کے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔

۱۰ دسمبر
پیرس سے شیلی گرام آگیا ہے۔ (ماریوسی)
انکوائری کمیٹی کی رپورٹ بھی آگئی ہے۔ (ایک طرف ہے)
اس دوران میں فساد فریقین کے پانچ آدمی ہلاک ہو چکے ہیں۔ سرکاری اطلاع ہے۔ غیر سرکاری اطلاع میں ہمیشہ مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے نہ جانے سرکاری طور پر آدمی زیادہ کیوں نہیں مرتے؟

شنگدل مجبور بنے واپس آنے کی بجائے مجھے پیرس آنے کی دعوت دی ہے اس نے حکم دیا ہے کہ مندر اور مسجد کا فیصلہ قرار کر دو۔ سیاسی فیصلے حیاتوں کے حکم سے کئے جاتے ہیں عجیب دنیا ہے۔ عجیب سیاست ہے۔

لیکن میں ابھی تک الجھن میں ہوں۔ میرے کچھ مخالف لیڈر انکوائری کمیٹی کی رپورٹ مطالعہ کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کل مظاہرین کا ایک مجموعہ اپوزیشن لیڈر شری گورکھ ناتھ جی کی قیادت میں میری کونسل کے باہر نعرے لگاتا رہا اور میں

اندر بیٹھا اطمینان سے شیل دیشن دیکھتا رہا۔ آج رات میں مٹری گورکھ ناتھ کو ڈنر پر بلا رہا ہوں۔ اسے پھیل کے پکوڑے بہت پسند ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتا ہے۔ پھیل کے پکوڑے عوام کے گوشت پرست سے زیادہ لذیذ ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے ڈنر کی مستی میں ہم مسجد اور خدادادوں کا فیصلہ کر لیں گے۔

۱۲ دسمبر

گورکھ ناتھ کے ساتھ میرا سمجھوتہ نہیں ہو سکا وہ کم بخت اس معاملے کو طول دینا چاہتا ہے۔ کچھ اور زحمتی، کچھ اور گرفتاریاں، کچھ اور قتل، کچھ اور بے وقوفیاں جو عوام کی طرف سے سرزد ہوں اور وہ ان بے وقوفیوں کے بل بوتے پر میرے سر سے تاج اتارے اور خود پہن لے۔

کیوں نہ ہوں وزارت سے استعفیٰ دے دوں اور اعلان کر دوں کہ اس زمین پر مندر کا حق ہے اور میں مندر کی دیواروں میں اپنی ہڈیاں چنوا دوں گا۔ میرا لہو اور میرا گوشت مندر کی تعمیر میں لگا دیا جائے، اس سے دو فائدے ہوں گے (۱) گورکھ ناتھ کی تقدیر بھڑک جائے گی۔ کیونکہ وہ بھی مندر کے حق میں مٹرو غل مچاتا پھرتا ہے۔ میرے میدان میں اترتے ہی لوگ گورکھ ناتھ کو بھول جائیں گے (۲) مندر کی حفاظت کے لئے جو دولاکھ روپیہ چہرہ جمع ہو چکا ہے۔ وہ میری تحویل میں آجائے گا۔

لیکن مسجور بچاؤ کمیٹی کا کیا رد عمل ہو گا۔ کیونکہ اس کمیٹی کا صدر بھی میرا فرشتہ ہے اور وہ اب تک مجھ سے پچیس ہزار روپے لے چکا ہے۔ اور پھر وہ میرا سچا و قدار بھی ہے۔

بڑی الجھن ہے۔ ابھی مجھے کچھ اور سوچنا چاہئے، کچھ اور انتظار کرنا چاہئے۔

کامیابی - مسرت - فرائض !

منٹا زعمہ جگہ کا حل تلاش کر لیا گیا ہے ، ریسرچ کمیٹی کی رپورٹ میں ایک سببی خیز تہدلی کر لی گئی ہے کہ یہاں مندر اور مسجد سے پہلے گولے رہا کرتے تھے ۔ اس لئے اس جگہ پر گائیڈوں کی پرورش و پروا خست کی جائے گی اور عوام کو خالص ، پاکیزہ دودھ بازار سے بچپس فی صدی رعایتی قیمت پر سپلائی کیا جائے گا۔ ریسرچ کمیٹی کے پانچ ممبروں نے پانچ پانچ ہزار روپے لیکر تسلیم کر لیا ہے کہ مشری لپاٹیا سہم سے زیادہ بہتر مورخ ہیں۔ انھوں نے رپورٹ میں ریڑھیم بھی منظر رکھ کر لیا ہے کہ اس جگہ کی کھدائی کے دوران ایک گائے کا ہڈی بھی ملے گی۔ اور دودھ دوجینے والا برتن بھی ۔

آج شام کو عوام کا ایک بھاری جلوس نکل رہا ہے جو گومشالہ بنانے کے حق میں ہوگا۔ عوام کو منگے خدا کی ضرورت نہیں، سستے دودھ کی زیادہ ضرورت ہے !

کل صبح سرکار کی طرف سے ایک فراخ دلانہ پیش کش کی جائے گی کہ مندر اور مسجد کی تقدسی کو برقرار رکھنے کے لئے گومشالہ کے دائیں اور بائیں طرف کی زمین الاٹ کر دی جائے گی اور تعمیر کا سارا خرچ سرکار ادا کرے گی ۔

فریقین کے دو بڑے رہنما میرے ہاتھوں سے مجوس کے گلاس پی کر کل صبح اپنی بھوک ٹھہرنا ختم کر رہے ہیں۔ اپنے ہی عزیز ہیں۔ بڑے فرما نبردار ہیں۔ میں کل صبح ہوائی جہاز سے پیرس کی طرف پرواز کر رہا ہوں۔ اس اندولن کی تکان مٹانے کے لئے محبوبہ کی آغوش بہت ضروری ہے۔ اگرچہ سرکاری طور پر میں فرانس میں بندوں کی ایکپورٹ کے مسئلے میں گفتگو کرنے جا رہا ہوں ۔

ایک بابو کی ڈائری

۲ مئی ۱۹۷۰ء

کل میڈیٹر ٹھیکہ رام چھپیکا مل کے مالک بھیکا چند نے مجھے خوش کرنے کے لئے ۱۹۷۰ء کی ایک ڈائری عنایت فرمائی۔ کیونکہ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ ریلوے کے گڈس پارسل کلرک بھیجنا تھا جسے آپ کا "مناسب" تعارف کرا دوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے لفظ "مناسب" پر خاص زور دیا تھا۔ ایک لفظ کے بدلے میں ایک ڈائری مل جاتی ہے۔ مارکیٹ میں لفظ بھی بکتے ہیں۔ گفتی پیاری دنیا ہے۔ گفتی پیاری مارکیٹ ہے!

منا ہے، ہر بڑا آدمی ڈائری لکھتا ہے، مجھے شک ہو گیا ہے کہ میں بڑا آدمی ہوں یا بنتے والا ہوں۔ حجب میں چھوٹا سا تھا تو میرا والد کہا کرتا تھا۔ "میرا بٹیا بڑا ہو کر سمبھاش بابو بنے گا۔" والد کی دعا کا فغنی فغنی اثر ہوا۔ یعنی میں سمبھاش بابو تو نہ بن سکا۔ صرف بابو بن گیا۔ مجھے اس لفظ بابو سے سخت نفرت ہے۔ رکشا والا، تانگے والا، قلی، چراسی سمبی مجھے بابو کہہ کر بلاتے رہیں گے میں بڑا آدمی نہیں بن سکتا کسی نے مجھے بتایا کہ بابو لفظ "بابو نہ" سے نکلا ہے جس کا مطلب "بندر" ہے۔ میں نے جب بھی آئینہ دیکھا ہے مجھے بندر کہیں دکھائی نہ دیا جس دن مجھے اپنے اندر بندر نظر آ گیا میں خود کشتی کھیلوں گا۔

میری بیوی ادھر آ رہی ہے۔ بندر کی بیوی! حجب یہ دہن بن کر آئی یعنی تو بالکل غلط سارٹہ بالو معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اب چھ مہینے سات سال میں "سلم ایریا" بن کر رہ گئی ہے۔ میرے خیال میں مجھے ڈائری لکھنا بند کر دینا چاہئے۔ کیوں کہ وہ مجھ سے آگے کہے گی۔ اے میرے چار بچوں اور پانچویں امیدوار بچے کے ڈیڈی! اپنے اس بچے کو ڈائنو یہ اپنی نئی قمیص پہنا ڈالیا ہے اور اسے یہ وارننگ بھی دے دو

کہ اسے تختہ زارہ کرنے تک شکار رہنا پڑے گا۔

۶ مئی ۱۹۷۰ء

آج سارا دن بے حد مصروف رہا۔ مالک مکان آٹھویں بار مکان خالی کرنے کی دھمکی دیئے آیا۔ آدھ گھنٹہ تک اسے گالیاں دیں اور گالیاں کھائیں گالیاں کھانے کی دھمکی دے اس کا دوبارہ دورانِ نفعہ بچے کو بدل میں سے دودھ بھی پلاتا رہا کیونکہ میری سلم ایریا برہم کاریوں کے سبب سنگ میں بھگوان کے ساتھ براہ راست تعلقات قائم کرنے لگی ہوئی تھی۔ خاوند گالیاں کھاتا ہے بیوی سب سنگ کرتی ہے جب وہ لونی تو میں نے مالک مکان سے جتنی گالیاں کھائی تھیں، وہ بیوی کے حلقہ میں اندلیں دیں۔ دفتر میں جا کر بڑے صاحب سے جھڑپ ہو گئی۔ اس نے دھمکی دی کہ تمہارے خلاف ان ایجنٹ شین کی کچھ رپورٹیں آئی ہیں۔ مالک مکان مجھے دھمکی دیتا ہے۔ میں بیوی کو دھمکی دیتا ہوں۔ بیوی بچوں کو دھمکی دیتی ہے ہر ٹراہر چھپے کو دھمکیوں تلے پیتا جا رہا ہے صاحب بڑا ہے، میں چھوٹا ہوں اگر ڈگری چھٹ گئی، اگر بیوی برہم کاریوں کے ساتھ بھاگ گئی، میں ڈر گیا صاحب سے وعدہ کر لیا کہ میری زندگی کا مکمل کی دکان سے آپ کے مکان کے لئے ایک من لوہے کا سر پالا دوں گا۔ بیوی کو ٹیلیفون کر دیا کہ فی الحال برہم کاریوں کے ساتھ بھاگنے کا پروگرام ملتوی کر دو۔ مالک مکان کے گھر جا کر منت سماجت کی کہ میں رشوت لینے کا شیک کام شروع کر رہا ہوں اور ڈیوڑھا کر ایہ ادا کیا کروں گا۔ اور کیا کرتا۔ تین سو روپے ماہانہ پانے والا بالودلت آمیز سمجھوتوں کے سوا اور کر بھی کیا کر سکتا ہے۔

سارا دن سچھوٹے کرتا رہا۔ شام کو کلرگوں کی ریلی میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتا رہا۔ اس کے بعد میں کی شاننی کے لئے ایک بھگوانی جاگرن میں شریک

ہوا۔ اس وقت غید نہیں آرہی ہے۔ اس لئے ڈائری نگہ رہا ہوں۔

۱۰ مئی ۱۹۷۰ء

آج کوئی خاص گھٹنا یا دلگھٹنا نہیں ہوئی۔ اینوار کی چھٹی مہتی، اس لئے دن بھر اتنا سہٹ رہی۔ میری کے ساتھ قلم دیکھنے کا وعدہ کیا اور توڑ دیا، سانس کھیلنے والے کچھ کلرک یا لو آگئے۔ وہ جہاں کھیلنا چاہتے تھے۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میں نے اپنے کیرئیر کی تعمیر شروع کر دی ہے۔ اس لئے جواز کھیلوں گا۔ انہوں نے مجھے جو روکا غلام کہہ دیا۔ میں نے قبول کر لیا۔ شام کو تفریح کے لئے بچوں کو لے کر میرینل پارک میں چلا گیا اور ان کے ساتھ گھاس پر بیٹھ کر مرنگ بھیاں کھانا رہا۔ کئی ہینڈل بچوں نے اعلان کیا کہ تم ہمارے ڈیڑی ہو۔ مونگ بھیاں، اور میرینل پارک صرف دو چیزیں ایسی ہیں جہاں ان کو ڈیڑی بنا دیتی ہیں میں نے جب بچوں کو اپنے اوپر اتنا مہربان دیکھا تو انہیں ان کی مٹی کے خلات بھڑکانا رہا۔ اور ان میں سے ایک بچے نے تو مجھ سے وعدہ بھی کر لیا کہ آئندہ مٹی کے راز رہاؤں سرسبتہ آپ کو بتا دیا کروں گا۔

۱۳ مئی ۱۹۷۰ء

گذشتہ کئی دنوں سے محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے گھر کے سامنے والی چھت پر ایک نوجوان لڑکی ٹھیک اس وقت بال بکیرے آکھڑی ہوتی ہے۔ جب میں دفتر جانے لگتا ہوں وہ زلفوں کو کسی رقا صم کے انداز میں جب چھٹکا دیتی ہے تو میرے دل میں گھنگھروں کا اٹھتے ہیں۔ شروع شروع میں تو مجھے لگا ہی ملائے کی جرات نہ ہوئی کہیں کہ ایک تو میں کلرک ہوں۔ دوسرے محلے والے میں مجھے شریعت آدمی کہتے ہیں اور تیسرے یہ کہ پیار کرنے کے لئے ٹائم چاہئے۔ میرا ٹائم دفتر کے لئے مخصوص ہے۔ پیار کرنے کے لئے نہیں۔ لیکن ایک دلی تنگ آکر میں نے اسے ہاتھ سے

سلام کر دیا۔ وہ کنجشٹ مسکرا دی۔ اس مسکراہٹ نے میرے اندر کا سادہانہ نظام اتقل متقل کر دیا۔ اس دن میں پر سوار ہوتے وقت اچانک اس کی مسکراہٹ یاد آگئی تو میں سے پاؤں پھسل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روٹی کا ڈبہ تو میں کے اندر چلا گیا۔ اور میں بس سے باہر رہ گیا۔

بیوی نے پوچھا تھا: ”ڈبہ کہاں گم کرائے؟“ میں نے جواب دیا: ”چرک ہو گیا۔“ اب میں اسے کہہ جاتا کہ سامنے وہ جوزلفوں والی سائولی سلونی لڑکی رہتی ہے۔ ڈبہ اسی نے چرایا ہے۔

آج صبح وہ سائولی سلونی لڑکی حچیت پر نہیں آئی۔ میرا دل ڈوبنے لگا، جی چاہا، آج محبہ محروم دیدار کو دفتر نہ جانا چاہئے۔ کئی منٹ تک اس سائولی چاند کے طلوع ہونے کے انتظار میں سرک پر کھڑا رہا۔ میرا چھوٹا بچہ بالکونی سے مجھے ”بائی بائی“ کرتا رہا۔ بچے کی اس حرکت سے گہرا کر مل دیا۔ جاتے جاتے ایک ٹھنڈی آہ محبہ کی حچیت کی طرف پھینک دی۔ سارا دن دفتر میں طبیعت مضطرب رہی۔ کسی کام کو جی نہ چاہا۔ شام کو اور ٹائم پر بھی کام نہیں کیا اور جلدی گھروٹ آیا کیا دیکھتا ہوں۔ کہ چاند میرے گھر کی بالکونی میں اتر آیا ہے اور میری بیوی کے ساتھ غیر رومانی باتوں میں مصروف ہے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکا جیسے باہر نکل کر محبہ کے قدموں پر جا گرے گا۔ میں نے جلدی جلدی بیوی کی آنکھیں بچا کر محبہ سے آنکھ ملائی۔ ایک خاموش مدد میری مسکراہٹ نے جواب دیا: ”بائی بائی“ بعد میں بیوی نے مجھے بتایا کہ ان لوگوں کا تبادلہ کانپڑ ہو گیا ہے اور کل جا رہے ہیں۔ عجیب محبہ ہے۔ اتنی جلدی بائی بائی کرنا تھا تو مسکرا کر کہیں دیکھا تھا ابھی تو خاموش پیار گفتگو کی منزل میں تھا۔ لبوں کو جنبش تک نہ ہوئی تھی۔ محبت کے دو لبوں کا تبادلہ تک نہ ہوا تھا۔ اور تم چلی گئیں، اتنا مختصر پیار! اس سے پہلے کہ میں

جرات اٹھا کر وہ، انداز گفتا سچوں، تم باہیں چھوڑ کر بھاگ گئیں !

اب تو ڈائری لکھنے میں لطف آئے لگا تھا۔ اب کیا فائدہ ڈائری لکھنے کا سوچ رہا ہوں ڈائری کے باقی صفحے میسرز ٹینگ کا مل کو لٹا دوں۔ اس پیار میں میرے دو نقصان ہوئے۔ ایک تو دل ٹوٹ گیا اور دوسرے دلی کا ڈبگم ہو گیا۔

۱۲ مئی ۱۹۷۰ء

آج صبح ریشمیں زلفوں والی محبوبہ اپنی فیملی کے ساتھ شکیسی پر سوار ہو کر روانہ ہو گئی۔ میں نے عینک لگا کر اس کی طرف دیکھا۔ میرا خیال ہے وہ اداس تھی میری عینک بہترین کوالٹی کی ہے، جھوٹ نہیں بولتی۔

میں نے آج اس کے سچ میں تڑپنے کے لئے دفتر سے چھٹی لے لی۔ اس کے جانے کے بعد بہت کچھ آیا کہ اس سے کا پور کا ایڈریس ہی پوچھ لیتا۔ میرا سب کچھ چھپن کر لے گئی۔ کم از کم اس کا ایڈریس تو میرے پاس رہ جاتا۔ سا رادن اپنی اس بے وفائی اور محبوب کے مستقبل پر ابھی بھرتا رہا۔ آج ہی بھرنے کے دوران میرا بڑا سانا آ گیا۔ اس کے ساتھ انتہائی نوا اور بے معنی باتیں کرتا رہا۔ وہ اپنی بہن کو چند دن کے لئے لینے آیا تھا۔ مہلے بچو ششی اجازت دیدی بچے اپنے انکل کو دیکھ کر مجھے بھول گئے ایک تو محبوب کا بھرا اور اب بیوی کا بھرا۔ ایک میں آہیں ہیں دوسرے میں حسرت ہے۔ اس وقت بیوی بچے میرے سائے صاحب کے ساتھ سفید دیکھنے کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ اور میں گھر میں تنہا ہوں۔ یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ بار بار رنگا ہیں اس محبت کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ جہاں کہیں رقص لہرایا کرتی تھیں آج ایک گوا بٹھا کائیں کا میں کر رہا ہے۔

اور میں سوچ رہا ہوں اب جبکہ دھماکے کے امکانات تار یک ہو گئے ہیں اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کوئی اور شغل اختیار کروں۔ رشوت کا کام ہی شروع کر دوں۔ محبت نہ سہی رشوت ہی سہی۔ دل دومانے کے لئے کوئی سہگامہ نور نہا ہی چاہئے

آج مندرجہ ذیل کارہائے نمایاں سرانجام دئے۔

- ۱۔ گھر کی چار پائیزوں کی دودھیتیں کس دیں۔
- ۲۔ راشن کارڈ کی تجدید کروائی اور گھر کے پانچ افراد کی بجائے چھ افراد لکھوائے۔
- ۳۔ بلیک میں بنیاستی گھسی کا ایک ڈبہ خرید لیا۔
- ۴۔ دفتر سے شیٹری چرائی۔ بچوں کے کام آئے گی۔
- ۵۔ ایک دوست سے دس روپے ادھار لئے۔ کیونکہ تنخواہ ختم ہو چکی تھی یہ دس روپے لوٹانے کا ارادہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس دوست نے دو سال پہلے مجھ سے پانچ روپے ادھار لئے تھے۔ لیکن ابھی تک نہیں لوٹائے تھے۔
- ۶۔ بیوی کو اس کے میکے میں ارجنٹ خط لکھا کہ اسے لوئیر سمیج کر جدیدی لوٹ آؤ۔ تمہارے بھرنے مجھے دو کوڑی کا نہیں رہا۔
- ۷۔ اپنے ایک ساتھی کلرک کے خلاف بڑے صاحب کو چٹھی لکھی کہ وہ ہر روز دفتر آکر صرف حاضری لگاتا ہے اور پھر بھاگ جاتا ہے تحقیق کی جائے۔ اس چٹھی کے نتیجے میں نام نہیں لکھا۔ اس کلرک نے بھی میری شیٹری چرائے کی رپورٹ کر دی تھی۔
- ۸۔ گھر لوٹے وقت بس پر سوار ہوا۔ ریش زیادہ تھا اس لئے میں نے کنٹرکٹر سے ٹکٹ لینا مناسب نہ سمجھا۔
- ۹۔ فروٹ مشاپ پر اگر بھلوں کا ریٹ پوچھا، خریدے نہیں کیونکہ حسب سابق بے حد مہنگے تھے۔ گھر آکر ایک "لیٹر ٹوڈ" ایڈیٹر لکھا کہ مہنگائی نے ہم کلرکوں کی کمر توڑ دی ہے۔
- ۱۰۔ ایک بی بی کو ماراجی بیوی کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر دودھ پینا چاہتی

مکتی بالکیں ڈنڈا پی کے بجائے دودھ کی کڑاھانی کو جالگا۔ دودھ والٹ گیا۔ نہ بکلی کے کام آیا نہ میرے۔ میں اور بلی دونوں بہت دیر تک کھتے انوس ملتے رہے۔

۲۵ مئی ۱۹۷۰ء

کل سے اہلیہ محترمہ تشریف لے آئی ہیں۔ کہتے ہیں انہوں نے دوا اچھ سنسی خیز خیریں سنائیں۔ ایک یہ کہ بڑا برخوردار عزیز از جان دیش چندرجا کھیلتے ہوئے پس کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا۔ بہت مشکل سے نانا جی کے دسوخ کی بدولت معافی مانگ کر رہا کر دیا گیا اور دوسری خبر یہ کہ پانچویں عزیز از جان کی ڈلیوری کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ لہذا باادب یا ملاحظہ ہو شیار!

میں نے بیوی سے دست بستہ عرض کی کہ جہاں تک جو کمے کے کس کا تعلق ہے وہ ننھیاں سے درختے میں عنایت ہوا ہے۔ سنا ہے برخوردار کے نانا بھی بالکل اسی عمر میں جرا کھیلتے ہوئے حوالہ است، تشریف لے گئے تھے۔ اس لئے تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

اور پانچویں برخوردار کی ڈلیوری کے سلسلے میں عرض یہ ہے کہ فیملی پلاننگ کے اصول توڑنے کا یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ہمارے بطن سے جوئے باز پیدا ہو رہے ہیں جس سے دلشی کا مستقبل خطرے میں پڑ رہا ہے۔ اس لئے ہر صبح بیدار ہوتے ہی چوک میں ٹنگنی ہوتی فیملی پلاننگ کی لائن کوں کی طرف دیکھا کرو۔ متوجہ جانے کی بجائے لائن کوں کی طرف دیکھنا زیادہ مفید ہے۔

ان دونوں سوالوں پر بیوی سے ان میں ہو گئی ہے۔ آج رات کا کھانا نہیں پکایا گیا۔ کھانا نہ کھانے سے میری آئنا ٹری شفا ت ہو گئی ہے۔ اور میں گوتم بدھ کی طرح آج رات کو روانہ کی تلاش میں کھاگ جانا چاہتا ہوں،

افسوس باکر میں گوتم بدھ نہ بن سکا۔ کیونکہ فرار کی اس رات کو اچانک میری آنکھ لگ گئی اور صبح اس وقت کھلی جب میری میویری میرے پلنگ کے پاس چائے کا گرم گرم کپ لے کھڑی تھی۔ اس نے رو رو کر مجھ سے معافی مانگی جو میں نے معاف کر دی اور پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھایا کہ ہم دونوں زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اس لئے الگ نہیں ہو سکتے۔ روکھی سوکھی کھا لیں گے۔ لیکن دنیا کے سامنے رسوا نہ ہوں گے۔ ہمارا مطلب یقیناً یہی تھا کہ ہم اپنی ہی نگاہوں میں رسوا ہوتے رہیں تو کوئی ہرج نہیں جیسا نصیب میں کمر کی لکھی ہے تو پھر کیا گوتم بدھ اور کسی غارتہ جنگی؟

گوتم بدھ نے آج دورو پے رشتوں لی اور بچوں کے لئے خربوزے اور خالے خربوزے لایا۔

کل میں تنخواہ ملی تھی تنخواہ سے زیادہ مسرت انگیز چیز یہ تھی کہ نئے عمریڈ مقرر ہو جانے کے بعد گزشتہ ایک سال کا "ایریئر" (بقایا) کا روپیہ مل گیا میں نے بیوی کو چھپی رنگ کی ایک نئی ساڑھی لے دی جسے پہن کر وہ یوں معلوم ہوتی تھی جیسے پہلی رات کی دلہن ہے۔ بے اختیار جی چاہا، سنی مرنے مٹانے کے لئے سہل اسٹیشن پر چلا جاؤں لیکن بیوی نے سمجھایا کہ آئندہ سال نہیں گئے۔ اس سال تو ڈسمیری ... ۹۹

لغات فکری

الیکشن — ایک جنگل جو ووٹروں اور بیڈروں کے درمیان ہوتا ہے اور جس میں بیڈرجیت جلتے ہیں ووٹر مار جاتے ہیں۔

الیکشن پیشی — ایک کھبا جسے ہار ہی ہوئی اُعلیٰ نوچتی ہے

ووٹ — چوڑھا کے پُر، جو برسات کے موسم میں نکل آتے ہیں۔

ووٹر — آنکھ کے گر کر مٹی میں رلا ہوا آنسو جسے الیکشن کے دوران مٹی

سمجھ کر اٹھایا جاتا ہے اور الیکشن کے بعد پھر مٹی میں ملا دیا جاتا ہے۔

ووٹرز ڈسٹ جو ہر ہی کی دکان پر لٹکی ہوئی موتیوں کی لڑیاں۔

اصید واس — بڑے بڑے عقلمندوں کو بھی بے وقوف بنانے والا عقلمند

زر ضمانت — کمزریں میں پھینکی ہوئی رقم، جو اکثر ڈوب جاتی ہے۔

انتخابی جلسہ — ایک طنبورہ جس پر بے سرے گائے گائے جاتے ہیں۔

چنا ویدنی ٹیلیو جس میں بعد میں توڑنے کے لئے وعدے کئے جاتے ہیں۔

انتخابی تقریر — الیکشن کے جنگل میں گیدڑوں کا نغمہ کہ میرا باپ بادشاہ تھا۔

انتخابی حیفندے رنگارنگ پتنگوں کی دکان

انتخابی پوسٹر امیدوار کا شجرہ نسب اس کے خاندان کی مکمل تاریخ۔

ڈورڈوڈر کمزربنگ درود کی خاک چھانٹنے کا شوق۔

پولنگ ایجنٹ ۔ امیدوار کا چچ

بوگس ووٹ ۔ ایک جھوٹ جو سچے آدمی الیکشن کے دوز میں برتے ہیں ۔

ایکشن کا خرچہ جو بے پر لگائی ہوئی نقدی

جناؤ کے نتائج لڑائی ختم ہونے کے بعد میدان جنگ میں گنتی کا عمل کر دیا

کتنے ڈھیر ہوئے ۔ (۲) کتنے زخمی ہوئے (۳) کتنے بچ بچ گئے ۔

محبوبہ ۔ ایک قسم کی غیر قانونی بیوی

بیوی ۔ محبوبہ کا انجام

بائیسیکل ۔ کلرک یا نوکری دوسری بیوی

کلرک ۔ ایک گھڑی پر شیر کا جامہ سپن کر کر سی پر بیٹھتا ہے ۔

خدا : ۔ وہم اور حقیقت کے درمیان ڈولتا ہوا پنڈولم

عشق : ۔ ایک معزز قیدی جسے جیل میں ہمیشہ اے کا اس ملتی ہے

کاغذ : ۔ کوڑا ہو تو بے ضرر لکھا جائے تو ضرر رساں ۔

جس وزنگاری ۔ عزت حاصل کرنے سے پہلے عزت کا تجربہ

کھر بھون : ۔ ایک نہر جسے شہر کی طرح مزے لے کر چانا جاتا ہے ۔

سیاست : ۔ پیسے والوں کی عیاشی اور بی پیسے والوں کے گلے کا ڈھول ۔

بیوی : ۔ ایک لطیفہ جو بار بار دہرائے سے باسی ہو جاتا ہے ۔

سچائی : ۔ ایک چور جو ڈر کے مارے باہر نہیں نکلتا ۔

جھوٹ : ۔ ایک بھول جو دیکھنے میں حسین ہے ، کھانے میں لذیذ ہے لیکن

جسے سفیم کرنا مشکل ہے ۔

جمہورس بیت : ۔ ایک مندر جہاں بھگت لوگ چڑھاوا چڑھاتے ہیں اور

پجاری کھا جاتے ہیں ۔

عشق : — خود گمشدہ کرنے سے پہلے کی حالت ۔

غریبی : — ایک کشتیوں میں امیر لوگ پیسے بھینک کر اپنے گناہوں کی
تقدیر کم کرتے ہیں ۔

مشاعرہ : — ایک پرندہ جو عمر بھر اپنا گم شدہ آشیاں ڈھونڈتا رہتا ہے ۔

لیڈر : — دوسروں کے بھیت میں اپنا بیچ ڈال کر فصل اگانے اور بیج
کھانے والا ۔

قبرستان : — مردہ انسانوں کا حال ، زندہ انسانوں کا مستقبل ۔

اصید : — ایک پھول جو کبھی بنجر زمینی کو زرخیز نہادیتا ہے ، اور کبھی زرخیز
زمینی کو بنجر ۔

خوشامد : — کمزور کی طاقت اور طاقت ور کی کمزوری ۔

ڈھائی : — صر جہم ہی جہم ، روح غائب ۔

مراخت : — ایک عینک جسے اندھے لگاتے ہیں ۔

تعلیم : — ان پڑھ لوگوں کو بے وقوف بنانے کا ہتھیار ۔

بھاڑا : — آگ کو پانی سمجھ کر پی جانے والا کم علم

اندھیرا : — شیطان کا گھر جسے خدا اپنے ہاتھ سے تعمیر کرتا ہے ۔

دسونی گھر : — گرمی عزتوں کی راجدھانی ۔

گرمستی عورت : — گرمی مرد کی گاڑی کا پٹرول پمپ

محل : — جھوٹری کے مقابلے پر کھینچی ہوئی بڑی لکیر

طالب علم : — ایک پیاسے سمندر میں دھوکا دے دیا جاتا ہے اور وہ

عمر بھر ڈکیاں کھاتا رہتا ہے ۔

جیب کترا : — ایک شرارتی چمپو کرا جو دوسروں کی بائیسکل میں پی چھو کر

اس کی ہوا نکال دیتا ہے اور بھاگ جاتا ہے ۔

سٹراب : — ایک راستہ جو جنت کو بھیں جاتا ہے اور جہنم کو بھیں ۔

جنت : — ایک خراب

جہنم : — اس خراب کی تعبیر

پیسہ : — ایک چھپکلی جو انسان کے منہ میں آگئی ہے ۔ اور اب اسے

کھائے تو کوڑھی ۔ چھوڑے تو کلنگی ۔

دسیا : — جس کے کنارے گھر بناؤ تو اسے جوٹ آجاتا ہے ۔ اور گھر کو بہا

لے جاتا ہے ۔ لیکن اگر اس میں ڈوبنے کے لئے جاؤ تو ہمیشہ

سور کھاتا ہے ۔

خودکشی : — جائز چیز کا ناجائز استعمال

کدرسیا : — جس پر بیٹھ کر عقل منہ آدمی بے وقوف ہی جاتا ہے ا

نیکی : — جسے پہلے زمانے میں لوگ دریا میں ڈال دیتے تھے ۔ آج کل

منڈی میں برائے فروخت بھیج دیتے ہیں ۔

اخبار : — ایک پھل جو تسکین کے لئے کھایا جاتا ہے ۔ مگر کھاتے ہی

بے چینی پیدا کر دیتا ہے ۔

سیگسار : — رات کا شہنشاہ ۔ صبح کا فقیر ۔

طوائف : — ڈسپوزل کا مال جسے اونے پونے دام پر بیلا م کر کے بیچ

دیا جاتا ہے اور بڑبڑہ چڑھ کر بولی دے کر دوبارہ خرید لیا

جاتا ہے ۔

خدا : — انسان کی وہ کمزوری جس سے وہ طاقت حاصل کرتا ہے ۔

دوست : — دشمنی سے پہلے کی ایک منزل ۔

دشمن : — دوستی کا انجام
 صہمان : — جس کے آنے پر خوشی اور جانے پر اور زیادہ خوشی ہوتی ہے
 ڈاکٹر : — جو بیماریوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے مگر تندرستوں
 کو دیکھ کر مت پرہیز کرتا ہے ۔

حج : — انصاف کرنے میں آزاد مگر قانون کا غلام
 گواہ : — جھوٹ اور سچ کے درمیان ٹکنا ہوا پنڈولم
 یاد : — پُرکھوں کا چھوڑا ہوا پرانا بھی کھانا
 کوشش : — وہ حیرے میں تیر چلانا ۔ لگ جائے تو واہ واہ ! چرک جائے
 تو واہ واہ !

اندھیرا : — بجلی کمپنی کا سرور
 بجلی : — چوروں کا سرور
 چوس : — ایک جیب کا مال دوسری جیب میں منتقل کرنے والا کڑوا
 صاڈر انسان : — جو اپنے سے پہلے زمانے کے ماڈرن کو پرہیز کرتا ہے ۔
 خوسالٹ : — جو حیران کر انسان اور انسان کو حیران بنا دیتی ہے ۔
 انجان : — جو وہ چیزیں نہ جانتا ہو جنہیں جاننے سے دکھ پیدا ہوتے ہیں
 استاد : — بیوقوفوں کو عقل مند بنا کر اپنے دشمن بنانے والا بے وقوف
 کوٹا کڑکٹ : — استعمال شدہ چیزوں کا جنازہ
 جنازہ : — واپسی ٹکٹ
 بیل : — گائے کا بھائی یا بہن
 لنگڑا : — دو پاؤں والوں سے زیادہ خطرناک
 کمزوری : — ایک مردہ جس پر زندہ لوگ حملہ کر دیتے ہیں اور بڑے خوش

ہوئے ہیں۔

سرافندہ :- مردوں کے چھوڑے ہوئے تخت پر بیٹھنے والا حکمران

قتل :- آنکھوں والوں کی اندھی حرکت۔

مکان :- چڑیوں، مکھیوں اور سانپوں کا مشترکہ ایک رہی پیرا۔

مفسس :- جو اگر موجود نہ ہو تو اہل دولت خودکشی کر لیں۔

خودکشی :- چور کی جابے تو ڈکٹری محالہ لفظ کم ہو جائے۔

لفظ :- جرم سے ادا ہو جائے تو باہر جنگ چھڑ جائے، ادا نہ ہو۔

سکے تو اندر جنگ چھڑ جائے۔

مردیض :- جس کے بل بوتے پر دنیا بھر کی میڈیکل کمپیاں حلقی ہیں۔

قبرستان :- لاشوں کی سوشلسٹ سٹیٹ

مردح :- مجھ پر کی مفروضہ مکر۔ جس کے متعلق ایک شاعر نے کہا تھا :-

کہاں ہے اکس طرف کو ہے، کدھر ہے

شاعر :- اندھیرے میں ٹھٹھکتا ہوا ایک چراغ۔

بد صورت عورت :- حسیاؤں کو پرکھنے کا آلہ۔

آدم :- خدا کی وہ غلطی جس کی وہ آج تک تصحیح نہیں کر سکا۔

غلطی :- معاف کر دینے والوں کے لئے ایک مادر موقع۔

موقع :- جس سے ہمیشہ عقل مند لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، اور بیوقوف

لوگ یہ سوچ کر مال جاتے ہیں کہ یہ ہماری شان کے شایاں

نہیں۔

بے وقوف :- دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں بے وقوفوں نے قائم کی ہیں اور

عقل مندوں نے اجاڑی ہیں۔

- عوام :- چرپال پر رکھا ہوا ایک حقہ جسے ہر راگبیر آکر پیتا ہے ۔
- سرمایہ دار :- دوسروں کی کترتوں سے اپنے لئے پتلون تیار کرنے والا
- ایک ماہر ٹیلیوایسٹر ۔
- امن :- وحشی لوگوں کی نیند کا زمانہ ۔
- بوڑھے :- دیوالیہ دکان کے باہر ٹکا ہوا پرانا ساکن بوڑھا ۔
- بکری :- جس کی عقل زیادہ ہے دودھ کم
- بیوی :- محبوب کی بگڑی ہوئی مشکل ۔
- سامنے داس :- ایک رسی جڑوٹ کر بھی سر پر ٹنگتی رہتی ہے ۔
- تھکا :- ٹیکے کل سلوں کا مذاق اڑانے والا ۔
- مقرض :- ایک شہنشاہ ، جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتا ہے ۔
- قرض خواہ :- جو قرض دیتے وقت دوست اور قرض واپس لیتے وقت دشمن
- دھلی :- جہاں مکان بڑے ہیں انسان چھوٹے ہیں ۔
- بھبی :- ایک مندر جہاں سے بھگوان نکل گیا ہے ۔
- کلکتہ :- جہاں کے لوگ دن کو ایک دوسرے سے لڑتے ہیں ۔ رات
- کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گاتے بجاتے ہیں ۔
- حکومت :- کانٹوں کا آناج جسے ہر گناہیننا چاہتا ہے ۔
- عقل :- محبت اور غلوں کا قبرستان ۔
- بے وقوفی :- ایک خزانہ جو کبھی خالی نہیں ہوتا ۔
- پیلا :- عشق کا انجام ، بچوں کا آغاز
- بچے :- ماں باپ کے پیدا کئے ہوئے ماں باپ ۔
- ماں باپ :- بیک وقت بچوں کے حاکم اور بچوں کے غلام ۔

دل :- ایک قبر جس کے نیچے اکثر زندہ مردے دفن کر دیئے جاتے ہیں
 دماغ :- شیطان اور خدا دونوں کا مشترکہ گھر۔
 آنکھیں :- جرم یا ہرے بندہ پر جائیں تو اندر کی طرف کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔

بھاتہ :- جرم بیک دیتا ہے۔ لیتا بھی ہے۔
 پاؤں :- جو دوسروں کو ٹھوکر مارتا ہے۔ خود ٹھوکر کھاتا ہے۔

سود :- دوسروں کا بھلا کرنے کے لئے ایک برائی۔
 بے وفا :- ایک طوطا جسے پستہ کھلایا جائے تو تعریف کرتا رہتا ہے، نہ کھلاتا جائے تو آنکھیں پھیر لیتا ہے۔

وفا دار :- بغیر پستہ کھائے تعریف کرنے والا جاہل طوطا
 خوش قسمت :- ایک لاکھڑی جو جس کے ہاتھ لگ جائے، اسی کی ہو جاتی ہے
 فاسن انکین جینج :- ایک چھپٹی جو سمندر کو خالی کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔
 بدستھی قرضہ :- ایک ڈاکو جو بچے پیدا کرتی ہے۔ اسٹین کھلاتی اور پاتھ پوسنٹا ہے۔ اور پھر خود ہی انھیں کھا جاتی ہے۔

راشن :- بھر کے پیٹ کے لئے یہ مضمی دور کرنے کا چورن۔
 ٹیڈی بوائے :- جو ساڑھی پہن کر مجرماؤں کے دل جیتے۔

ہل اسٹیشن :- صحت مند مر فیڈوں کا ہسپتال۔
 لوہاری :- ایک چاکر، جو ہل اسٹیشن پر نہ جانے کے جرم میں لگا یا جا

عرقِ انفعال

گھلتا کسی پر کیوں مرے دل کا معاملہ
اپنے ہی انتخاب نے رسوا کیا مجھے

کرورپتی بن جاؤ گے

”تم جلدی کرورپتی بن جاؤ گے“

۱۹۳۸ء میں آج سے ۲۵ برس پہلے میں نے یقیناً ایک مشہور جنٹری میں پڑھا تھا۔ جنٹری کا نام پرسدھ گھنڈی جنٹری تھا جسے ملک کے مشہور مددگار جیو تھی پنڈت گھنڈی دیال جی شائع کرتے تھے اور صرف اس لئے شائع کرتے تھے کہ ان کے والد صاحب قبلہ پنڈت پاکھنڈی دیال جی بھی ہر سال جنٹری ہی شائع کرتے تھے۔

اور انھیں پنڈت گھنڈی دیال جی نے ۱۹۳۸ء کی پرسدھ گھنڈی جنٹری میں میری قسمت کا حال لکھتے ہوئے پیش گوئی کی تھی کہ ”تم جلد ہی کرورپتی بن جاؤ گے“، چنانچہ پورے پچیس سال تک میں نے کرورپتی بننے کا انتظار کیا لیکن میری بجائے جب سوسائٹی کے دوسرے رذیل اور اولیٰ اصفت آدمی کرورپتی بننے لگے تو میں طیش میں آ گیا اور فیصلہ کیا کہ گھنڈی لال کے علم جیوتش کے خلاف ایک

میر دست مضمون لکھ ڈالوں۔

اور اس مضمون کے سلسلے میں مجھے ۱۹۳۸ء کی تلاش میں، شہر کے مشہور
 کبارٹی بازار میں پتا گیا۔ ہمارے شہر کے اس کبارٹی بازار کی منفرد خصوصیت یہ
 ہے کہ یہاں قدیم سے قدیم اشیاء بھی بالکل نئی حالت میں مل جاتی ہیں اور پھر یہاں
 کے کبارٹیوں کے پاس دنیا کی ہر نایاب اور نادر چیز موجود رہتی ہے مثلاً ایک دوست
 نے مجھ پر عجیب و غریب انکشاف کیا تھا کہ جاپان سے انھوں نے ایک تخت
 خرید لیا تھا جس پر سکندر اعظم بیٹھا کرتا تھا۔ لیکن بالکل دلیا تخت سپرستان
 کے لئے کبارٹی بازار میں بھی اسے دکھایا گیا۔ جس پر سکندر بیٹھ کر حکومت کرتا تھا۔
 غرض یہ کبارٹی بازار نوادرات دنیا سے بھرا پڑا تھا۔ یہاں وہ ترکش
 بھی موجود تھا جس سے ارجن نے ہما بھارت کی جنگ لڑی تھی، وہ کوزہ بھی تھا
 سے محمد بن قاسم پانی پیا کرتا تھا۔ وہ بھی کھاتہ بھی تھا جس میں ہیو بنال اپنی
 فوج کا حساب کتاب لکھا کرتا تھا۔ اس کبارٹی بازار میں ایسی انسانی کھوپڑی
 بھی دستیاب ہو جاتی تھی جسے ایک کبارٹی بکرماجیت کی کھوپڑی کہہ کر بیچتا تھا۔
 دوسرے کبارٹی اسے علاء الدین خلجی کی کھوپڑی کے طور پر فروخت کرتا تھا۔
 اس کبارٹی بازار کے متعلق ایک لطیفہ بہت مشہور تھا کہ ایک بار ایک
 بوڑھا آدمی ایک کبارٹی کی دکان پر پہنچا اور بولا "کیا آپ کے پاس ہمارا راجہ رنجیت
 سنگھ کی کھوپڑی موجود ہے؟" کبارٹی نے بڑے کامیابی سے تھوڑے سا تھکے کہ "کیوں
 نہیں۔ ابھی حاکم کرتا ہوں۔" چنانچہ اندر جا کر وہ ایک کھوپڑی اٹھا لیا۔ بوڑھے
 کھوپڑی کو غور سے دیکھ کر کہا "سات گھنٹے میں نے خود ہمارا راجہ رنجیت سنگھ
 کو دیکھا تھا۔ ان کا سر بہت بڑا تھا مگر یہ تو چھوٹا سا سر ہے؟" کبارٹی نے جواب
 دیا "جواب دیا۔ خیاب یہ ان کے بچپن کی کھوپڑی ہے۔"

چنانچہ ایسے عالمگیر قسم کے کباڑی بازار میں کوئی درجہ نہیں سمجھی کہ مجھے پچیس سال پہلے کی پرسدہ گھنڈی جینری دستیاب نہ ہوئی۔

اس کباڑی بازار کی دکانیں چوٹی کھوکھوں کی بنی ہوئی تھیں۔ شکستہ اور میلے کچیلے کھوکھوں کی یہ قطار دور سے یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی ختم خانے میں ییتیموں کی فہرست لٹکی ہوئی ہو۔

میں نے یہ فہرست ساری کی ساری دیکھ ڈالی، مگر جینری نہ مل سکی نہ ملی کباڑی بازار کی آخری دکان سے حبیب میں مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا تو کیاڑیئے نے میرا کندھا پکڑ کر کہا: ”جناب اگر جینری نہیں ملے تو نہ سہی کچھ اور لے جا رہے مگر میری دکان سے خالی ہمت لوٹیے۔ میری ہاں جینری سے زیادہ نادرجہ چیزیں موجود ہیں۔“

”مثلاً...؟“ میں نے جملہ پوچھ کر کہا۔

”مثلاً...“ کباڑیئے نے ایک کونے پھوٹے گراموفون پر رکھا ہوا ایک میلا کچیلہ پتیل کا چراغ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”چراغ نے جائے یہ ایک تاریخی چراغ ہے، شہنشاہ اکبر اس کی روشنی میں بیٹھ کر مٹا اور کیا کرتے تھے۔“ کچھ ہنسنے ہوئے اور کچھ روتے ہوئے میں نے عرض کیا: ”مگر جناب صاف کیجئے، شہنشاہ اکبر تو ان دنوں مرچے تھے۔“

”نرمیر یہ اکبر نہیں ہو گا شاہ جہاں ہو گا۔ کباڑیئے نے کاروباری دتاؤ کی خاطر اپنی غلطی کی فوراً تصحیح کر ڈالی۔

اگرچہ جینری کی بجائے چراغ لے جانے میں کوئی ناک نہیں تھا لیکن مجھ پرانی میوں چراغ مجھے پسند نہ آ گیا۔ جیسے انسان کو کچھ چیزیں خواہ مخواہ پسند آ جاتی ہیں جیسے شادی

سے پہلے ایک لڑکی مجھے خوا مخواہ پسند آگئی تھی۔ جو بعد میں میری بیوی بن گئی اور عمر کے کچھ بچپانے کا باعث بنی۔

میں نے اس کا بیڑیجے سے اس چراغ کی قیمت پوچھی اور اس نے شاید یہ سمجھ کر کہ میں کوئی ریسرچ اسکالر ہوں، "مغل ریاست میں چراغوں کا رول" پر ایک تھیسس لکھ رہا ہوں۔ چراغ کی قیمت پچاس روپے بناوی۔ لیکن جب اکبر بادشاہ سے نیچے اتر کر شاہ جہاں سے بھی نیچے گرتی پڑتی آخر مغل بادشاہ تک چراغ کی بات پہنچی تو قیمت گر کر پچاس روپے سے پچاس پیسے تک آ پہنچی اور سودا خٹے ہو گیا۔

میری بیوی نے چراغ کا استقبال بڑی سرورمہری سے کیا۔ بالکل ایسے اچھے وہ ہر شام میرا استقبال کیا کرتی تھی۔ چراغ دیکھ کر اس نے طعنہ دیا کہ تمہارا انتخاب ہمیشہ غلط ہوتا ہے تم زندگی میں کبھی کوئی صحیح چیز گھر نہیں لا گے۔ میں نے کہا: میں تمہیں گھر لایا ہوں۔ ہندوستان کی کروڑوں عورتوں میں سے منتخب کر کے، کیا میرا یہ انتخاب غلط تھا؟

بیوی کے لئے اس کی نزدیک مشکل تھی۔ (اگرچہ ناممکن نہیں تھی) اور بعد اس نے اس چراغ میں ایک عجیب خوبی ڈھونڈ نکالی کہ ایک سلائی ٹیکسن گھوما لٹتی کی وجہ سے جب کبھی بجلی ختم ہو جائے گی تو اس بحران میں یہ چراغ بڑا سودمند رہے گا۔

اس خوبی کو دریافت کرنے کی دیر تھی کہ میری کو ایک دم جلیے چراغ سے محبت ہو گئی اس نے اعلان کیا کہ میں اسے ابھی مانجھ کر شیشے کی طرح چمکا دیتی ہوں۔ میری بیوی کو سگھڑاپے کا مرض لاحق ہے۔ بلکہ اس کے میکے والے

دنیا بیوی پر دہلیز بند کر کے پھرتے تھے کہ ہم نے ایک سنگڑ بیٹی ایک نالائق آدمی سے بیاہ دیا اور نہ اس نالائق خاوند کا گھر آج تک نیلام ہو چکا تھا۔ (اور یہ بات پر دہلیز بند کر کے باوجود صحیح تھی)

مگر جوں ہی بیوی نے آنگن میں جا کر اپلوں کی راکھ سے شہنشاہ اکبر کے اس چراغ کو گڑنا شروع کیا، اچانک ایک دہشتناک سادھاکہ ہوا اور آنگن کی زمین بھٹی۔ زمین سے دھوئیں کا ایک طوفان اٹھا اور اس دھوئیں میں سے تقریباً پندرہ فٹ لمبا ساڑھے سات فٹ چمرا ایک خوفناک نگر مہیب صورت دیکھو ہوا ہوا اور گرج کر بولا۔

”اے الہ دین! میں تیرا غلام ہوں! بنا: میرے لئے کیا حکم ہے؟“

میں اس وقت برآمدہ میں ایک آئینہ کے سامنے کھڑا اپنی ڈاڑھی کے چند تازہ تازہ سفید بال گن رہا تھا۔ دھماکے اور دھوئیں سے گھر اگر میں اپنی اکلوتی بیوی کی طرف دوڑا، جو اس وقت تک دو تین گز دور جا پڑی تھی، اور کراہ رہی تھی، مادر دلیاس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ بچے ماننے لگے تھے بڑے گستاخ دیو کو دیکھ کر میرے اپنے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ لیکن اس خیال سے بیاہ کے وقت میں نے سات پیرے لئے تھے اور ہر پیرے میں بیوی کی حفاظت کا عہد کیا تھا۔ — ایک کر بیوی کو اٹھایا اور دیو کی آنکھ بچا کر دیو سے کہا۔

”اے کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

دیو بدستور ہاتھ جوڑے ہوئے گرج کر بولا۔

”میں الہ دین چرنج کا دیو ہوں اور یہ عورت الہ دین ہے اور میں اس کا غلام

ہوں۔“

”مساف کیجئے، یہ تو شیلاب الہ دین نہیں ہے، الہ دین کہہ کر کا گھر اٹھلے

چوک پر ہے۔ آپ غلطی سے اللہ دین کی بجائے شیطان کے گھر آ گئے ہیں۔
دیو نے میری تشریح کو کلتیارت کرتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں جانتا جس انسان کے پاس یہ چراغ ہو گا وہ اللہ دین ہو گا۔ اس
یہ عورت بھی اللہ دین ہے۔ اس نے مجھے بلایا ہے۔ اور یہ مجھے جو حکم دے گی میں
اس کی تعمیل کروں گا۔“

حکم دینے والے اللہ دین کی گھنگھی بندہ چچی تھی اس کا چہرہ نرود ہو رہا تھا
اور وہ مارے خوف کے مجھ سے یوں چٹ گئی تھی جیسے کسی غلطی پر سڑ میں کوئی نمونہ
اپنے عاشق سے چٹتی ہوئی ہو۔ مجھے فوری خطرہ یہ لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں میرے
بچوں کی اس واحد ماں کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے کیونکہ وہ گزشتہ پانچ برس
سے ضعف قلب کا شکار تھی اور ڈاکٹر کا آخری بل ادا کئے ہوئے ابھی جو میں
گھنٹے پہلے نہیں گزرے تھے۔

بیوی کے ہارٹ فیل ہونے کے احساس سے میرا اپنا ہارٹ وٹر کئے لگا کر میری
بیوی کے بیوہ ہونے میں صرف ایک آدھ منٹ کی کسر باقی ہے۔ مگر نہ جانے
میری بیوی نے کوئی اچھے کرموں کا پھل لقا کہ میں نے اپنے آپ کو فوراً سنبھال
لا اور کہا۔

”جائزہ تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر شانتی پر کاسٹ گولڈ میڈلسٹ
کو بلا لاؤ۔“

مگر دیوش سے من نہ ہوا۔ جاکھڑا رہا۔
”جاؤ۔ جانے کیوں نہیں اے غلام تم تک حرام با“
تمک حرام نے دھمکی دی۔

”جب تک پاس چراغ ہے میں صرف اسی کا حکم مانوں گا۔ تم کون ہوتے

ہو حکم دینے والے؟

دیو کی سماجی کم شعوری پر مجھے سخت افسوس ہوا۔ اس کم بخت کو اتنا بھی معلوم نہیں، کہ تم جس کے غلام ہو وہ خود میری غلام ہے۔ جب وہ میرا حکم مان لیتی ہے تو تم کیوں نہیں مانتے۔ لیکن صورتِ مالات چونکہ انتہائی نازک نفی اور مشکل رشتوں پر بحث و مباحثہ سے میرا اور بیوی کا رشتہ ٹوٹ جائے گا خطرہ تھا اس لئے میں نے قرراً بیوی کے ہاتھ سے چراغِ حقیقہ کراپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔

”اب میں اللہ دین ہوں۔ چراغِ میرے پاس ہے۔“

مگر دیو شاید کچھ با اصول واقع ہوا تھا بڑے وقت رہی میں بولا۔

”پہلا حکم پہلے اللہ دین کا۔ دوسرے اللہ دین کا حکم بعد میں۔۔۔۔۔“

مجبور ہو کر میں اللہ دین نمبر ایک کے تلوے ٹھنکے اور کہا۔

”جان میں! ہوش میں آ جاؤ۔ خدا کے لئے کوئی حکم دے دو۔ کوئی مس

میں حکم کوئی انت شنت اوٹ پانگ مساکم۔“

اور میری بیوی میں نہ جانے کیسے ایک ایک ہیئت پیدا ہو گئی اور نہ جانے

اس نے غج سے کہا یا دیو سے کہا۔

”وضع ہو جاؤ یہاں سے۔“

اور پھر ایک دم زمین شق ہوئی اور دیو وضع ہو گیا۔

کچھ دن تک ہم میاں بیوی حواس باختہ رہے اہماری سمجھ میں نہیں آ رہا

تھا کہ ہمارے ساتھ یہ کیا سوک روا رکھا گیا ہے کہ ہم اپنی خالص اور شغری

ستھری محبت کی کمائی کے عادی بنے۔ مگر ہمیں حرام کی کمائی دلائی ہے۔ اور

چراغ عنایت کر دیا گیا تھا۔ اس لئے سہارے حماس کا محقق ہو جانا ضروری تھا۔ کیرنگھاس سے سہارہ کی عادات و حضائل میں بڑی گڑبڑ کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ ہم اس میں مارشل زندگی میں اس امر کے عادی ہو چکے تھے کہ نئی جہازیں نہ خریدی جاسکیں تو تعمیر ہوئی حیرا میں پہنچنے میں بھی ایک لطف آتا ہے۔ ہم تو اپنے بچوں تک کو یہ سکھا چکے تھے کہ باپ کی پرانی چالوں سے غالی بنیان بنانا ہندوستانی کلچر ہے اور ہمیں اپنے کلچر کی ہر قیمت پر حفاظت کرنی چاہیے۔

اس لئے جب الامین کے چراغ کے تصور سے ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہم ایک منٹ میں امیر کبیرین سکتے ہیں۔ تو سہارے کلچر کو ایک اچانک صدمہ ہوا اور ہم اپنے ہوش اس حد تک گمراہ ہو گئے کہ پورا سہارہ ایک دوسرے سے کھل کر بات بھی نہ کر سکے۔

نہب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس چراغ کو کہاں رکھا جائے۔ تاکہ نہ یہ بچوں کے ہاتھ لگے اور نہ اسے چھو لگا کر لے جائیں۔ اس معاملے میں چور اور بچے دونوں کو ہم نے ایک سطح پر رکھا اور اسے زمین کے اس حصے میں دبا دیا جہاں بیوی کے طوائف زلیخا کا ڈیرہ دیا ہوا تھا۔ ایک قیادت بھی کہ ممکن ہے چراغ ٹکانے کی کئی بار ضرورت پڑے اس لئے اس کو ٹرک میں رکھا جائے جہاں پتہ جی کی مصیبت اور بیوی کے چیز کی کچھ باقی ماندہ نشانیوں اور عریاں میگزین کے غصیہ فوٹو رکھے ہوئے ہیں۔ بڑی مشکل سے بیوی اس بات پر رضامند ہوئی کہ ٹرک کی دو چار چابیاں رکھی جائیں۔ ایک میرے پاس رہے اور ایک میری بیوی کے پاس۔

یہ پہلا واقعہ تھا کہ میرے اور میری کے اعتماد کی دیوار میں دراڑ پڑ گئی، درخت اس سے پہلے ہم دونوں شاستروں کی ہدایت کے مطابق ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ مجھے پہلی بار شب بوا کہ شاستر اور میری دونوں تاپا بیدار ہیں اور اس چراغ کے ساتھ شاستر کا سورج نہیں جل سکتا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے بیماری سے زیادہ چاقی پر یقین آیا۔

چند دن اور بے معنی طور پر گزر گئے۔

ایک دن میں چوری چھپے) اردو میں چراغ کا مشہور قصہ میرزا کا رام ایک سیلرز کے ہاں سے خرید کر رات بھر پڑھنا لگا۔

دوسرے دن جب شام کو گھر لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں میری بھانجی کا قصہ کتاب دفٹے کے پلوں میں چھپا ہے پڑھ رہی ہے۔ میں نے کہا:

”کیا پڑھ رہی ہو جان!؟“

”بھانجی کی ایک کتاب ہے۔ نیشنل یونیورسٹی کے بڑے بڑے سٹوڈنٹ لکھے

ہیں اس میں۔“

میں نے مزاح جرات سے کام لے کر کتاب چھین لی۔

یہ تو اردو کا قصہ ہے جناب!

میں نے طنزاً عرض کیا۔

ظاہر ہے میری مشغل ہو گئی۔ بالکل ایسے ہی جیسے سبزی میں نمک زیادہ پڑ جائے تو اس کا الزام کوئل ڈھونڈنے پر لگا دیتی ہے کہ وہ گیلا ایندھن مہیا کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے ہنر کر کہا۔

”میں جانتی ہوں تمہیں اب مجھ سے محبت نہیں رہی، بلکہ اب تو اس کوئی

کالی کلونی چھو کر سی کے پیچھے گھومتے ہو۔ میں پوچھتی ہوں وہ کیوں آتی ہے ہمارے
گھر؟ اب کے آئی تو لٹانگیں توڑ دوں گی۔“
میں نے کہا۔

”دیکھو میری محبوبہ اور الادین کے درمیان محبت کو مست لاڈ
محبت ایک مقدس عظیم جذبہ ہے اور میری محبوبہ چھو کر سی کا رنگ کالہ ہے
تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ محبت نہیں کر سکتی، باقی رہنا لٹانگیں توڑنے کا معاملہ تو
میں اپنی محبوبہ کی ٹانگوں کا تحفظ اب زیادہ معقول طریقے سے کر سکتا ہوں کیونکہ
میرے پاس دلو موجود ہے۔“

یہ ایک ایسی عملی و محکمہ معنی جو بہت کم عادی بہت کم بیویوں کو دے سکتے
ہیں۔ عام حالات میں شاید میں یہ کہنے کی جرأت کبھی نہ کرتا۔ بلکہ اس کالی کلونی
چھو کر سی سے بدستور خاموشی اور محفوظ محبت کے مجاہد محبت کی یہ دھڑکن ہمارے
اچے کانوں کو بھی سنائی دیتی۔ لیکن جب سے الادین کا چراغ میرے قبضے میں
آیا تھا میرے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی آ رہی تھی۔ گذشتہ آٹھ دس سالوں کے
تین نجات، شرافت اور بزدلی میرے ورثے میں آئی تھی وہ میری گرفت کے
تکلیف جابر تھی اور اس کی بجائے وہ وحشیانہ قوت اور جارحانہ بربریت میرے
اندر داخل ہو رہی تھی جو انسان کو مجھ، گیدڑ اور گدھا وغیرہ سمجھتی ہے اور اس طرح
وہ تاریخی حالات پیدا کر دیتی ہے۔ جب ایک انسان دوسرے انسان کا اور ایک قوم
دوسری قوم کا خون پی کر موزین کے لئے مواد جتیا کرتی ہے۔

”میں چراغ کے اس دلو سے جو چاہے کروا سکتا ہوں۔“ میں دن بخیرین تریا
خواب دیکھتا۔ ”میں اگر چاہوں، تو اگر وہ کے تاج محل کو اکٹھا کر اپنے کوچہ گھاس
رام میں نصب کروا سکتا ہوں، میں اگر چاہوں تو پورے دلی سٹریٹ کو یہاں سے جزیرو

انڈیا میں منتقل کروا سکتے ہوں۔ میرے ہاتھ میں جادو ہے، ظلم ہے، طاقت ہے دولت ہے، میں عظیم ہوں، میں بلند ہوں، میں شہنشاہ ہوں، میرے قدموں پر ساری دنیا جھک سکتی ہے، اس سندھوتانی بیوی کی کیا بابت ہے؟

یہی بیوی بھجنوں کی لپٹک لیتی "فصلہ الدین چراغ کا" میرے منہ پر پنج کیا تیر چلی گئی معلوم ہوتا تھا اس کے اندر بھی وہی شہنشاہ جاگ چکا تھا۔ جو میرے اندر جاگ رہا تھا، اس میں بھی وہی وحشیانہ قورست اور جارحانہ بربریت جنم لے چکی تھی۔ جو میرے اندر۔ میرا تھا ٹھنکا یہی بیوی گنتی نرم دل، وفادار اور محکوم نور شہنشاہ کی مالک ہو کر رہ گئی، لیکن اب یقیناً اسے بھی یہ احساس ہو چکا ہے کہ الہ دین کا چراغ اس کے پاس ہے، اس لئے اس دیو کے مقابلے پر میرے اس غاوند ایسے آدمی کی کیا ہستی ہے۔ میں تو دیو سے کہہ کر اسے بحر مند میں ڈبو سکتی ہوں۔

چنانچہ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ اندر جاتے ہی وہ لپٹاگ پر جاگری اور منہ چسپا کر مظلوم بیویوں کی طرح بسور نے لگی۔ مگر میں انتہائی لطیف میں تھا۔ غنا فرسہ ہو سکا، ورنہ مظلوم بیویوں کا رونا ہمیشہ رونا تک لگتا ہے میں نے تیزی سے ٹرنک کے تالے کی چابی گھمائی، اور چراغ نکال لیا۔

میرا پردہ گرام سرسجا بہن تھا کہ دیو کو بلاتے ہی اسے پہلا حکم یہ دوں گا، کہ میری بیوی کو اٹھا کر ماؤنٹ ایورسٹ پر پہنچ آؤ اور وہاں پس پر میری کالی کلہاڑی محبوب کو لیتے آنا۔

میں نے حلدی حلدی فرش پر چراغ رکھا۔ میں غصے میں اپنے آپ کو پاگل بھی محسوس کر رہا تھا، اور انتہائی دانش مند بھی، کیونکہ جس بیوی پر سے اعتماد اکٹھا جائے اسے اپنے گھر میں رکھنا انتہائی پاگل پن تھا۔
چراغ دگڑا گیا۔

کچھ بھی نمودار نہ ہوا۔

نزدھواں، نزدیک، زندھکا کہ

صرف فرسٹ پریکب ہلکی سی رگڑ کا نشان پڑ گیا۔

شاید چراغ کے رگڑنے میں کوئی ٹیکنیکل نقص رہ گیا ہو۔ میں نے سوچا۔

اس لئے دوسری بار میں نے اسے پوری جانمردی سے رگڑا، یہ ایک ایسی زوردار رگڑ تھی، جیسے کوئی بڑھئی آری سے لکڑی چیر رہا ہو۔

مگر دیو اس بار بھی نمودار نہ ہوا۔

یہ دیو کو کیا ہو گیا؟

کم بخت کہیں دوسری جگہ مصروف نہ ہو۔

کہیں ہسپتال میں بیمار نہ پڑا ہو۔

کہیں مجھ سے ناراض نہ ہو گیا ہو۔

مگر لادین کے قصے والا دیو کہیں بیمار نہ ہوتا تھا۔ غاصی اچھی پہانتے تھے

اس کی، شاید وہ اصلی دیو ہو گا۔ اور میرے چراغ والا دیو اس کا بندرستانی ایڈیشن ہو گا۔

قریب قریب مایوس ہو کر میں نے چراغ کو فرسٹ پردے مارا کہ وہ ٹوٹے

ٹوٹے بچا، لیکن میرے اس غلام دیو کا جو تاج محل کو، ٹھاکر کو چہ گھاسی رام میں

نصب کر سکتا تھا، دورد و تک کوئی نشان نہیں تھا۔

میں نے میری سے کہا

”دیو کیوں نہیں آتا؟“

اس نے جمل معن کر جواب دیا۔

”میں کیا جانوں؟ تمہاری اس کالی کلونی، چھو کری سے عشق کرتے ہیں مصروف ہو گیا“

یہ طعنہ عین میرے کنبے میں لگا۔

میرے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔

آج کا دن مجھ پر عدم اعتماد کا دن تھا پہلے میری پراغتاً دلوں، اب دیو پر
دو دنوں میں اخلاق و کردار کی کمی در درناک محقق۔ اب کوئی کس پر اعتماد کرے۔ سچ
ہے اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں، سب اکیلے ہیں۔ کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ نہ
دکھ میں نہ سکھ میں۔ ہر دکھ تنہا ہے، ہر سکھ اکیلا ہے۔

درد و دیرِ آگ کی اس کیفیت میں میری عجیب حالت ہو گئی صاف ثابت
ہو رہا تھا کہ یہ دنیا صرت مایہ ہے بلکہ سرمایہ ہے۔

سرمایہ دار، مردہ یاد!

انقلاب، زندہ یاد!

دنیا بھر کے دکھی لوگو! تنہا ہو جاؤ، اکیلے ہو جاؤ، ایک دوسرے سے الگ ہو جاؤ
دنیا بھر کی بیویو! اپنے خاوندوں کے ساتھ دفن کا قراڈ چھوڑ دو۔ اور اے
الہ دین کے چراغ! میری آنکھوں سے دور ہو جا، نہیں تو اپنی آنکھیں پھوڑ لوں گا۔
میں رونے لگا۔

میری پہلے ہی رورہا تھی۔

لیکن ہم دونوں الگ الگ درجہ سے رورہے تھے۔

بچے ہمیں روتا دیکھ کر دوڑے آئے اور وہ بھی رونے لگے ان کے رونے
کی درجہ ہم دونوں سے الگ تھی۔

(”ماڈرن الہ دین“ میں سے)

ہم نوشیرواں بنے

پروندیش نے پھایا داس کئی دن سے یہیں گمراہ کر رہا تھا کہ ہم دارالسلطنت کا دورہ کریں اور بھیس بدل کر کریں، جیسے نوشیرواں بادشاہ کیا کرتا تھا۔ ہم نے نوشیرواں کا نام بھیجی ہیں سنا تھا، سہارن مرحوم دادا ہمارا چاچا اور میراج کن بکچھوڑنا تھا سبھی بھیجی گئی ہیں۔ دو چار جام چڑھانے تو فیضیہ کیا گوارا ہے آپ کو نوشیرواں کہا کرتے تھے۔ لیکن بھیس بدل کر کبھی دورے پر نہ نکلے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ گھوڑوں والی بھیجے بغیر وہ کہیں نہیں جاسکتے۔ چاہے ہیں جنت کا دورہ کیوں نہ کرنا پڑے۔

لیکن ہماری شکل کچھ اور تھی۔ ہمیں نانہ جہور سیت میں بادشاہ بننے کا چانس ملا تھا۔ گھوڑے اور کبھی کار و راج ختم ہو چکا تھا اور وہیں کار پر سوار ہونا پڑا تھا۔ کار کہیں بھی جاتی تھیں سٹ سے اس کی منظوری لینا پڑتی تھی۔ ڈراما اس منظوری کے بغیر کار چلا تا تو اسے بادشاہ کو اعزا کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا جانا۔ غرض جہوری دور میں نوشیرواں بننا ایک بہت بڑا رسک۔ (K K) تھا۔

نیشنل داس نے ایک اور نکتہ بنا کر ہمیں ہراساں کر دیا کہ یہ ڈیمو کراسی ہے رعایا سے براہ راست تعلق قائم کیجئے۔ ورنہ وزیر لوگ موقع پا کر آپ کو گدھا سے اتار پھینکیں گے اور رعایا چوں تک نہ کرے گی۔ رعایا پر کیسے گزر رہا ہے؟ اس کا آپ کو براہِ علم ہونا چاہئے۔ تاکہ آپ وزیرانگی و خاطرانہ و رونق بیانیوں کا پول کھول سکیں۔

مقامی تاسف ہے کہ نیشنل داس کا سیاسی شعور ہم سے بہت زیادہ گہرا ہے۔ نہ جانے یہ پیرامیٹی میں کیوں ٹول رہا ہے۔

بہر حال ہم نوشیرواں نے بننے کے لئے بے قرار بھی ہیں اور جتنے ہوئے ڈرتے بھی ہیں۔ ہمارے راج محل سے غائب ہونے کی خبر بجلی کی طرح پھیل جائے گی اور شہر کی ساری پولیس تینیں کتوں کی طرح سونگھتی پھرے گی۔ بڑی الجھن میں جان ہے۔ کیا کریں؟ کدھر جائیں؟ اے خدا! اے! اے! واد! ہمارا راج کن کچھو رانا تھ جی! ہمارا دی رہنمائی کر!

بالآخر ہماری نالائقی رنگ لائی اور ہم آج نوشیرواں بن کر باہر نکلے ہم نے ایک مالی کا بھیس بنایا اور شاہی محل کے گیٹ کیپر کو شاہی اجازت نامہ دکھا کر ٹل دیا۔ گیند ہم نے خود ہی اجازت نامہ خریدا، خود ہی دستخط کئے اور خود ہی باہر نکل آئے۔ محل دینے کا یہ فعل ہمیں بے حد لذتِ معلوم ہوا۔ جیل دیتے وقت سارے بدن میں ایک روناٹک سنسنی سی دوڑ گئی یہہر ریت میں بادشاہ بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ یہہیں پہلی بار معلوم ہوا۔

محل سے نکل کر ایک فرلانگ تک ہم دم، مادھ سیدھے چلتے رہے جیسے ہم راجہ نہ ہوں، چور ہوں، جب تھک گئے تو پیپل کے پٹر کے نیچے کھڑے ہو گئے ہم نے سوچا اب ہم اپنی رعایا کے درمیان آچکے ہیں۔ لیکن بہت شش و پنج میں تھے

کہ رعایا سے بات کیسے کر سیں۔ رعایا سے براہ راست باتیں کرنے کا ہمیں کوئی تجربہ نہ تھا۔

ہم کھڑے ہوئے ہانپ رہے تھے۔ ہمیں لپٹنے کا تجربہ بھی پہلی بار ہوا تھا۔ ہمارے سامنے ہماری رعایا پاپیادہ چل رہی تھی۔ لیکن وہ ہماری طرف ہانپ نہیں رہی تھی۔ عادت کی بات ہے، ہم نے سوچا اگر رعایا بھی ہماری طرح بادشاہ ہوتی تو ضرور ہانپتی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ پیدل چلنا حقیقت ہے۔ جب ہماری جیب کرسیوں سے بھری ہوئی ہے تو کیوں زنجیسی پر چلیں۔ ہم نے ایک ٹیکسی کو اشارہ دیا۔ وہ اس غرور کے ساتھ رکنا جیسے ہمارے اشارے سے اس کی توہین ہوئی ہو، ٹیکسی ڈرائیور ایک ہٹاکٹا مشنڈا (زوجان) تھا۔ اس نے پہلے سر سے پاؤں تک ہمارا معائنہ کیا۔ (ہم مانی کے بھیس میں تھے نا؟) اور پھر ناک چڑھا کر بولا: ”کیا بات ہے، سہیں گیوں روکا؟“

”ہم ٹیکسی پر سوار نہیں گئے۔“ ہم نے فرما دیا۔
 ”اے واہ رے ہم کی اولاد! صورت مشکل سے تو مانی لگتے ہو یا موچی۔ لیکن اپنے کو اہم کہتے ہو، کسی بادشاہ کی ناجائز اولاد معلوم ہوتے ہو۔ کتنے پیسے ہیں پلے میں؟“

ہم مارے طیش کے آنسو زیر پا ہو گئے۔ کتنی بدتمیز رعایا بے ہماری؟ جی چاہا اس کے رخسار پر طمانچہ چڑوس۔ لیکن مانی اور طمانچہ بڑی مشکل تھی۔ اس نے منہ کا ایک گھونٹ بھرا اور کہا: ”بولو کتنے پیسے چاہئیں، ہزار، لاکھ، دو لاکھ، تین...“

ڈرائیور نے ہم پر استہزاءیہ قہقہہ لگایا اور بولا: ”کوئی بدتمیزی سمجھ لگتے ہو یا سمجھ کر ٹیکسی میں بٹھا کر گرتا رہتا ہوں؟“

یہ کہہ کر وہ تہقُّق کے ساتھ ٹکیسی سٹارٹ کر کے چلا گیا۔ راج محل کے باہر بادشاہ کی گفتنی عرصہ بعد ہوئی تھی؟ تہقُّق اس سوال کا جواب دے رہا تھا! آہ راجہ کو تو صرف راج محل ہی میں رہنا چاہیے۔ (ہم نے ششپل دس کو لاکھ لاکھ لگائیاں دیں، جس نے ہمارے سر بازار دھوا ہونے کا منصوبہ بنایا تھا۔) ششپل کے پٹر کے نیچے ایک بڑھیا بیٹھی تھی اور اپنی گھٹری میں سے کھانا نکال کر کھا رہی تھی۔ کیا یہ درخت اس کا ڈائیننگ روم ہے؟ میں یہ مزاحیہ فقرہ اچانک سوجھ گیا۔ پہلی چادر کے دسترخوان پر دونوں کافی کافی روٹیاں اور اچار رکھ کر بڑے مزے سے کھا رہی تھی۔ ہم اس کے قریب چلے گئے اور پوچھا: کیا تم رعایا ہو؟ بڑھیا بولی: کیا مطلب؟

”میں تم سے براہ راست تعلق قائم کرتا چاہتا ہوں۔“
”کون ہو تم؟“

”کیا میں اسے بتا دوں کہ میں نو شیرواں ہوں، لیکن نہیں۔ راج یعنی کچھ صلحت کا تقاضا تھا کہ اپنا راز افشاء کروں۔ اس لئے تفریحاً کہا۔“ میں بھی ہنسا ہی طرح ایک رعایا ہوں۔ ہمارا ج چوہٹ نانہ جی سے ملنے کے لئے جا رہا ہوں۔“
”بیکار ہے، وہ کوئی راجہ ہے؟ اس کے راج میں تو بھر پیٹ رونی ہو گا۔“
”ملتی۔ اس نے میرے گناہ بیٹے کو جیل میں ڈال دیا۔ میں تو اس مجوس کی صورت و دیکھوں۔“
ڈرامیور کے بعد بڑھیا ہمیں سوا کر رہی تھی، اس کے بیٹے کو کس نے جیل میں ڈالا ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا۔ ہمارے معلومات گفتنی: نقص مقصود، مزید تشریح کے لئے پوچھا: ”اں! کس جرم میں تمہارے بیٹے کو جیل ہو گئی؟“

”اندھیر نگر کی جو ہوئی بیٹیا! میرا بیٹا ایک زمیندار کا مزارع تھا۔ زمیندار ناچار مزارع بنائے گئے تھے۔ چھاپہ جو پڑا تو زمیندار پولیس کو رشتہ و کچھ پھوٹ گیا۔“

لیکن میرے بیٹے کو پھنسا دیا اور اب سنا ہے اس زمیندار نے راجہ چورپٹ ناتھ کے بیٹے کا جشن منانے کے لئے بھی ایک ہزار روپیہ دیا ہے۔ تفت ہے ایسے راجہ پر جو رشتہ کے پیوں سے جشن مناتا ہے!“

بڑھیا نے اکیس مشکوک نگاہ ہم پر ڈالی۔ ہمارے لباس کو دیکھا۔ کیونکہ راجہ صرف لباس ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ لباس سے وہ بالکل متاثر نہ ہوئی اور اپنے پورے منہ سے مسکرا کر بولی: ”ہی ہی ہی! جاؤ بھیا! کیوں بڑھیا سے مذاق کرتے ہو؟ تم راجہ ہوتے تو ایسے گھٹیا مذاق نہ کرتے۔“

ریکھتے کہتے اس نے گھٹری اپنے گھٹنے کے نیچے دبالی تاکہ ہم اٹھا کر بھاگ نہ جائیں۔ اس نے ہمیں چورسہما تھا۔ ہمیں اپنی اس بوڑھی رعایا پر سخت غصہ آیا لیکن یہ غصہ ہم کیسے نکالیں! ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ صرف تعجب اسے دھک دیا۔
”دیکھ رہی بڑھیا! ہمیں راجہ تسلیم کر لے۔ ورنہ ہم تمہارے بیٹے کی طرح تمہیں بھی جیل بھجوا دیں گے!“

یہ سن کر بڑھیا نے گھٹری پر اپنی گرفت اور مضبوطی کر دی اور داد دینا بچانے لگی: ”ارے کوئی بچاؤ! یہ لیڈر امیری گھٹری جھینا چاہتا ہے!“
ہم گھبرا گئے اور سوچنے لگے اس ڈراما بڑھیا کے پاؤں پر گر پڑیں یا بھاگ کھڑے ہوں۔ مگر اس کا داد دینا ہماری سوچ کی رفتار سے زیادہ تیز تھا۔ جسے سن کر پانچ چھ آدمی آگئے بچے تماشہ کچھ کر رک گئے۔ راہ چلتی عورتیں بھی گھٹری ہو گئیں اور اب چلیے ہم سچ پانچ عوام میں کھڑے گئے۔

کیا ہے مال جی؟ ”بہت سی آوازیں بڑھیا کی طرف پکیں۔“

”یہ مڑا، مشنڈا، مجھے اکیلے جان کر، میری گھنٹری...“

اور ایک زنٹے کا طمانچہ ہمارے گال پر پڑا۔ ”کیوں بے ماں کے... شرم نہیں آتی؟“
”اے بچہ مگر قتالے نے چلو جی!“

”تو رہے! دن دباڑے رہنئی۔ راج تھوڑے ہے، اندھیر گردی ہے!“

”ہی ہی ہی! اسے کہتے ہیں چوپٹ راجہ کا راج!“

”اور مجھے دھوکا دیتا تھا کہ میں ہی چوپٹ راجہ ہوں؟“ بڑھیا نے تیل چھڑکا
اور پھر ایک اور زنٹے کا طمانچہ! (اس بار زیادہ بھر پور تھا، جبرٹے تک مل گئے) اور
پھر جیسے صبح کا نقارہ بجایا، ”ہوں! تباؤں تھیں راجہ کیا ہوتا ہے؟“
”جو سر ہانڈا پھیر رکھتا ہے، قہر قہر!“

”اور گھنٹری جراتا ہے...!“

اب ہماری پوزیشن انتہائی نازک ہو گئی تھی۔ نہ اپنے آپ کو راجہ چوپٹ تاتھ
کہہ سکتے تھے اور نہ زیادہ تھپڑ کھا سکتے تھے! ایک خیال آیا اور بڑا عظم کوٹلی فون
کر دیں کہ ہمیں اپنی رعایا سے نجات دلاؤ! لیکن وزیر اعظم ہماری کھلی اڑائیگا!

مگر جیب پھپھو ال تھپڑا! ہم براہِ رگنا رہے تھے تو جیسے ہماری عقل کا بند
ٹوٹ گیا۔ ہم نے اپنی جیب میں سے آٹھ دس کرٹسی نوٹ نکالے اور ہر امی اچھاں دے
اور پھر جیسے ایک معجزہ، سا ہوا بچے ان نوٹوں کے پیچھے بھاگے، ایک ایک گھنٹے بھاگے
اور بڑے ان بچوں کے پیچھے بھاگے اور ہمارے بجائے بچوں کو تھپڑ مارنے لگے، ہم نے
کچھ نوٹ اور اچھاں دے، کچھ تھپڑ اور لگے، یہاں تک کہ ایک نوجوان حسین دیہاتن کو
بھی تھپڑ لگایا گیا۔ اب ہمیں اس تماشے میں ملحقہ آنے لگا۔ ہم نوٹ پر نوٹ جھپٹتے
چلے گئے۔ ایک دوسرے کی گردن پکڑ لی۔ دوسرے نے تیرے کی کلائی دو جھپ
چوتے نے جھرا نکال لیا۔ اور نوٹوں اور آدمیوں کو ایک پھر دوسرے کاٹنے لگا

ہیں ان زنجیروں پر قدرے رحم بھی آنے لگا۔ لیکن یہ راج نیت یعنی اور ہم راج نیت کے سامنے انسانیت نہیں دکھا سکتے تھے۔ یہی لوگ جو چند منڈ پیلے رہزن کہہ رہے تھے۔ اب حاتم طائی سمجھ رہے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ اس وقت سوچ سے محروم ہو چکے تھے۔ جب انسان پیسے کے پیچھے بھاگتا ہے تو سوچ اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ لیکن ہم برابر سوچ رہے تھے کہ ہماری رعایا جن لوگوں کی خاطر سرحدیں کھینچ رہی ہے، وہ دراصل ان کے اپنے ہی لوٹ تھے۔ ہم نے رعایا ہی سے وصول کئے تھے لیکن اس وقت وہ اپنی ہی چیز کو لوٹ رہے تھے، جیسے وہ حرام کا مال ہو!

ہم نے رعایا کی یہ لوٹ دیکھی تو بڑھبھیا سے کہا تے: "وقت! اللہ! تو بھی بڑھ کر لوٹ رہے!" بڑھبھیا نے رال ٹپکائی۔ بیٹیا! جیتے رہو! تم مجھے اپنے ہاتھ ہی سے کچھ لوٹ دیدو۔ بلکہ ان باتیں سوچ راجہ چوپٹ تانہ بنا دے گا!"

ہم نے محسوس کیا ہماری ساری رعایا لیٹری ہے۔ مظلوم بھی لیٹرا ہے اور ظالم بھی! اور ہم ان لیٹروں کے راجہ ہیں! ہمارے منہ سے ایک فرمان اچانک نکل گیا: "بھاگ جاؤ لوٹ کر! پولیس آ رہی ہے!"

اس پر جس کے جو ہاتھ لگا، نے کہ بھاگ گیا اور صرف ہم باقی رہ گئے اور یہ ایک کتا کھڑا رہا، جو دم ہلا کر ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا تھا: "ہمارا ج! صرف تو ہی بانٹو گے یا روٹیاں بھی۔" روٹیاں ہی بانٹو تاکہ ایک آدمی ہم بھی لے اڑیں۔ آخر ہم بھی تو آپ کی رعایا ہیں!"

ہم نے کتے کو دھتکار دیا۔ اسے ایک ڈھیلا مارا جس کا شاید اس نے بہت برا مانا۔ کتے کے جھپٹنے کے بعد ہم تھراہ گئے اور پھر تنہائی سے قائدہ اٹھا کر روٹے لگے۔ اپنی اور رعایا دونوں کی حالت زار پر! اور جب سو رو کر ہی کچھ ہلکا ہوا تو ہم یہ سوچ کر محل میں لوٹ آئے کہ رعایا سے تعلقات پیدا کرنے ہیں تیغ اوتارنا ہے اور تیغ زر میں! (چوپٹ راجہ بھی ہے)

مسخر

کہنیاں! ایکپور سے میری ملاقات کب ہوئی؟ یہ مجھے بالکل یاد نہیں۔ شاید وہ ملاقات کوئی اہم واقعہ نہ ہو جو پہلی ملاقات پر کوئی گہرا نقش چھوڑ جائے۔

لیکن اب یہ عالم ہے کہ گپور سے ملنے کے لئے طبیعت میں ابال سا اٹھنے لگتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ حسین و جمیل جسم کا مالک ہے نہ اس کے لمبے تڑپے قد میں کوئی کشش ہے۔ اور نہ اس کی گفتگو اور لب و لہجہ میں کوئی جھنجھٹلی شائستگی ہے۔ صرف ایک لیڈی کٹ عینک کے سوائے اس کی پوری شخصیت میں کوئی چیز چمکیلی نہیں ہے۔ بدن کے ماسرین کا خیال ہے کہ یہ شخصیت کے جسم میں سے کچھ خاص قسم کی لہریں نکلا کرتی ہیں ان لہروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک قسم کی لہریں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ دوسری قسم کی لہریں دھکے دے دے کر اپنے سے دور بھٹکیں ہیں۔ گپور کے نصیب میں دوسری قسم کی لہریں لگیں ہیں جو جسم سے پھوٹتی ہیں تو انسان کو جھکا دیتی ہیں۔ سید صاحبان ظہیر اور کپور متہذکر دبالا دونوں قسم کی لہروں کے دو رنگ۔ اگلا۔ ٹائٹل دے کچھ جاسکتے ہیں

لیکن اس کے باوجود میرا عالم یہ ہے کہ میں کمپور سے ملنے کے لئے مضطرب ہوا تھا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میری اپنی لہروں میں بھی کوئی نگر ٹھوہے ورنہ کمپور کے لئے مضطرب ہونا کہاں کی دانش مندی ہے؟

وہ شہروں میں رہتا ہے مگر وہ پہانی خند و خال رکھتا ہے اگر وہ کسی گھاؤں کے جاگیردار کا بیٹا ہوتا تو حلق کا مجسٹریٹ بن کر اپنی دیہانتیت کو چھپا لیتا مگر وہ ایک غریب دیوانہ کا بیٹا ہے جس کی پرورش اور تربیت لاکھ پور کے ضلع میں جانگھی بوجھوں کے درمیان ہوئی۔ اس لئے اب چاہے وہ بوئیرسٹی کا چانسٹری کیوں نہ بن جائے اور پورٹ و اسوسائٹ کے آداب ہی کیوں نہ اپنائے لیکن عقل میں وہ تو بس پرائیویٹ رک کر ہاتھوں ہی سے کھائے گئے گا چھری کاٹنے سے نہیں کیونکہ وہ ٹھوسٹی ہوئی بناؤ کا مذاق اڑانے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ خود اس کا شکار ہونے کے لئے نہیں۔

لیکن کمپور کا خیال ہے کہ وہ اپنی کئی مایوس نہیں ہے۔ اس جہنم میں اسے فطرت کی طرف سے جتنی بھی چیزیں دی گئی ہیں وہ بیت نہیں کی گئیں۔ ردا گئے جہنم میں مل جائیں گی۔ لگے جہنم میں بھی وہ عیب تو اس سے لگے ہی ملیں گی۔ انسان کو ابھی چوراسی لاکھ مربع جہنم مینا ہے اس لئے جلتے ہوئے جھڑکی کوئی ضرورت نہیں ہے چوراسی لاکھ جہنم کا آئینہ بہت مسرت انگیز ہے۔ یہ وہ ایک سنجیدہ قہقہہ لگا کر کہتا ہے: ”یہ آئیڈیا سینے میں امید کی مشعلیں بنا دیتا ہے۔ چنانچہ میں آئے والے کسی دوسری جہنم میں ہر ایک سے انتقام لوں گا۔ راجندر سنگھ بیدی سے کرشن چندر سے، فکر تو نسوئی سے ملو ملو۔“

کیا کمپور یہ بات کہہ کر چوراسی لاکھ جہنم کے آئیڈیا پر طعنے کر رہا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کمپور کی کسی بات کا کیا اعتبار ہے کیونکہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہے کہ وہ ساٹھویں سال میں داخل ہو چکا ہے جس میں سے عمر کا بیشتر قسمتی حصہ اس کے خیال میں نہیں بڑے پار حصہ (نصف) چلا گیا ہے۔ یعنی ایک پورا جہنم

نباہ و برباد ہو گیا ہے اور اب جبکہ دم واپس بھر رانا ہے، القاب چاہے وہ انڈیا کا پریزیڈنٹ کیوں نہ بن جائے اس سے کیا فرق پڑے گا۔ خوشی اور امنگ کے وہ لمحے تو ہاتھوں سے نکل ہی گئے۔ جبکہ وہ ایک دور افتادہ گاؤں میں سوکے ٹکڑوں پر بیٹا رہا۔ تعلیم کے زہریلے گھونٹ نیتا رہا۔ یہاں تک کہ اٹھویں سال ہی میں ماں کی ماتا سے بھی محروم ہو گیا۔ اس نے اب چاہتے پورا تجارت اس کی ماما بن جائے وہ اس سے محبت کی کونسی ہر کھینچ سکے گا۔

اس نے آنے والے جنم پر بھروسہ رکھو اور قہقہے اڑاتے چلے جاؤ۔

کہیں کہیں یوں لگتا ہے جب طغیانی نگر کپور پڑا رہا اور جیسا انسان ہے کیونکہ وہ دنیا کی بڑی سڑکوں طافندہ کو ایک ہی فقرہ میں چٹکیوں سے اڑا دیتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں اس کی جذباتی دلچسپی گرا اس کے جیسا ہے پر شہر ہونے لگتا ہے، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کس کالج میں اسے پرنسپل بننے کا یقین چانس مل رہا تھا، کپور کی اپنی یہ خواہش تھی کہ انہی ۴ سیر فیئر کی کرتے بیت گئی۔ اب اسے پرنسپل مزدور بن جانا چاہیے۔ کوالی فیکشن، تجربہ اور سفاقت سبھی کچھ مکمل تھا۔ اسے انٹرویو کے لئے بنایا گیا اور اس پر سوالات کئے گئے۔

”کنیز جناب! کیا آپ پورٹس میں دلچسپی رکھتے ہیں؟“

”جی نہیں!“

”کیا کالج میں کلچرل کنکشن کروا سکتے ہیں؟“

”جی نہیں!“

”کیا آپ کالج کی از سیر نو تنظیم میں حصہ لیں گے؟“

”جی نہیں!“

اور پھر کپور نے مجھے بتایا کہ وہ یہ سن کر بے حد مسرور ہوا کہ انٹرویو بورڈ کے نائب نا اہل سمجھتا ہے اور اسے پرنسپل بننے کا چانس نہیں دیا جائے گا۔ اس نے جان بوجھ کر سبھی

جواب دہن میں ہی دئے تاکہ اسے ایک ذمہ دار پورے حق سے قرار دینے کا باعث حاصل ہو سکے۔

یہی حالت اس کی گھریلو زندگی میں ہے۔ وہ گھر سے جو گناہاں مانتا ہے۔ حلالانہ سات بچے ایک بیوی اور ایک باپ اسے معاشی طور پر اپنے شکلفے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس کا یہ فارمولہ ہے کہ دین تک آدمی جیتا ہے۔ اسے گھر میں دن اور رات بھر میں زیادہ سے زیادہ ایک آدمی گھنٹہ ہی رہنا چاہئے اور باقی وقت گھر سے باہر گزرنا چاہئے۔ چنانچہ اگر اس کا بچہ بیمار ہے تو وہ اسے اس ڈور سے ڈاکٹر کے ہاں نہیں لے جائے گا کہ کہیں ڈاکٹر یہ نہ کہہ دے کہ بچے کا بچنا محال دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اس مفروضہ خوف سے فرار جانے کے لئے بیوی سے کہہ دیتا ہے کہ تم خود جا کر اسے دکھا آؤ۔ وہ یہ جانتا ہے کہ بیوی سودا سلع خریدنے کے لئے بازار جائے گی تو ڈیوڈ سے دام دے آئے گی لیکن وہ اس نقصان یا کوسہنسی کوئی برداشت کر لے گا۔ وہ تو یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ اس کی پینٹ کا کپڑا خریدنے کے لئے آٹھ سال بچے شہجو کو بھیج دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ کتنا فرق پڑے گا؟ یہی پانچ دس بارہ روپے؟ مگر فرار تو ایک بیش قیمت چیز ہے، پانچ دس بارہ روپے سے ہزار گنا زیادہ قیمتی۔ !!

اور اس فراریت کے حق میں اس لمحے پاس بڑی بڑی دلچسپ دلیلیں بھی ہیں مثلاً وہ کہتا ہے کہ دنیا کی یہ ساری جدوجہد سائنس کے لئے ہے۔ آسائش اور فراریت کی سرحدیں بالکل قریب قریب ہیں۔ تم کام کس لئے کرتے ہو؟ اس لئے کہ کام کرنے کے بعد کام سے فرار حاصل کر کے کچھ تک پر چلے جاؤ۔ تم کام کے زیادہ بوجھ کو مشینوں پر کیوں ڈالنا چاہتے ہو؟ تاکہ تم کام سے فرار حاصل کر سکو۔ اور پھر وہ نہایت غور سے گردن اٹھا رہتا ہے اور کسی حد تک جھکے ہوئے بے جا کارہجے میں کہتا ہے۔ سویت روس

میں جس نر کام کے چہ گھٹنے مقرر کئے گئے ہیں آخر کیوں ہو گیا اس لئے نہیں کہ باقی اعضاء و
گھٹنے انسان فرار کی لذت سے شاموس کے گویا وہاں اٹھارہ گھٹنے نر کے اور چھ گھٹنے کام
کے ہوتے ہیں۔

اس کا حلقہ احباب بہت مختصر ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اس نے کوئی ایسا
دوست نہیں بنایا جس پر وہ حجب جان سے ہٹ جائے تو زیادہ مناسب رہے گا۔ یوں کہنے
کو تو اس کے سینکڑوں دوست ہیں مگر میرا خیال ہے کہ کپور نے کسی کو اپنا دل نہیں دیا۔
اگرچہ اس میں کپور کی بد مزاجی کو دخل نہیں ہے کیونکہ شریچڈی یہ ہے کہ اس کے پاس
دل کی مقدار ہی بے حد کم ہے۔ وہ کسی کے لئے بھی بے محابا نہیں ٹرپ سکتا۔ نہ اس
کی یاد میں نارے گن سکتا ہے نہ آہیں بھر سکتا ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ وہ جذبات
سے بالکل گور ہے، بلکہ جھکڑا صرف مقدار کا ہے۔ وہ اگر کسی کو اپنی محبت سونپتا
ہے تو دل سے نہیں بلکہ دماغ سے۔ اس کا دماغ ہی محبت کا فیصلہ کرتا ہے۔ اگر
کوئی امر و نہایت سے عاری ہے تو چاہے وہ یوسف ثانی ہی کیوں نہ ہو کپور اسے منہ
نہیں لگا کے گا۔ وہ کہتا ہے کہ مرد کو نہ میں اور عورت کو حیثیت نا چاہئے۔ عورت کے حسن
کا فیصلہ بھی وہ دل سے نہیں دماغ سے کرتا ہے۔ علم حایات کے فیتے سے ہی وہ
حسین تازک کو مانتا ہے۔ پورا الزا کو نہ ہے نصیب ورنہ کڈم!

ہاں اس کے ایسے احباب کی تعداد بے شمار ہے جو کپور کو اپنا دوست سمجھتے ہیں
مگر کپور انہیں بنانا نہ چاہتا ہے۔ کیونکہ اگر کپور کسی کو نہ بنا کے تو اس کی زندگی اجیرن ہو جائے
ایک مرتبہ اس نے ایک نہایت بد صورت شاعر کو اپنا دوست بنایا۔ یہ شاعر اسے
لاہور کے کافی دوس میں ملا۔ وہ اسے اپنے نہایت ہی گھٹیا شعر شاعر محفل سے اپنا
نداق اڑا رہا تھا کپور نے اس کے اشعار کی تعریف و تحدیدت شروع کر دی اور
نہایت سنجیدہ لہجے میں اہل محفل کے سامنے اشعار کی خوبیوں کو اجاگر کرنے لگا۔ بد صورت

شاعر کمپور پر مڑ ہو گیا۔ دوست کا ہاتھ آگے بڑھایا جسے کمپور نے بڑے خلوص قلب کے ساتھ
 تمام لیا۔ یہاں تک کہ سبھی سمجھنے لگے کہ کمپور اور بد صورت شاعر میں گارٹھی جین رہی ہے۔
 ایک بار وہی شاعر اسے مال روڈ پر مل گیا، علیک سلیک ہوئی، شاعر نے جذبات
 محبت سے چہرہ چوم کر کہا: "کمپور صاحب! مجھے کوئی خدمت جائیے، میں آپ کے
 کسی ریکی کام آتا چاہتا ہوں۔"

کمپور نے کہا: "رہنے دیجئے۔ دوستی میں بے شکافی ہی اچھی رہتی ہے۔"

شاعر نے کہا: "آپ میرے مخلصانہ جذبات کو ٹھکرا رہے ہیں۔"

کمپور بول: "تو پھر آپ میرا صرف ایک جھوٹا سا کام کرو دیجئے۔"

شاعر بولا: "فرمائیے۔"

کمپور نے ہنایت سادگی سے کہا: "آپ ذرا انکلیٹ فرما کر چند منٹ کے لئے میرے

غریب خانے پر نشر لکھنے چلیے۔"

شاعر نے کہا: "کونسا کام ہے؟"

کمپور نے کہا کچھ بھی نہیں، میں صرف آپ کو اپنی بیوی سے ملاؤں گا۔ اور پھر اسے
 بتاؤں گا کہ دیکھو تم مجھ پر خراغ اٹا کر مہنتی مہم لاکھ بنائیں مجھے جسے میں زیادہ بد صورت لڑکی مانتا ہوں۔

تو کیا وہ؟ اس باتے رہنے میں صرف طنز کرتا ہے اور ابدی لذت اخذ کر کے

رہ جاتا ہے؟ کیا وہ اس کردار۔۔۔ یا اس کیفیت کے ساتھ سمہد روی رکھتا ہے

جب پردہ اپنے طنز کا فشر چلاتا ہے؟ نہیں! کمپور یہ بات نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے اگر

میں طنز کرتے وقت سمہد روی کے جذبہ کی لپیٹ میں آ جاؤں تو میرا وار خطا جائے گا

اور اگر خطا نہیں جائے گا تو پچیس پچاس سا وعظ ہو کر رہ جائے گا۔ میں واعظ نہیں ہوں

بلکہ طنز نگار ہوں۔

چنانچہ اسی بنا پر وہ کمیوں کو بنا آ رہا ہے۔ جو لوگ اس کے طنز کا نشانہ بنتے

ہیں ان کی تین قسمیں بن جاتی ہیں۔ ایک وہ جو شکار نہیں شکار رہتے ہیں اور آخری دم تک اسی سادگی کے ساتھ شکار بنے رہتے ہیں، ایک وہ جو اس کے طنز کے راز کو پہچانتے ہیں اور حمل کر کے ابھرتے ہیں اور اس کے گھنٹیا قسم کے انتقام لینے پر تیل جاتے ہیں اور ایک وہ جو چوڑے سہکرا سے خوب سہلانے لگتے ہیں تو شربتِ لذت سے مسکرا دیتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے تبسم آمیز آنسو بہہ نکلتے ہیں اور طنز کے اثر کی یہی معراج ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ جب وہ پھلنگام کی سیاحت پر جاری تھا تو راستے میں اسے ایک بہت بڑے پنجابی زمیندار کے ساتھ سفر کرنے کا موقع مل گیا جسے اپنے بھتیجے اور بھاری گلے پر سر لیے اور اسیلے ہوئے کالقیں تھا۔ چنانچہ اسی مشفقہ خیرِ یقین کی بنا پر کہہ پڑے اسے بتایا کہ کیا آپ نے کشمیر میں اطمین ہوئی چائے کے تالاب بھی ملاحظہ فرمائے ہیں۔ تو زمیندار نے حیرت کے ساتھ وہ تالاب دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ کہہ رہا اس کیفیت کو اتنی سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھانا کہ بالآخر اس زمیندار کو پھلنگام کے قریب گندھک کے ایک پہاڑی چشمے پہنچے گیا اور اس میں سے چائے کا ایک کپ بھر کر اسے پلا بار جس پر زمیندار نے صرف اتنا کہا کہ یہ چائے کچھ تمکین زیادہ ہے۔ کہہ دئے کہا کشمیری لوگ تمکین چائے ہی پسند کرتے ہیں کیونکہ یہاں کھانڈ کی پیداوار بے حد مشکل ہے۔

اسے اپنے دلچسپ جسم کا مشہور احساس رہتا ہے اور اس بنا پر وہ کسی عورت کی زلفتِ عشق میں گرفتار نہیں ہوتا چاہتا۔ بلکہ کُل محلہ سے گزرتے ہوئے ایک ٹیک اور شریف بچھڑے کی طرح نکل جاتا ہے۔ وزن کرنے والی مشین سے یوں خوراک کھاتا ہے جیسے شیطان لاحول سے۔ نہانے سے ہیبت ڈرتا ہے۔ کیونکہ نہانے میں کپڑے اُڑنا پڑتے ہیں اور جسم کا پتلا پن صاف چھل کھلنے لگتا ہے۔ سفر کرنے سے بھی گھبراتا ہے۔ کیونکہ سفر کے دوران میں دھکے لگتے ہیں ٹکٹ لینے کے لئے، گاڑی میں بیٹھ جانا، کچھ لے کر اسٹیشن پر اترنے پر چڑھنے کے لئے، سامان اٹھانے

اور پڑھانے کے لئے۔ اور اس سادہ عمل میں اس کے ساتھ قانون کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ سفر کو مضر سمجھتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک انگریز خاتون نے اس کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے کہا۔ ”کیور صاحب!“

“YOU ARE AS THIN AS A NEEDLE”

یعنی آپ تو سرنی کی طرح تپلے ہیں۔ ”کیور نے بے ساختگی سے اس چوٹ کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”مگر آپ ذرا بغاوت سے کام لے رہی ہیں۔ چند ایک سریاں تجھے مرنی لیں ہوتی ہیں۔“

جسمانی کمزوری کے اس احساس نے اس میں مقابلہ کرنے کی سپرٹ کم کر دی جائے۔ ایک مرتبہ ایک پبلشر نے اس کی کتاب شائع کر دی۔ اور جب ”کیور“ نے اس سے رائلٹی مانگی تو پبلشر نے اسے سربازار جسمانی مقابلے کے لئے ملکارا جمیڈ پر کپور لے بھیجے۔ کھٹ مسکراہٹ کے ساتھ کہا میں تو آپ سے مذاق کر رہا تھا اور میں وہ کتاب پبلشر کو مفت دے دی۔ اسی طرح ایک مرتبہ لاہور کے ایک سیاسی وکیل اور ادبی مجاہد نے اس کے ایک طنزیہ مضمون لکھنے پر ڈوکل کے لئے بیکار تو کپور لے معافی مانگی لی۔ اس کا مقرر ہے کہ لڑائی صرف عقلمندوں سے کرتی چاہئے۔ مودکوں سے لڑائی کرنے میں ہڈیاں ٹوٹ جاتے کا احتمال ہے جو ایک نہایت احمقانہ عمل ہے۔ چنانچہ عقل مندوں کے ساتھ لڑائی کرنے میں اسے بے حد لطافت آتا ہے ایک مرتبہ محفل میں ہوئی ”تم تو ایک انشکوپر سیل قسم کے حضرت تشریف لائے جو کپور سے بے حد تالاں تھے۔ چنانچہ انہوں نے باتوں باتوں میں اپنی ذہانت کا ستھیا نکال کر کہہ رہا تھا ”خیر وہ آزمانی شروع کر دی۔ کپور نے کہا: ”صاحب میں تو آپ کو بہت تشریف آدمی سمجھتا تھا۔“ ان صاحب نے فوراً چوٹ کی اور کہا: ”کپور صاحب! میں بھی آپ کو تشریف آدمی سمجھتا تھا۔“ اس پر کپور بھڑک اٹھا اور بولا: ”صاف کہجئے آپ ٹھیک کہتے تھے، غلطی مجھ سے ہوئی۔“

کتبِ لال کبوتر صرف طنز نگاہی ہے۔ بلکہ اس میں سنجیدگی اور متانت کے جواشم بھی کافی مقدار میں ہیں۔ روزِ زندگی اور سماج کے ہر مسئلہ پر اپنی ایک — رائے رکھتا ہے۔ مثلاً خدا کے متعلق اس کا خیال ہے کہ اس کے وجود کو تسلیم کر لیتا جاوے کیونکہ دنیا میں بیک وقت اتنی خوبصورتی اور اتنی بدصورتی پیدا کرنا کسی بہت بڑے اعلیٰ اور برتر درجہ کا کام ہے۔ مگر وہ کسی مذہب کو نہیں ماننا۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ کسی بھی مذہب میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں کہی گئی ہے جسے ذہین آدمی پہلے سے زمانہ تباہ و برباد نہ ہو۔ لیکن — وہ اپنا تک رومانٹک سا مڑ بنا کر کہتا ہے۔ مذہب میں جہاں جہاں بھی غلطی کے عناصر پائے جاتے ہیں وہ اسے بے حد پسند نہ آتے ہیں۔ گیتا کے اشوک اور خزان کے آئینہ پروردہ محبوب ائمہ ہے۔

وہ اردو زبان کو ایک اہامی زبان سمجھتا ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ دنیا کی ہر اہامی زبان کے خزانہ و صورتِ ترین اور تاثر انگیز پہلو اردو زبان میں موجود ہیں۔ اس زبان کو مارنے کی کوشش بالکل ایسے ہی ہے۔ جیسے کوئی چھینٹیز خاں کسی بہت بڑے علمی کتب خانے کو بھلا دے۔ اور اس جگہ پر ایک فوجی خیمہ کھڑا کر دے: کیا اردو زبان صرف دہلی اور لکھنؤ کی زبان ہے یا میں نے اس سے ایک بار پوچھا تو اس نے بھڑک کر جواب دیا لکھنؤ میں — لکھنؤ میں تو اردو زبان بے حد غلط بولی جاتی ہے انھیں تو ابھی اتنا بھی شعور نہیں کہ بیل نڈ کر ہے یا موٹ۔

جب اس کے احباب اسے بتاتے ہیں کہ تم ادبی اعتبار سے شیخ سن سے مٹا بہت رکھتے ہو تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سوتا۔ لیکن جب اسے یہ خیال آتا ہے کہ شیخ سن نپ دن سے مرا تھا تو وہ گھبرا جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ شیخ سن بالکل نہیں بنے گا۔

حالانکہ ایک ماہر پامٹ نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ خداداد موت ہا خستہ کی خرابی کے باعث ہوئی۔

پیاز کے چھلکے

مگر خط اس کو لکھوائے کوئی تو ہم سے بکھوائے
ہوئی صبح اور دھڑک کر کان پر گھر سے قلم نکلے

بچے کتنے ہونے چاہئیں؟

کچھ عقل مند لوگ کہہ رہے ہیں کہ کرنسی کا پیسلا ڈیڑھ روپہا ہے مگر میرا خیال ہے بچوں کا پیسلا ڈیڑھ روپہا ہے۔ یا شاید یوں ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی دیکھتا دیکھتی بڑھ رہے ہیں یا بچے اور کرنسی دونوں ایک دوسرے کو نچا دکھانے کے لئے بڑھ رہے ہیں، مثلاً اگر گورنمنٹ اپنی شکال میں سے ایک نوٹ چھاپ کر بھیجتی ہے اور والدین ایک بچہ مارکیٹ میں اوسال کر دیتے ہیں مگر گورنمنٹ کو اس بات پر شہرہ نقد کڑا ہے کہ بچہ سالہ لکھا اے گا کہاں سے؟ چنانچہ وہ غصے میں آکر ایک نوٹ اور چھاپ دیتی ہے۔ جب یہ دوسرا نوٹ چھپنے کی خبر پہنچتی ہے تو ایک اور بچہ جیبا تک کر جاتا ہے۔ "آدب عرض ہے۔"

اوریوں کرنسی اور بچوں میں ایک ریس مباری ہے۔ اس ریس سے گھبرا کر گورنمنٹ جو اپنے آپ کو عقل مند بھی کہتی ہے، چلا کر کہتی ہے، فیملی پلاننگ کرو! فیملی پلاننگ کر دیا۔ چنانچہ والدین کہیں جو اپنے آپ

کہ نہیں بلکہ گورنمنٹ کو ہی عقل مند سمجھتے ہیں۔ سوچنے لگتے ہیں کہ بچوں کے جان کر کے
 ہی پیدا کرتا جائے۔ درنہ سماج داد پیدا نہیں ہوگا، بچے ہی پیدا ہو کر رہیں گے۔
 مگر میرا خیال ہے کہ جو لوگ کم بچے پیدا کرنے کے نعرے دگاتے ہیں۔ وہ
 بڑے لکھے یا ہل ہیں۔ کیونکہ بچے پیدا کرنے کا تعلق سماج داد سے نہیں ہے۔ صرف
 سماج سے ہے۔ مثلاً کم سے کم بچے کا مطلب یہ ہے کہ صرف ایک بچہ پیدا کیا جائے
 کیونکہ ایک بچے سے کم بچے پیدا کرنا ممکن نہیں۔ لیکن اگر وہ ایک بچہ والا لائق
 نہ ہو، تو آپ کیا کریں گے۔ کیونکہ تاریخ کہتی ہے کہ ہر گھر میں ایک نہ ایک بچہ ضرور
 نالائق نکلتا ہے۔

اس لئے اگر بچہ ہی ایک ہو تو نالائق ہونے کی ذمہ داری بھی اسے ہی اٹھانا
 پڑے گی۔ لہذا ایک نالائق بچے کے مقابلے پر ایک لائق بچہ پیدا کرنا ضروری ہو جاتا
 ہے تاکہ بڑا صاحب اپنے پڑوسی سے کہہ سکے: ”اجی رگھوناتھ جی! دفعہ کچھ میرا نصیب
 اچھا ہوتا کہ چھوٹا لڑکا عقل مند نکلا۔ درنہ بڑے سے تو گھر کی دنیا ہی ڈوبی رہتی۔
 یعنی اب کم سے کم بچوں کی تعداد دو بچے ہو گئی۔ جو گویا سماج کی بنیادی
 ضرورت ہے مگر یہ دونوں بچے لڑکے ہونے چاہئیں۔ کیونکہ اگر ان میں سے ایک
 لڑکا ہو۔ ہونا لائق ہو اور دوسری لڑکی ہو۔ جو بیاہی جائے تو آپ کے بچے کا باقی
 رہا۔ لہذا دو لڑکے ضرور ہونے چاہئیں۔ ایک نالائق دوسرا نالائق۔ اور دواکشی
 کے لئے تیسرا بچہ ایک ہیں ہونی چاہئے تاکہ بھیا کو راکھی پاندھ سکے۔ ہمتیا کی
 یاد میں گیت گاسکے۔ اور ہر گھوڑے کی شاپ، ہر موٹر کے ہارن اور ہر بائیکل
 کی گھنٹی سن کر سمجھے کہ میرا بھیا آ رہا ہے۔

ادریوں سماج کی ضرورت کے لئے نین بچوں کا کوٹا منظور کرنا ہی پڑے گا۔
 جب یہ نینوں بچے بڑے ہو جائیں گے۔ تو ظاہر ہے، کم بخت دماغ کی مار کھا کھا کر

سیرس بھی ہو جاتی تھے۔ اور والدین کو بردہ کرنے لگیں تھیں۔ اس سیرس میں منی کی تھیلی دفن کر ڈھانپنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ٹھنسی ٹھنسی سی سادہ اور معصوم، ترقی سی آواز گھر کے انگوٹھی میں گونجنی رہے۔۔۔ امدیوں بھی، جب والدین ادمیٹر عمر کو پہنچ جاتے ہیں۔ تو ایک ٹھنسی بچے کی مدح و تحسینوں غرض سنے کی تمنا ضرور کرتے ہیں۔ والدین جو زمانے کے تھیلے کھا کھا کر بلڈ پریشر کا عام شکار ہو جاتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ ایک ترقی آواز انھیں لوری دے کے سلا سکے۔ اور اگر اپنا بچہ نہیں ہو گا۔ تو پڑوسی کے ٹھنسی کو سینے سے لگا کے پھر سیں گے۔ مگر دوسروں کے بچے کا اعتبار ہے۔

”امی! تو قریب آ جائے۔ نہ آئے تو دور سے انگوٹھا دکھا دے۔ اور ادمی آواز میں کہے۔“

اس لئے پڑوسی کے بچے کی انسلٹ سے بچنے کے لئے چوتھا، اپنا، ٹھنسی بچہ بے حد ضروری ہے۔

میں جوں جوں زیادہ سوچتا ہوں بچے بھی زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر میں نے باقاعدہ حساب لگا کر سوچا ہے کہ آٹھ سے کم بچوں کے بغیر گزار نہیں ہو سکتا مثلاً فرض کیجئے کہ آپ کے آٹھ بچے ہوں۔ تو ان میں سے ایک لڑکا تو گھر سے ضرور بھاگ جائے گا۔ کیونکہ تیرہ اور پندرہ برس کی عمر کے درمیان ہر لڑکا گھر سے بھاگتا ہے۔ اس لئے ریزوٹاگ میں سے ایک بچہ الگ ضرور کر لینا چاہئے، تاکہ وہ بھاگ سکے۔ بھگڑے لڑکے پر پریشانی ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ سماج میں بڑا آدمی بننے کے لئے ہی بھاگتا ہے۔ صرف بھگڑے لڑکے ہی ہوتے ہیں۔ جو فلم کے ہیرو بن جاتے ہیں، میں نے اکثر بھگڑے لڑکوں کو شاعر، ایڈیٹر، فلاسفر بننے دیکھا ہے۔ حتیٰ کہ آج کل جو ہمارے نیشنل لیڈر ہیں وہ بھی گھر سے بھاگے ہوئے لڑکے ہیں۔ اور اگر لیڈر نہیں بنتے تو بڑے ہو کر

ڈاکو بن کر ابھرتے ہیں مگر ابھرتے ضرور نہیں۔

چنانچہ آٹھ میں سے ایک بچہ تو آپ کو ڈاکو اور لیڈر وغیرہ بننے کے لئے سلیجڈ کرتا پڑے گا۔ آٹھ میں سے ایک غار ج۔ باقی رہ گئے سات۔ ان میں سے لڑکیوں کو تو ایک دم نکال ہی دیجئے کیونکہ وہ پرایا دھن ہوئی ہیں۔ بیک آپ کا دھن دوسروں کا۔ وہ ضرور بیا ہی جائیں گی۔ لیکن یہاں ایک احتیاط ضرور کریجئے کہ وہ ساتوں کی ساتوں لڑکیاں نہ ہوں۔ ورنہ سارا دھن پرایا ہو جائے گا۔ اور بیک دیوالیہ ہو جائے گا۔ کم از کم دو زیادہ سے زیادہ تین لڑکیاں ہی ایسی ہوں جو دامادوں کے گلے میں مرہ دی جائیں۔ ورنہ میرے ایک دوست ہیں جن کی نو لڑکیاں ہیں۔ اور ان کا گھر بالکل گرنا سکول معلوم ہوتا ہے ایک دن میں نے ان سے کہا۔ ”جناب عالی! یہ سرکٹ کی ٹیم کی کپتانی کس لئے؟“

وہ ایک گزلبا سانس بھر کر بولے۔ ”بھائی! ایک بٹیا پیدا کرنے کی خواہش میں یہ ٹریفک چل پڑا ہے۔ اور اب نان شاپ رکنا ہی نہیں۔“

ہاں! زیادہ بچے پیدا کرنے کے حق میں یہ مضبوط دلیل ہے۔ کہ بٹیا ضرور پیدا کیا جائے۔ ورنہ لڑکیاں چاہے لاکھ پیدا رہوں مگر ہر لڑکی جھانسی کی رانی نہیں بن سکتی۔ ”اپ آپ لگائیے حساب۔ ایک لڑکا بھاگ گیا، تین لڑکیاں بیا ہی گئیں۔ باقی رہ گئے صرف چار لڑکے۔ ان میں سے ایک لڑکا اس حساب میں رکھے گا اسے پٹائی کی جاتی رہے۔ کیونکہ ہر گھر میں ایک بچہ ایسا ضرور ہونا چاہئے جس پر ماں باپ اور بھائی بہن اپنے ہاتھ سینک سکیں۔ اور گایاں وغیرہ دیگیں کیونکہ گایوں کا شر اگر پیدا نہ کیا جائے اور پٹائی نہ کی جاتی رہے۔ تو وہ گھربالکل ڈل گلتا ہے۔ سونا سونا سا۔ پٹائی اور گایوں سے گھر میں یوں لگتا ہے۔ جیسے یہاں

کافی ایکڑ مٹی ہو رہی ہے اور گھر آباد ہے۔

اور ان آکھڑوں میں سے ایک بچہ ایسا بھی ضرور ہونا چاہیے۔ جسے سارا گھر پیار کر سکے۔ کیونکہ ہر بچے کو پیار کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ صرف ایک بچہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ جو گھر کا چراغ کہلاتا ہے۔ اگر سبھی چراغ ہوں۔ تو دیوالی سی ضرور لگتی ہے۔ لیکن تیل کا خرچہ اتنا بڑھ جاتا ہے۔ کہ گھر دیوالی منانے مانتے دیوالیہ ہوجاتا ہے اس لئے گھر کی روشنی کے لئے صرف ایک ہی چراغ کافی ہوتا ہے۔ باقی بچے اگرچہ چراغ ہوتے ہیں۔ مگر صرف نام کے چراغ۔ کسی میں تیل نہیں ہوتا ہے تو کسی کی بتی خامب ہوتی ہے۔

میں اب گنتی ہو گئی تھی۔ باقی رہ گئے دو لوگ۔ جو مس لینش کے لئے ہونے چاہیں مثلاً کوئی ایجنسی آن پڑے۔ جیسے ویش کی رکشا کا مسئلہ کھڑا ہوجائے۔ تو اسے فوج میں بھرتی کے لئے بھیج دیا جائے۔ فوج کی بجائے اسے جیل میں بھی بھیجا جاسکتا ہے۔ پنجاب کے ایک شہر میں پانچ بمبائی ناحبائز مشراپ بیچنے کا دھندا کرتے تھے۔ اور ان میں سے ایک بمبائی باری باری جیل میں ہی رہتا تھا۔ تیرنٹی چھوٹ جانا تو منبر چار کو مستحکم سی پہننے کے لئے آگے کر دیا جاتا۔ اس طرح دھندا بھی جاری رہتا اور جیل بھی آباد رہتی۔

اور اگر لائق بٹیا کہیں شہر سے باہر نوکری کے لئے چلا جائے تو دوسرے بچے کو قیامت کی ٹیوٹی پڑے گا دی جائے۔ اور نسیرے کو پڑوسروں سے دانگا فساد کرنے اور لالچ چارچ وغیرہ کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ اور دنگے کے بعد اس سے گھر کے دوسرے کام کا ج کر دئے جائیں مثلاً بٹر بھپاؤ، حقیر لاک، دڈ کرشیو کا بیڈ خرید لاک۔ اور ملتے ہوئے راشن ڈپو داکے کو ملا دیں گے۔ بچے پر گالیاں وغیرہ بھی دے آئے۔

غرض جو آدمی مجھ ان آکھڑوں میں سے ایک بھی کم یا غیر ضروری ثابت کر کے دکھاؤ گا اس کا شاخنے کے لئے تار مریں۔

کاغذ کا لباس

یورپ سے ایک ”ہپی برانڈ“ قسم کی خبر آئی ہے۔ کہ وہاں کاغذ کے لباس تیار کرنے کا تجربہ کیا جا رہا ہے، ظاہر ہے۔ یہ یورپ کی ایک اور ترقی کا ثبوت ہے۔ ورنہ وجہ کوئی نہیں تھی۔ کہ جب افریقہ میں بھی انسان نے کپڑے کا لباس پہننا ہی نہیں سیکھا اور ”ٹیچرل“ بھی گڑھوم رہا ہے یورپ کاغذ کے لباس تک جا پہنچا ہے۔ ہم ہندوستانی چونکہ یورپ کی نقی کر کے اپنے باپ دادا کا حق سمجھتے ہیں اس لئے چند سال بعد یہ کاغذی لباس ہندوستان میں پہنچ جائے گا۔ اور ویسے یورپ اپنا ہر ایجاد دادا کو ایکپو رٹ کر دیتا ہے۔ مثلاً صاحب پیادر، کالی میم، نیچو کتا، لاک، اینڈرول، ہنا ہوپ جاسوسی ناول، بلیو فلیس اور اداس نیچو، نیچو اور پیس۔ اس لئے کاغذی لباس بھی جلد ہی ممبئی کی بندرگاہ پر اترے گا۔ اور کنارت پلیس کے تمام کاغذ مرچش اپنے بورڈ پر نیوا ریویل NEW ARRIVAL کے نام سے چاک کے ذریعہ کاغذی لباسوں کا فہرست لکھ دیں گے۔

(۱) - آرٹ سپر کی بیش مشرٹیں - جس پر ریٹا بیورنڈ کی سر زنگی تصویر بھی چھپی ہوئی ہے۔

(۲) نیوز پرنٹ بیش مشرٹیں ہندوستان کے صرف مغلس باشندوں کے لئے بسست اور ایک دن کی پائیدار

(۳) بشر پہرے کے دو ٹپے - کالج کی مکھن السج حسین لڑکیوں کے لئے - جو صرف ایک پھونک سے نچنگ کی طرح اڑ جائیں۔

(۴) پوش سپر کے کڑتے - سیاسی لیڈروں کے لئے - جن پر سیاسی حلیے کا اعلان بھی چھپا ہوا ہوگا

نوٹ: اپنے آرڈر فوراً ایک کرا دیں - ورنہ مال ختم ہو گیا۔ تو دوسرے جہاز کا امتحان کرنا پڑے گا۔ اور خطرہ ہے کہ اسرائیل اور مصر کی جنگ شروع ہو گئی۔ تو جہاز نہر سوئز میں ڈبو دیا جائے گا۔

اگر ہندوستان میں پہیوں کی طرح کاغذی لباس کا رواج بھی عام ہو گیا تو رڑی کی صنعت پر مڑا اور کاغذ کی صنعت پر اچھا اثر پڑے گا۔ یعنی رڑی اتنی سستی ہو جائے گی کہ امیر لوگ شرم کے مارے اس کا استعمال ہی ترک کر دیں گے۔ اور بہت سے کعدہ معنڈا رجو آج کل امیر زادوں کے فیشن کے بل بوتے پر چل رہے ہیں بند ہو جائیں گے۔ لیکن دوسری طرف کاغذ جو پہلے ہی مہنگا ہو چکا ہے، مزید اتنا مہنگا ہو جائے گا کہ بلیک کے پیسے سے بھی نہیں ملے گا۔ اور خطرہ ہے کہ بچوں کی سکول کی کاپیاں اور سکالچ دہسکی کے ریٹ ایک سطح پر آ جائیں گے کاغذ کے فضل استعمال پر سرکار کی فعلنول پابندیاں لگ جائیں گی۔ اور شاید یہ ایک سخت دردناک لمحہ ہو گا کہ سرکار اپنے اوپر پابندیاں لگا کے۔ اور یہ جو سماج داد کی پبلیٹی کے لئے آئے وہ خشک اور بوجھل رسالے

ہنگوٹ اور وٹا ویزات چھاپ چھاپ کر آدمی کے اہلکار لگائی رہتی ہے۔
 انہیں کلینا بند کر دے۔ اور جتنا سکھ کا سانس لے کہ سماج واد سے نپٹا چھوٹا
 البتہ آدمی کے سوداگر آہ و زاری کریں گے۔ کہ ہمارا کاروبار چھوٹ کر دیا گیا
 دوسرا اثر اخباروں پر پڑے گا۔ یعنی ان کے صفحات کم اور قیمت زیادہ
 ہو جائے گی۔ صبح آپ کو اخبار کا پرچہ ملے گا۔ جو صرف رومال سائز کے دو صفحوں
 پر مشتمل ہوگا۔ اور قیمت دو روپے ہوگی۔ امیر لوگ تو اسے پڑھ کر ہینکے رہیں گے
 مگر غریب لوگ جب اسے پڑھ چکیں گے۔ تو بطور رومال جیب میں ڈال لیں
 گے۔ اور بوقت ضرورت نکال کر پسینہ پونچھ لیا کریں گے۔ اور جو غریب پائالہ
 پلائوں کے قائل ہوں گے۔ وہ پندرہ دنوں کے اخبار سمجھ کر کے درزی کے
 حوالے کر دیں گے۔ کہ ان سے ایک پاجامہ بنا دو۔ اور اگر کچھ کتڑیں بچا سکے
 تو ان سے ننھے کا "انڈروئیر" بھی سی دینا۔

ابھی کا غذی لباس نیو فیکر ز نے یہ نہیں بتایا۔ کہ کاغذ کا لباس کتنی دیر
 چلے گا غلطاً صبح آپ نے کاغذ کی ایک پتلون پر سی کرائی۔ پہن کر باہر نکلے تو بارش
 میں ہینک گئی۔ اور کاغذ گلی کر دی گئی۔ دھجی ہو گیا۔ لہذا ضروری ہے۔ کہ کاغذی
 پتلون پہننے کے بعد کار میں ہی باہر نکلا جائے۔ لہذا کاغذ اور کار ملازم ملزوم
 ہو جائیں گے اور بے کار لوگ آدھ آٹ پکڑ رہو جائیں گے۔

مگر ایک بات ظاہر ہے کہ کاغذی لباس بے حد سستا تیار ہو جائے گا۔
 موجودہ سٹینڈرڈ کے مطابق قمیص پتلون پر دوڑھائی روپے کا کاغذ لگے گا۔ اسے
 دھونے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ اگر یا صابن کی بھی بچت ہو جائے گی۔ ایک
 کھانا پیتا شخص ہر روز نیا لباس پہن سکتا ہے۔ غریب آدمی صفحے میں ایک بار
 اور درمیانہ کلاس والے صفحے میں دو بار۔ لیکن اگر باپ صاحب بس پر چڑھنے کے لئے

دھکم پیل کا نشانہ بن گیا۔ تو قمیص اور چٹوڑی دونوں پھٹ جائیں گی صرف بقیان پہن کر ہی گھر جائے گا۔ اور انڈرووڈ لیکن کاغذ کی بھی کمی اقسام ہوتی ہیں بالکل ایسے جیسے انسانوں کی کمی اقسام ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی سمگلر ہیں۔ کسی بایک مار کیٹے، کئی سرکاری سٹیج کی کرپٹ افسر اور کئی غنڈے۔ اس لئے ہر قسم کا انسان اپنی ہی قسم کا کاغذی لباس پہنا کرے گا۔ اہل زر لوگ آرٹ پیپر کے سوٹ تیار کروائیں گے۔ سفید پوش شرقاً و اوسٹ پرٹ کاغذ جس پر سنا میں چھپتی ہیں۔ اور قمیص پہنے ہوئے وہ انسان کی بجائے کتا ہیں معلوم ہونگے لکھنؤ کے بانیے جو ملل کا کرتا، موٹے کے بار اور کان میں پیڑی ٹاکائے نکلتے ہیں۔ وہ تنگ سا کاغذ استعمال کریں گے۔ لیٹر پیڈ کے کاغذ کے کوٹ صرف افسر لوگ پہنا کریں گے۔ تاکہ ذرا کلرکوں پر رعب پڑے۔ اور کلرک لوگ یا قراخیا کا کاغذ سے ہی قمیص جوائیں گے۔ اور یا اس کرانٹ پیپر سے جتنا سے سودا سلفت لائے وائے لغافے بنائے جاتے ہیں۔

البتہ وہ اپنی ٹکٹائی ابری پیپر کی خریدیں گے۔

اور فکر تو نسوی جو بیڑالین کا عاشق بنا پھرتا ہے اور جس کے نام بڑے اور درشن چھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ پوسٹر پیپر کا سہارا لے گا اور دور سے آتا ہوا یوں لگے گا۔ جیسے کس شریڈ لین کا پوسٹر چلا آ رہا ہو۔

ہاں انسانوں کی طرح کاغذی لباسوں کے بھی الگ الگ طبقے بن جائیں گے۔ دکاؤں ہر کپڑوں کے نقان کی بجائے کاغذ کے تہ کے مہوئے نقان رکھے نظر آئیں گے۔ ان کاغذی کپڑوں کے بھی مختلف نام ہوں گے۔ مثلاً بزاز آپ سے پوچھے گا

”جناب! آپ کو فے کاغذ کا ٹاکٹ سوٹ بنانا پسند کریں گے“

”اجی، جناب وہی جس پر فلمی میگزین چھپتے ہیں۔“

”فلمی میگزین تو ان پاپولر ہو گئے کہیں۔ ہر ہر کی چمک دمک زیادہ۔ اندر سے لکڑوں کوں آج کل تو ٹائٹل سوٹ کے لئے وہ کاغذ پسند کیا جا رہا ہے جس پر کیلنڈر چھاپے جاتے ہیں، ایک ٹائٹل سوٹ پندرہ دن چل جائے گا۔ گارنٹی ہے۔“

”چلو، وہی دے دو۔ کیا اس پر تے سال کا کیلنڈر چھپا ہوا ہے؟“

”ہاں!“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ کم از کم پندرہ دن تک تاریخیں دیکھنے کی آسانی ہو سکتی۔“

شادیوں کے سہرے

دو چار دن گزرے ، دہلی میں ہر طرف شادیوں کے منگامے تھے جسے دیکھو وہ شادی کر رہا تھا یا شادی کی دعوت پر جا رہا تھا۔ جس گلی سے گزرتے ہیں ریکارڈ زور شور سے بھینسا سناؤں دیتا ہے۔

اب ابھی جا کہ نیری راہ میں کھڑے ہیں ہم

یعنی مطلب یہ کہ لڑکی والے، لڑکے والوں کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہوتے کہ آئیے برسات کا ٹائم تو آٹھ بجے رکھا تھا مگر آپ آئے ہی نہیں — سوالو بچ رہے ہیں۔ کیا کارن ہے؟ ہم نے آپ کی سیول کے لئے پائسن ایلپ کی پانچ سو بوتلیں منگوا رکھی ہیں۔

ادھر لڑکے والوں کے ہاں بہ جراتی ریکارڈ بچ رہا ہوتا ہے سے

ایک ندی کے دو کنارے ملنے سے مجبور

یعنی مطلب یہ کہ وہ لڑکے والوں سے مخاطب ہو کر کہتے کہ ہم نے ایسے کیے

پہنچیں، شادیاں اتنی زیادہ ہیں کہ بہن برائی ہی نہیں ملے۔ دولہا کے لئے نفقہ سنگے
- مانگے یا ان سے گھوڑی مانگی گئی، لیکن وہ گھوڑی دوسرے دولہوں کو ہی "منزل
دہن" تک پہنچانے میں مصروف ہے، ابھی قاریز ہو کر ہی نہیں آئی، مگر گھبرائے
نہیں۔ پائن ایپل کی بوتلیں واپس نہ کیجئے، کیونکہ ہم کسی نہ کسی طرح برائی
اکٹھے کر کے لے ہی آئیں گے۔ ہر طرف آدمی دوڑا رکھے ہیں۔

برائیوں اور گھوڑیوں کی حوصلہ شکنی تھکتی تھی۔ تو یقین ہی۔
اگرچہ اس کے باوجود سارے بیاہ ہو گئے، لیکن ایک اور کرائس بے حد
گہرا تھا اور وہ تھا سہرائیس شاعروں کا کرائس۔ یوں تو دہلی میں کئی سی انیٹ
انٹا داس کے بچے سے ایک شاعر نکل آتا ہے جو اپنے ہاتھ میں چھپا ہوا سہرے
کا کاغذ لے بیٹھا رہتا ہے اور انیٹ اٹھاتے ہی آپ سے پوچھتا ہے۔

"ہاں جی فرمائیے! آپ کو کس کا سہرا لکھوانا ہے؟"

"برخدار طول عمر، عزیز پرودہ کمار کا؟"

"دہن کا نام لکھوائیے۔"

"عزیزہ پراسچول کمار کی۔"

"تو سنئے۔ عرض کیا ہے کہ سہرا"

چاند گ مالن لے گوندھا سہرہ پرودہ ہے

اور سہرے میں جو دھاگا ہے بڑا حسین ہے

ہے ادھر پراسچول خوش اور ادھر پراسچول

دونوں کی جڑی کہو اک ہند ہے اک چین ہے

اور پھر سہرے میں دولہا کے باپ، تایا، ناموں، ممانی، کھابو ج، اٹالہ، بڑا،

حتیٰ کہ دولہا کے پسندیدہ سائیکل ”ریجے“ کا نام بھی ”ڈولوا“ کر سہرا لکھوانے والا چلا جاتا ہے۔ اور شاعر پندرہ روپے اور شاعر ذرا ہلکا ہو تو دس روپے حبیب میں ڈال کر پھر اسی اینٹ کے نیچے بیٹھ جاتا ہے اور یہ سوچ کر بے حد خوش ہوتا ہے کہ سہرا لکھوانے والے کو مصرعوں کے وزن کی سمجھ بوجھ کم تھی، ورنہ بڑی مشکل پیش آتی: کیونکہ لفظ ”مہین“ بڑی ذلیل کنی حد تک بے وزن ہو گیا تھا۔ لیکن پردین کے ساتھ مہین کا ہی قافیہ چل سکتا تھا۔ کم تجنت دولہوں کے بھی آج کل عجیب وادھیات نام چل پڑے ہیں: ”پردین کمار“ — اب پردین کے یا وزن قافیہ کہاں سے تلاش کئے جائیں۔ ”مہین“ کا ایک قافیہ تھا۔ اگرچہ بے وزن تھا ”وہاگے“ کے ساتھ آنے سے بات میں بات پیدا ہو گئی، ورنہ ”نیں“ کا قافیہ بھی چل سکتا تھا، مثلاً یوں کہ

پراپھول ہے ڈمیو کا آٹا، پردین خالی مٹین ہے

انہی وزن میرے ایک دوست کے ناخلف بیٹے کی شادی محق دراصل میرا دوست اس کی شادی کروا کر اسے ناخلف بنانا چاہتا تھا، چنانچہ میرے دوست نے مجھ سے کہا ”یا فکر تو نہ کری! ایک سہرا بھی لکھوانا ہے — کوئی شاعر متاؤ۔“

میں نے کہا ”چلو، کہیں سے ڈھونڈتے ہیں، شاعروں کی کسی نہیں تھا ایک ڈھونڈو ہزار ملتے نہیں۔“

چنانچہ ہم شاعر ڈھونڈنے نکلے، ایک پرواڑی سے پرچھا، اس نے ”تبا کہ ایک شاعر صاحب گھونچہ“ دلو ہی ہر روز میری دکان پر بیٹھا کرتا ہے۔ ”تبا“ سے تم سے تم ہے، مگر صاحب ایسا گجب کا سہرا لکھنے کے چاند توڑانا ہے۔

”تو وہ کوئی روسی راکٹ ہو گا، شاعر نہیں ہو گا۔“ میں نے کہا

ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ سامنے سائیکل رکشا پر سے جناب گھونچو
بادلوں گزرے، پنواڑی نے آواز دی ”ارے گھونچو کے بچے! ادھر آؤ سارے!
یہ بابو صاحب سہرا لکھوانا چاہیں تم سے۔“

چنانچہ گھونچو نے دور ہی سے ہوا میں ہاتھ لہرایا اور بولے: ”میں فرصت
نہیں پنڈت جی! کتنے روپے والا سہرا لکھوانا چاہتے ہیں؟“
”پانچ روپے دیں گے“ میں نے نرخ کا اعلان کیا،

اول ہوں!۔۔ ابھی ابھی ساڑھے سات روپے کا ایک سہرا دے کر آ رہا
ہوں اور آٹھ روپے کا ایک اور سہرا دینے جا رہا ہوں۔“
”تو سارے سہارے پان سگریٹ کی دو حمار تو چکائے جا۔ اتنا کم از کم ہے۔“
پنواڑی نے موقع غنیمت سمجھا۔

”شادی ختم ہو رہی پنڈت جی تو پھر بات کریں گے تم سے۔ ٹانا!“

x x x
دو چار اور شاعروں کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر کسی نے کھل کر بات
نہ کی۔ ایک شاعر کی بیوی نے تو ہم پر حملہ بھی کر دینا چاہا اور گرج کر بولی۔ ”میں
نہیں جانتی کون فکر تو لسنوی شونوی ہے۔ پیسے دوا اور سہرا لکھوانا بیس روپے
سے کم نہیں لگیں گے ہم نے کوئی لنگر نہیں کھول رکھا۔“

اچانک خشک ہار کر مجھے خیال آیا کہ کسی چھاپہ خانہ میں چلا جائے۔ شاید
وہاں سے کسی، لنگر چلانے والے شاعر کا پنر چل جائے۔ پرسی میں پیچھے تو پرسی
کے میٹر نے کہا،

”لنگر صاحب! آپ بھی کتنے جاہل ہیں! (آہٹ) مجھے اس لفظ جاہل“ پر کہیں

غصہ نہیں آتا، جتنے سہرے چاہئیں ہم سے لیجئے۔ ہمارے پاس اس وقت کم از کم مختلف قسم کے ساڑھے چار سو سہرے موجود ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک انتخاب کر لیجئے۔“

چنانچہ میں نے ساڑھے چار سو سہروں کے ہجوم میں ڈبکی لگا دی اور ایک سہرا نکال لایا، جس پر لکھا تھا۔ ”ذرفٹکا دسھرا“
 بہت قریب شادی تھا سنا آبادی عزیزین بھوپت رائے ولد لالہ حکومت رائے ریٹائرڈ انجینئر آف تیلنگنگ۔“

اور نیچے شاعر کا نام لکھا تھا، پیش کردہ از طرف جناب بے ڈھب پانی پتوی، سہرے کا پہلا شعر تھا۔

واہ بھوپت رائے کی بھوکی پت بنا ہے آج سہرا

اور حکومت رائے کی پگڑی کر رہی ہے راج سہرا

میں نے کہا، ”مگر مینجر صاحب! ہمارے دولہا کا نام تو بھوپت رائے نہیں ہے بلکہ کل دنت سنگھ ہے۔ اس لئے یہ سہرا نہیں چل سکتا۔“

”واہ چل کیوں نہیں سکتا؟“ مینجر نے کہا، ”مصرعہ میں سے بھوپت رائے

کو نکال کر کلونت سنگھ رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً اب مصرعہ یوں بنے گا۔

واہ کلونت سنگھ کی کل کا دنت ہے یہ آج سہرا

میں مسکرا دیا اور بولا، ”بس دنت کی بجائے انت کر دیا جائے۔ مثلاً

یوں کہ۔۔۔

واہ کلونت سنگھ کی کل کا انت ہے یہ آج سہرا

”بالکل ٹھیک ہے۔“ مینجر نے کہا، ”یہی سہرا اس بار گئی آدمی لے گئے نہیں

ہر ایک نے بھوپت رائے کا نام بدل کر اپنے دولہا کا نام رکھ دیا۔ اور دیکھئے

جی، یہ شاعری بھی کیا کمال کی چیز ہوئی ہے کہ ایک مرتبہ کسی بیڈھتیب پانی پیتی رہی،
 نے یہ سہرا لکھ کر دیا تھا۔ اب ہر ایک دو لعل کے لئے فنٹ ہو رہا ہے۔ یہ ہے شاعری
 کا جادو!"

شاعری کے جادو سے متاخر ہو کر ہم نے سہرا چھپنے کا آرڈر دے دیا۔ اور
 یقیناً ماننے بڑا تئوں نے اس سہرے پر اتنی تالیاں بجائیں کہ جگر مراد آبادی
 کو بھی اتنی داکہاں مل ہوگی۔

سوری! میں نے آپ کو خواہ مخواہ ڈسٹرپ کیا۔ حالانکہ جی چاہتا تھا کہ سرور کا مکان مجھے ملے یا نہ ملے لیکن اس تنازعہ کو اسی طرح ڈسٹرپ کیے جانے لگا۔ لیکن وہ جلد ہی سے کوڑا بند کر کے چلی گئی۔ اور اپنے پیچھے اپنا دلکش آسٹنگ اور میری حسرتی جھوڑ لگئی۔

میں آگے بڑھ گیا۔ سسی بٹہ دو کی پوری قطار ملے کر ڈالی۔ پھر سسی بٹہ نیا، پھر سسی بٹہ چار۔ مگر خالص سسی کہیں ملا ہی نہیں۔ ایک دو آدمیوں سے پوچھا مگر کسی نے بتایا کہ سسی بلاک اس کالونی کے شروع ہوتے ہی گندے نالے کے پاس ہے کسی نے مشرمدہ کرتے ہوئے کہا سسی بلاک تو اس کالونی میں ہے ہی نہیں۔

ایک صاحب نے جو شاید ایک ریشا لٹڈ بولڈ تھا، اور سوائے فکام سیوا کے اسے اور کوئی کام نہیں رہا تھا، میرے کاندھے پر شفقت بھری چٹکی دیتے ہوئے بولا: آپ کو سسی کالونی میں یہ مکان ڈھونڈنے کے لئے نکالے ہیں؟

”سسی کالونی میں۔“

مگر یہ تو سسی کالونی ہے، اور سسی اور سسیا دو الگ الگ عورتوں کے نام تھے۔ ہاں یاد آیا، سسی کالونی میں واقعی ایک سسی بلاک موجود ہے، آپ وہاں جا کر معلوم کیجئے۔“

”سسی کالونی کہاں ہے؟“

”جہاں سسی کالونی ختم ہوتی ہے، سسیا کالونی شروع ہو جاتی ہے۔“

اور اب یہ صحت پر چھوڑ کر سسی کالونی کہاں ختم ہوتی چھوڑی بھی نہیں دیں اور سسی کالونی شروع ہوتی تو معلوم ہوا کہ یہ تو اس کا ایکسٹینشن ایریا ہے، پرانی سسی کالونی ان کھنڈروں کے پاس ہے جنہیں مغل بادشاہ اپنے زوال کی نشانی کے طور پر چھوڑ گئے تھے۔ یہ کیسے نہیں بھی بے حد توحید ثابت ہوا، اور آخر ہو سکندہ یا سکندہ، سسی

بلاک تلاش کر ہی لیا۔ اور حیب سی نمبر پانچ سو نینے والے مکان کا۔ پہنچا تو بلاک ختم ہو گیا۔ وہ سی بلاک کا آخری مکان تھا۔ اور مجھے مکان نمبر پانچ سو چار دینا ہے تھا۔ میں نے پھر ایک صاحب سے پوچھا۔ ”یہ مکان نمبر پانچ سو چار کہاں پر واقع ہو گا جناب!“

جناب نے اطلاع دی۔ اس سی بلاک کا یقیناً حصہ ڈی بلاک کے عقب میں بنا ہوا ہے۔ پانچ سو کے بعد کے نمبر وہاں سے شروع ہوتے ہیں۔ اور وہ یقیناً حصہ اصل سی بلاک سے تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔

مشاید ستاروں کی چال میرے ساتھ تھی۔ یا میں نے پچھلے جنیم میں کسی اندھے فقیر کو سڑک پار کرائی تھی۔ کہ میں واقعی مکان نمبر سی، پانچ سو چار کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مکان سے ایک محترم باہر نکلیں۔ رکائی بے وزن شعر معذوم دے رہی تھیں)۔ میں نے پوچھا۔ ”گر دور صاحب قشر لیت رکھتے ہیں؟“

”جی نہیں۔ وہ سی پانچ سو آٹھ والے گر دور صاحب کے ہمراہ تھے۔ تاکہ گئے ہیں۔ ان کا مالک مکان کے ساتھ سمیٹا ہوا تھا۔ اسے ذرا لچھائے گئے ہیں۔“

”مگر جی! مجھے انھوں نے ڈنر پر بلایا تھا۔“

”ہاں، ہاں، وہ سی پانچ سو دس والے سے کہہ تو رہے تھے کہ آج میرے گھر میں ایک بہت بڑا ادیب کھانے پر آ رہا ہے، اندر قشر لیت لائیے۔ میں نے کسی پانچ سو ایک والے کے بڑے کو مچھل لانے کے لئے بھیج دیا ہے، ان کی رالسی تھا۔ ڈنر تیار ہو جائے گا۔“

اور مجھے مچھل اور تھانے سے زیادہ اس بات میں دلچسپی ہوئے۔ لگوں۔ کہ ہم باور دہانے کے انسان اپنے نام سے نہیں پچھانے جاتے۔ بلکہ مکان کے نمبروں سے پہچانے جاتے بلکہ مکان کے نمبروں سے پچھانے جاتے ہیں۔ جیسے ہم انسان نہیں ہیں مکان

ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ سامنے گر دور صاحب کھڑے ہیں۔ بلکہ یہ کہ مکان نمبر سی پانچ سو چار والے کھڑے ہیں۔ انہیں مکان سی پانچ والے نے دھمکی دی ہے کہ اگر آپ نے سی چھ والے کے حق میں گواہی دی تو سی سات والا اپنے سی آٹھ والے بہنوئی کو لے کر سی دس والے کے پاس شکایت لے کر پہنچ جائے گا۔ اور سارے بلاک میں آپ کی تھری تھری ہو بسائے گی۔

اں۔ یہ ہم نئے زمانے میں سامنے لینے والے انسانوں کی پراہم ہے کہ آپ کسی ات ان کا نام لیں۔ تو آپ کے ذہن میں اس نام سے کوئی چہرہ نہیں ابھرتا لیکن مکان کا نمبر پکاریں۔ تو وہاں رہنے والے کی تصویر ابھرتی ہے۔ کہ اچھا وہ صاحب جن کی خاک کچڑا میں ہے۔ اور اگلا ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ اس کا سام گر دور ہے۔ مگر صرف گر دور کہنے سے خدوخال نہیں بنتے۔ کیونکہ مکان نمبر سی پانچ سو چار میں بھی گر دور رہتا ہے اور سی پانچ سو آٹھ میں بھی اور پندرہ میں بھی۔ اس لئے پندرہ نمبر مکان کا گر دور الگ ہو گا۔ یعنی وہ اپر ڈویژن تھریک ہو گا۔ مگر دس نمبر مکان والا گر دور نا جائز چرس کا دھند کرتا ہو گا۔

غرض سہارا اصلی کیرکڑ۔ کان کے نمبر کے ساتھ مخصوص ہے نام کے ساتھ نہیں۔ اور پھر شاید سوشلزم وغیرہ لانے کے لئے نئی کالونیوں کے سبب مکان ایک ہی ٹائپ کے بنائے گئے ہیں۔ کیونکہ مکان بناتے وقت اس پر اسے شعر کو مد نظر رکھا گیا کہ :-

من تو شدم تو من شدمی من تن شدم تو جاں شدمی

تا کس نگوئید بعد از من دیگرم تو دیگرمی

مجھے یاد ہے۔ ایک مرتبہ میرے ایک پڑوسی کے گھر ڈاکٹر ایک شیلی گرام وے گیا کہ آپ کے اہل انتقال فرما گئے ہیں۔ چنانچہ اس گھر میں روئے پٹینے کے بجائے ایک اور

ہیادی گئی اور ماتم پرسی کرنے والوں کا انتظار کیا جانے لگا۔ وہ گھنٹے تک دو تہڑ پیٹے جانے کے بعد ڈاکو لوٹ آیا۔ اور بولا۔ معاف کیجئے۔ وہ تار مکان نمبر بی تراسی کا تھا۔ مگر آپ کے مکان کا نمبر تو بی آکیا سی ہے۔ اور آپ کے نام کا تو ایک سنی آرڈر ہے۔ غلطی سے سنی آرڈر مکان نمبر بی تراسی کو دے آیا تھا۔ اوریوں انکیل کے آسنو سنی آرڈر کی مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئے۔ اور رونادھو تار مکان نمبر بی تراسی کی طرف منتقل ہو گیا۔

میں نے مشتعل ہو کر ڈاکو سے پوچھا۔ ایڈریٹ؟ یہ فاسٹ غلطی تم نے کیوں کی؟

وہ گڑگڑا کر بولا۔ اچی کیا کریں ان مکالوں کے ڈیڑھ اور رنگ۔ ایک جیسے لگتے ہیں ان کی الگ الگ۔ کوئی پہچان ہی نہیں ہے۔ سو اے نمبروں کے۔ اور نمبر کم بخت بہت بدھم پڑ گئے ہیں۔ صحیح پڑھے ہی نہیں جاتے۔ مرنے والے۔ کے گھر سنی آرڈر پہنچ جاتے ہیں اور سنی آرڈر والے کے گھر میں سیار پشرو دا ہو جاتا ہے۔

منی لبس

دہلی میں منی لبس چلتی ہیں تریوں گنا ہے منی سکریٹ پہنے فلم "بولی" کی
 ہیروئن چھوڑ کر جا رہی ہے اور تکمیل مشوق کی دعوت دیتے ہوئے کہہ رہی ہے۔
 "آؤ آؤ! تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں۔ نظام الدین، بھوگل، لاجپت سنگھ۔"
 اور حبیب آپ اپنی تمناؤں کی رال ٹپکاتے ہوئے، اس منی سکریٹ کا دامن
 پکڑتے ہیں اور لبس میں داخل ہو جاتے ہیں تو آپ کو لیں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ
 خود داخل نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ کسی نے آپ کو بالوں سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا
 ہے۔ آپ چلا آتے ہیں۔ "روکو لبس میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے باہر نکلنے دو۔"
 اور کندہ کڑ جواب دیتا۔ "اب مشکل ہے صاحب! سہاوی منی لبس میں
 جو ایک بار اندر آ گیا وہ زائد کار پانہ باہر کا۔ نکالنے پیسے کہاں جاتا ہے آپ کو؟"
 "جہنم میں"
 "تو ساتھ پیسے نکالے؟"

”مگر مجھے تو یہاں پاؤں نکالنے کے لئے ایک اپنج جگہ نہیں مل رہی — میں باہر نکلتا چاہتا ہوں۔“

”باہر جانے کی ٹکٹ بھی ساٹھ پیسے میں ملتی ہے۔ نکالنے ساٹھ پیسے؟ اور آپ ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں اور خاموش ہو جانے ہیں۔ ٹھنڈی سانس کر بھی نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ کیونکہ مٹی سکڑنے کے کئی شیدائیوں نے گیٹ کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ لہذا سانس شیدائیوں سے ٹکرا کر آپ کے پاس ہی لوٹ آتی ہے یا آپ کے قریب کھڑی سہاری کے کندھے پر جا بیٹھتی ہے۔ اور سہاری کہتی ہے۔“

”یہ کیا ہے؟“

”میرا ٹھنڈا سانس!“

”اے! میں سمجھا، کوئی ٹکٹ بھی ہے۔ دیکھیے، اپنی چیز اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھئے۔ دوسرے پر بوجھ مت ڈالئے۔ ورنہ میری ٹانگوں کا توازن بگڑ جائے گا دیکھتے نہیں، میں کتنی کوشش سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہوں۔“

”کند کڑ! کند کڑ صاحب جی۔ مجھے اس بلیک ہول سے باہر جانے دو!“

اور کند کڑ یعنی یو پی کی سپروٹن، منہ سے دل بجا کر گنگنائے گی۔ ہم تم، اک کمرے میں بند ہوں اور چانی کھو جانے۔“

اور آپ مایوس ہو کر اپنے گرد و پیش کلبا نرہ لیں گے۔ مٹی سکڑنے کے طول و عرض پر نگاہ دوڑائیں گے تو آپ کو ایک دم معلوم ہو گا کہ آپ کا ایک پاؤں تو اس بوٹ پر رکھ رہے ہیں جو آپ کا نہیں ہے۔ ٹھنڈی سی تشریح کے بعد آپ کو بتایا جاتا ہے کہ یہ بوٹ ایک عذیب والے بوڑھے کلبے، مگر اس بوڑھے بوٹ کے نیچے تین بوٹ اور ہیں جنہوں نے ایک دوسرے کے پاؤں کو اپنے لئے میسر نہیں بنالیا ہے۔ اور جو بوٹ سب سے نیچے ہے وہ ایک ڈیڑھ کونٹل وزن والی دیو سی جی کا

ہے اور حسرت سے کہہ رہا ہے ۔

دیکھو مجھے جو دیدہٴ عبرت نگاہ ہو

اور میرا دوسرا پاؤں کہاں ہے : آپ حیران ہو کر ارد گرد کھڑے لوگوں سے پوچھتے ہیں ۔

”جی ۔ وہ میری تپلون کے پانچپے کے ساتھ لٹک گیا ہے “ ایک مہربان انسان آپ کو تسلی دیتا ہے ۔

” مگر میری گٹھری پر کس کا پاؤں ہے ؟ میری گٹھری میں کیلے نہیں “ ایک ادبیز عمر دیہاتی نما شہری چلا اٹھتا ہے ۔

تپلون کے پانچپے والے کے پاؤں نے اپنے نیچے کیلوں کا گداز جسم محسوس کیا تو پہلے دو سیکنڈ کے لئے تو اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا لیکن پھر آنکھیں پھیر لیں بلکہ آنکھیں بند کر لیں اور جیسے یاد خدا میں مصروف ہو گیا ۔

اتنے میں بس کو ایک جھٹکا سا لگا تو آپ کا ہاتھ جو بس کے ڈنڈے کی بجائے ایک نوجوان کی بغل میں دبائے ہوئے اخبار کو پکڑ کر اپنا سہارا بنائے ہوئے تھا ایک دم اخبار سے الگ ہو گیا ۔ اور وہ فارغ البال ہاتھ نیا ہارڈ ہینڈلنے کے لئے جو ہوا میں ٹانگ ڈوئیاں مارنے لگا تو ایک محترمہ کی ساڑھی کے پلو کو پکڑ لیا ۔ جراس محترمہ کے خاوند نے پکڑ رکھا تھا ۔ چونکہ ایک ساڑھی پر وہ ہاتھ ایسے تھے جیسے ایک میان میں دو تلواریں سماسنے کی کوشش کر رہی ہوں ۔ اس لئے خاوند نے دانت پس کر کہا ۔

” آپ کو شرم نہیں آتی ! “

خاوند دانت پسنے کی بجائے دراصل آپ کے منہ پر طانچہ لگانا چاہتے تھے لیکن طانچہ والا ہاتھ منی بس کی حمایت کو سنبھالنے میں مصروف تھا ۔

اس لئے وہ ملحقہ طلبہ نچہ بننے کے اہل نہیں رہا تھا۔ احمد دہلانیچہ بن جاسا تو خاندان صاحب خود بھی قریب والی ایک اور کالجیٹ حسینہ پر جاگرتے اور صحبت الیہ پر گر جاتی۔ اور پھر کالجیٹ حسینہ کے پہلو میں اپنے آپ کو "ایڈجسٹ" کئے ہوئے اس کا ایک بوائے فرینڈ بھی کھڑا تھا جس کی بغل میں ایک ہاکی بھی تھی۔

آپ نے محترمہ کے خاندان سے کہا کہ آپ کا لہجہ بشریہ اور منظورانہ تھا، دیکھئے آپ کا یہ کتنا بجا ہے کہ مجھے شرم آئی جا ہے اور جو اب میرا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ مجھے شرم آرہی ہے۔ لیکن شرم ان منی بس والوں کو آئی جا ہے۔ جو ہمیں انسان نہیں بھڑ بھڑیاں سمجھتے ہیں۔"

اور آپ کو حالات کا شکار ہو کر واقعی شرم آگئی۔ جو کسی حد تک جانیوٹی تھی کیونکہ آپ نے سوچا کہ اگر یہ مجھ سے میری بہن یا بیوی یا بیٹی ہوتی اور اس کی ساڑھی کا پلو کسی یا گڑبے قسم کے حادثے کے باعث میں آجاتا تو اور آپ نے ہاتھ چھوڑ دیا جس سے توازن ٹھیک نہ لگا۔ آپ پیچھے ہٹ گئے۔ تاکہ اپنا ہاتھ منی بس کی بائیں دیوار سے ٹکا دیں۔ یہاں پہلے ہی کئی ہاتھ اپنی سلطنت قائم کئے ہوئے تھے۔ جو ابھی آپ پیچھے ہٹے تو ایک طفلانہ آواز آئی، "ڈیڈی! میری ٹوپی اس نیلے سوئیٹر والے نے نیچے گرا دی۔"

ڈیڈی ٹوپی اٹھانے کے لئے نیچے جھکا تو اس کا سر ایک اور سواری کی بغل میں جا گھسا بغل میں دو تین سر پہلے بھی گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے پروٹ ٹھٹکیا۔

"اے اے! کدھر گیا گا آتا ہے۔ یہ ہماری سرحد ہے۔ ہاتھ دیواروں سرحد۔"

اور پھر شے کی ٹوپی پر ایک نیم فوجی قسم کا زبردست بوٹ آپٹا۔ اور ٹوپی کو گھسیٹا ہوا آگٹیٹ تک لے گیا۔ کیونکہ ایک بس سٹاپ آگیا تھا اور کٹنگز کہہ رہا تھا چلو انکم ٹیکس دفتر یعنی ہیرو پیری کا دفتر۔ اور جیسے گھرے کی چابی مل گئی اور دروازہ

کھل گئی۔ ہندوہ میں سواریاں بیچنے اترنے کے لئے اور بیچ بچیں سواریاں اوپر چڑھنے کے لئے ایک دوسرے پر چاند ماری کر رہی تھیں، بلکہ کئی سواروں کو تو اس دھکا پھیل میں یہ بھی یاد تھیں رہا تھا کہ انہیں اترنا ہے یا چڑھنا ہے۔ اور اترنے اور چڑھنے والوں کے درمیان کندہ کر کا پی تھا۔ جو کہ جارہا تھا۔ "بغیر ٹکٹ کے جو اترے گا، اسے شگم بودہ محاث لے جاؤں گا۔ ہم بے ایمانی نہیں پاتے۔ چبے جاتے ہیں۔"

اور وہ ٹکٹیں کم کاٹ رہا تھا اور پیسے زیادہ لے رہا تھا۔ ایک سوار کو ٹرنک لے کر اتر رہی تھی دوسری سوار کا ٹرنک لے کر چڑھ رہی تھی۔ دونوں ٹرنک میرے آٹھ ساٹھ ہوئے تو دونوں ٹرنک آپس میں ٹکرائے۔ کندہ کر نے کیلئے کر ایک ٹرنک گرا دیا، ایک چڑھا دیا۔ اور پھر سٹیو دے دی۔ اور گانے لگا۔

"ہم تم اک کرے میں بند ہوں اور جانی کھو جائے۔"

اور دو منٹ بعد اچانک ٹرنک والی سواری چلائی۔ روکو روکو بس! میرا ٹرنک اس جگہ والے سے بدل گیا ہے جو بیچنے اتر گیا ہے۔